حسینؑ ابن علیؑ

سید افضل حیدر

حسینؑ ابن علیؑ

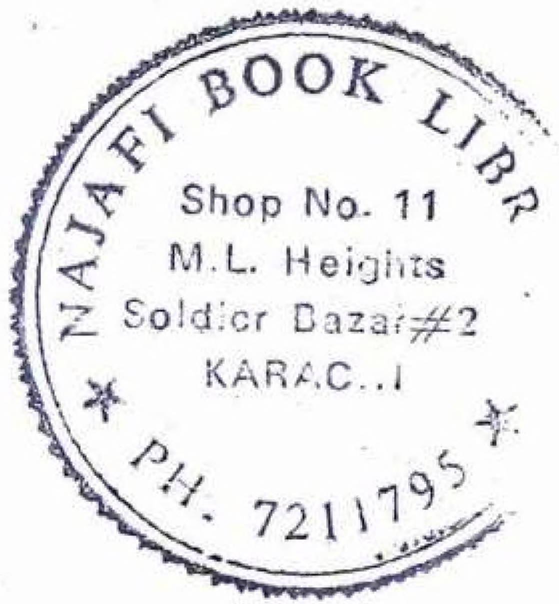
سیّد افضل حیدر

کلاسیک
42- دی مال، لاہور

بارِاوّل: اگست 2004ء

قیمت:-/300روپے

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک، چوک ریگل (مال) لاہور
فون: 7312977 فیکس: 7323963
ای میل: agha@classicpublishers.com
ویب سائٹ: www.classicpublishers.com
کمپیوٹر ورک: ذیشان حیدر
طابع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور



ترتیب

انتساب

رضیہ آپا کے نام

جنہوں نے برسوں کربلا کے واقعہ، اس کے محرکات و اسباب ونتائج پر غور وفکر کیا۔ ان کے اس جذبہ کے پیش نظر اپنی اس کتاب کو ان کے نام منسوب کرتا ہوں۔ پڑھنے والوں سے التماس ہے رضیہ بہن کے والدین امیر شاہ اور رحمت بی بی کی مغفرت کیلئے ایک بار ربّ غفور الرحیم کے حضور دُعا کر دیں۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔

کربلا کا سیدھا سادا مختصر نکتہ ہے یہ
کوئی غاصب مومنوں کا بن نہیں سکتا امام

(شورش کاشمیری)

تقدیم

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے بالخصوص اور دیگر مذاہب کے مشاہیر نے بالعموم امام حسینؑ کی ذات، تعلیمات اور قربانی کا بڑی محبت، عقیدت اور خلوص سے ذکر کیا ہے۔ امام کے ساتھ وابستہ ایام کو اس خطہ کے لوگوں نے مختلف انداز میں نہایت احترام سے منا کر اور عرصہ دراز سے جس انداز سے سالانہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سب کچھ امام حسینؑ کا منفرد اعزاز ہے۔ یہ اعزاز صرف اس لئے نہیں کہ آپ نبی آخر الزماںؐ کے نواسے یا جگر گوشہ علیؑ و بتولؑ ہیں بلکہ اس لئے کہ آپ نے دینِ حنیف کے انقلاب آفرین پیغام کی اپنے خون سے آبیاری کی، حقوق بشری کا علم بلند کیا اور جابر سلطان کے جری لشکر کے سامنے اس جرأت کے ساتھ کلمہ حق بلند کیا کہ کربلا انسانی روح کی جدوجہد کا ایک زندہ استعارہ بن گیا۔

امام حسینؑ کی زندگی ایک ایسا موضوع ہے جو صدیاں گزرنے کے باوجود پرانا ہوا نہ ہی اس کے بوسیدہ ہونے کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام کی تعلیمات کا تعلق زندگی سے ہے اور زندگی تمام تر رکاوٹوں کے باوجود جاری و ساری ہے لہٰذا جب تک دُنیا قائم ہے۔ امام حسینؑ کا ذکر جاری رہے گا۔ یہ ذکر اذکار امام بارگاہوں، مجالس، مساجد اور محافل تک محدود نہیں بلکہ یہ ذکر ہماری تہذیبی، سیاسی، تمدنی، معاشی، فکری اور ادبی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ ذکر محض ایک ذات کا ذکر نہیں۔ یہ تذکرہ انسان کے درد، اس کی محرومیوں اور اس کے استیصال کے خلاف ہماری روح اور ضمیر کا احتجاج ہے۔ اس احتجاج میں ساری کائنات شامل ہے کیونکہ اس ذکر کا عنوان ہی کرب و بلا ہے۔ کربلا وہ میدان ہے

جہاں بچے، بوڑھے، جوان، بیمار اور خود امام حق و صداقت کی خاطر جبر واستبداد کے جری لشکر کے سامنے بلا خوف وخطر قربانی، ایثار، شجاعت اور صداقت کا پیکر نظر آتے ہیں۔ کربلا کی سرزمین نے اس سے پہلے اس سے بہتر اور جری توحید ہی متوالوں کا گروہ کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ بقیع، بدر واحد کے بعد زمین کے کسی ٹکڑے کو شہیدوں کا اتنا گراں قدر خزانے کو محفوظ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

ذکرِ حسینؑ میری زندگی کا حصہ ہے۔ جس ماحول میں میری تربیت ہوئی وہ ماحول محمد وآل محمد کے ذکر واذکار سے معمور تھا۔ میری ماں روزانہ قرآن وحدیث واحوال معصومین کا ذکر کرتی۔ میں صرف سنا کرتا تھا لیکن دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس ذکر کی سعادت نصیب ہو۔ ہر گاہ کہ اپنی کم مائیگی کا شدید احساس تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ابھی تک تحریک حسین کے سارے گوشے ہمارے سامنے نہیں آسکے ایک اچھے مقصد کی تمنا کرنے کے حق سے میں اپنے دل کو محروم نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے خیالات لکھنا شروع کردئے۔ جب میں نے نصف صدی پہلے افکار حسینؑ پر غور شروع کیا تھا تو اس وقت ذہن ناپختہ تھا لیکن میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ابھی حال ہی میں میں نے ذکر حسینؑ کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں وہ سارے مضامین شامل نہیں کرسکا جن کو وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔ بقیہ مضامین کیلئے میں نے ایک علیحدہ عنوان حسینؑ ابن علیؑ تجویز کیا تاکہ امام کے حضور ایک اور ہدیہ نیاز پیش کیا جاسکے۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ میں نے اس عارضی زندگی کے کچھ لمحات امام حسینؑ کی تعلیمات پر غور کرنے اور اس غور وفکر کے نتائج کو ضبط تحریر میں لانے کیلئے صرف کئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہی لمحات میرے اللہ کے حضور میری سفارش کریں گے تاکہ جنت کے نوجوانوں کے سردار سیدنا امام حسینؑ کے ذکر کرنے والے اشخاص کو فردوس بریں کے انعام سے نوازا جائے۔

ہمارے ممدوح امام حسینؑ کا تعلق اہل بیت رسولؐ سے ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب تک آلِ رسولؐ پر درود وسلام کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے ہماری نماز کو بھی شرف قبولیت بخشا نہیں جاتا۔ اہل بیت کی شان میں قرآن پاک کی متعدد آیات نہایت منفرد انداز میں

محفوظ کر دی گئی ہیں۔ مباہلہ کیلئے سورہ ال عمران 03/03/61 اور آیۃ تطہیر کیلئے سورہ الاحزاب 22/33/33 ملاحظہ ہو۔

اہل بیت رسولؐ ابوالانبیاء سیدنا ابراہیمؑ کی ذریت اور دُعا کا ثمر ہے۔ اہل بیت رسولؐ ہی کا اعزاز ہے کہ ان کی محبت اور مودت قرآن کی لغت میں اجر رسالت قرار پائی سورہ شوری 25/42/23 کے مطابق اہل بیت رسولؐ کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ آپ امت کیلئے قرآن اور اہل بیت چھوڑے جا رہے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ اہل بیت رسولؐ ہی حدیث کے مطابق کشتی نجات قرار پائے اور اہل بیت رسولؐ کی یہ شان بھی منفرد ہے کہ ان میں سے کا ہر ہر فرد اپنی جگہ ایک ملت ہے، معیار ہے، کسوٹی ہے، ہدایت کا سرچشمہ اور ذریعہ نجات ہے۔ ان چاروں ہستیوں یعنی علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کی یہ شان بھی ہے کہ انہوں نے آغوش رسالت میں تربیت حاصل کی۔

ان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ یہ چاروں ہستیاں اہل بیت رسولؐ قرار پائیں یعنی رسولؐ پاک کی قربت، محبت، شفقت، تربیت نے ان ہستیوں کو سنوار کر مقصود کائنات بنا دیا۔ ان میں ہر ایک کی شان میں متعدد احادیث و واقعات مروی ہے لیکن ہمارے ممدوح سیدنا امام حسینؑ کا خصوصی اعزاز یہ ہے کہ آپ پنج تن پاک میں سے سب سے چھوٹے یعنی سب کی محبت کا مرکز اور چار کو پانچ کرنے والے اور آپ ہی کے متعلق حضور کا یہ فرمان جاری ہوا:

الحسین منی و انا من الحسین

یعنی حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسین میں سے ہوں۔ کیا کوئی فرد بشر یہ دعوے کر سکتا ہے کہ اس اعزاز میں وہ بھی شریک ہے یا ہو سکتا ہے؟ یہ محض اتفاق نہیں کہ پنج تن پاک میں سے امام حسینؑ کی شہادت سب سے آخر میں ہوئی۔ حضورؐ کی رحلت کا سال 11 ہجری ہے جبکہ سیدہ فاطمہ زہرہ بھی چند ہفتوں کے بعد اپنے والد محترم کو جا ملیں۔ سیدنا علیؑ کی شہادت کا سال 40 ہجری ہے جبکہ امام حسنؑ کی شہادت 56 ہجری میں ہوتی جبکہ پانچویں اور آخری فرد امام حسینؑ کی شہادت 61 ہجری میں ہوئی یعنی حضورؐ کی رحلت سے نصف صدی بعد تک امام

حسینؑ اس حدیث کے سایہ میں اس دنیا میں زندہ ہے کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں اور یہ اعزاز قیامت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

انذاز یعنی آ گاہی بھی کار رسالت ہے۔ انذار اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی جزو ہے کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ پیشگی اطلاع اور احوال کا موقع دیئے بغیر سزا نہیں دیتا۔ جب رسولؐ نے حسینؑ کو اپنا جزو قرار دیا تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ آپؐ ملت اسلامیہ کو آ گاہ کر دیا گیا کہ اس ہستی کے عمل کو عام آدمی کا عمل نہ سمجھا جائے اور جب یہ کسی کام کیلئے نکلے تو اسی طرح مدد کی جائے جس طرح اللہ کے حکم نافذ کرنے والے شخص کی مدد کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے۔

آیت مباہلہ نے قرآن کے قاری کو پانچ اشخاص سے متعارف کرایا تھا اور یہ پانچوں اشخاص اللہ تبارک تعالیٰ کی توحید کی گواہی دینے کیلئے میدان میں آئے تھے اور یہ قسم اٹھانے آئے تھے کہ جھوٹوں پر خدائے کی لعنت ہو۔ سورہ ال عمران 03/03/61 کے مطابق مباہلہ کا ننھا گواہ جسے بچپن ہی سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جب بھی توحید کا مسئلہ زیر بحث آ جائے تو کھلے میدان میں اپنی جان تک کو قربان کرنے سے گریز نہ کرنا۔ حسینؑ نے کئی بار اپنی زندگی کو اللہ تبارک تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کی پیشکش کی اور بالآخر 61 ہجری کے محرم الحرام کا یوم عاشورہ آپ کی شہادت قرآنی مطالبہ بشکل ذبح عظیم کا مظہر بن گئی۔ سورہ الصٰفت 23/37/107

امام حسینؑ کی زندگی، تعلیمات اور شہادت میں مومنین کیلئے کئی اسباق پوشیدہ ہیں لیکن ان میں سب سے نمایاں عبادت کا پہلو ہے۔ تلخ ترین حالات میں جس خلوص، شوق اور وارفتگی سے آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ کربلا تک کے سفر میں بالعموم اور یوم عاشورہ بالخصوص نمازوں کی ادائیگی اور تبلیغ کا عمل جاری رکھا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ان کے ایک ایک لمحہ نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ عبادت کا جوہر دراصل قربانی اور اطاعت ہے۔ اطاعت ہر صورت میں ہونا ہے۔ اطاعت موخر ہو سکتی ہے نہ ہی اس کو موخر کیا جا سکتا ہے۔ امام اور آپ کے پیروکاروں اور اہل خانہ نے ہر قسم کی تکلیف، محرومی، پریشانی

اور غریب الوطنی کے باوجود مومنانہ شان اور آزاد منش انسان کے انداز سے احکام الٰہی کی ٹھیک اسی طرح اطاعت کی ہے جس طرح اطاعت کرنے کا حق ہوتا ہے۔اس سے ہمیں قرآن پاک کا ایک اور اصول اجاگر ہوتا نظر آتا ہے۔سورہ الرعد 13/13/28 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الذین امنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الابذکر اللہ تطمئن القلوب۔

یعنی: جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ خلوص، عبادت، ذکر الٰہی، اطاعت شعاری، قربانی، ایثار، اطمینان قلب، تزکیہ نفس، شجاعت، اعلیٰ اقدار سے نظریاتی وابستگی، ایمان ہی وہ مقدس عناصر ہیں جنہیں گوندھ کر وہ مٹی بنی جو کربلا میں ان شہیدوں کے خون سے سیراب ہوئی۔اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: سورہ 10/09/88,111

بلاشبہ اللہ تبارک تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی (یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے کیونکہ جان و مال بھی اسی کا عطا کردہ ہے اور اس کے عوض جنت بھی اسکا احسان عظیم ہے۔) وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں قتل کرتے ہیں، اور قتل کئے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے۔تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ یوم عاشور مسلم بن عقیل کے فرزند یعنی رقیہ بنت علی ابن ابی طالب کے بطن سے پیدا ہونے والے عبداللہ جیسے نوعمر نے دشمن پر حملہ کرتے وقت جو شعر پڑھا اس کا

مطلب یہ تھا کہ آج میں اپنے والد مسلم اور ان دلاوروں سے ملاقات کروں گا جو نبی اکرم کے دین کی راہ پر مارے گئے ہیں۔ سبحان اللہ خاندان رسولؐ کے بچوں کے ایمان کا یہ عالم ہے کہ ان کیلئے موت شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اس بچہ پر دشمن کے حملہ کے جواب میں جب ہاشمی نوجوان آگے بڑھے تو امام نے فرمایا:

اے میرے خاندان والو! موت کیلئے اتنی بے تابی مت دکھاؤ، خدا کی قسم آج کے بعد کبھی کسی ذلت کا سامنا نہ کرو گے۔

یعنی جنت کی بشارت کے علاوہ غلاموں والی زندگی سے نجات کا مژدہ بھی سنایا جا رہا ہے۔ اپنے شیر خوار بچے سید علی اصغر کی شہادت پر جب آپ نے اس کے خون کو آسمان کی طرف اچھالا تو امام نے فرمایا: یہ مصیبت بھی میرے لئے آسان ہے کیونکہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

حسینؑ کے رضا کاروں کی شان ہی کچھ اور تھی۔ میر انیس اصحاب حسین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے، مہ نو تھے رکوع میں

ایک اور جگہ انیسؔ کہتے ہیں۔

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ جیسے آگے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہ سرفراز
کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر، بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

اب دیکھئے زہیر ابن قین جب شدید زخمی ہونے کے بعد خیمے میں آکر امام سے دوبارہ میدان جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو دو شعر پڑھتے ہیں جن کا عام

فہم مفہوم یہ ہے: میری جان آپ پر فدا ہو، اے ہادی اور ہدایت یافتہ آج میں آپ کے جد امجدؐ سے ملاقات کروں گا۔ حسن، علی مرتضیٰ اور دو پروں والے مسلح جواں مرد (جعفر طیار) سے ملوں گا۔ اسد اللہ حمزہ سے بھی جو ہمیشہ زندہ رہنے والے شہید ہیں۔

گورنر مدینہ ولید ابن عتبہ کو ایک خط کے ذریعہ امیرؓ معاویہ کی وفات اور یزید کی جانشینی کی اطلاع ملتی ہے۔ ولید کو اس کے عہدہ پر بحال رکھتے ہوئے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ سے فوراً بیعت طلب کی جائے کیونکہ وہ ان اشخاص میں سے تھے جنہوں نے امیرؓ معاویہ کی زندگی میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی۔ یہ واقعہ ماہِ رجب سن ساٹھ ہجری کا ہے اور مشاورت کیلئے ولید مدینہ کے سابق گورنر مروان ابن حکم کو بلواتا ہے۔ طے ہوا کہ حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہؓ ابن زبیر کو گونر ہاؤس میں طلب کر کے بیعت حاصل کر لی جائے۔

گورنر کا ہرکارہ روضہ رسولؐ جاتا ہے جہاں عبداللہ ابن زبیرؓ اور امام حسینؑ تشریف فرما ہیں۔ انہیں پیغام پہنچتا ہے۔ امام معاملہ کو بھانپ کر عبداللہ ابن زبیرؓ سے فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے ان کا حاکم مر گیا ہے اور ہمیں بیعت کیلئے طلب کیا گیا ہے۔ یہ بھی بیان ہوتا ہے کہ امام نے فرمایا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ معاویہ کا گھر شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور اس کا منبر منہدم ہو چکا ہے۔

امام گورنر ہاؤس پہنچتے ہیں اور حسب توقع انہیں امیر معاویہؓ کے انتقال اور یزید کیلئے بیعت کی اطلاع ملتی ہے۔ امام فرماتے ہیں کہ اُن جیسی شخصیت رات کی تاریکی میں بیعت نہیں کر سکتی۔ بیعت کا معاملہ روزِ روشن میں سب کے سامنے کیا جائے۔ جہاں فیصلہ ہو جائے گا۔ مروان بڑا شاطر تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ولید کو مشورہ دیا کہ اگر رات کی تاریکی میں حسینؑ سے بیعت نہ لے سکے تو پھر خونریزی کے بغیر بیعت نہ لی جاسکے گی۔ حسینؑ کے انکار پر یہیں انہیں قتل کر ڈالو۔ یہ سن کر امام جلال میں آ کر کہتے ہیں کہ:

اے زرقا کے بیٹے! مجھے تو قتل کرے گا یا ولید؟ تم جھوٹے اور گنہگار

ہو۔

اس کے بعد امام اپنا تعارف کراتے ہیں۔اسی تعارف کو پیش کرنے کیلئے ہم نے اس کتاب کی ابتداء بیعت طلبی ہی ے واقعہ سے کی ہے۔امام کا خطبہ ملاحظہ ہو۔ہم نے قارئین کرام کی آسانی کیلئے مسلسل رواں ترجمہ درج کرنے کی بجائے اسے مسلسل ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ امام کے فوری ردعمل میں امام کے موقف اور مستقبل کے لائحہ عمل سے آگاہی ہو سکے۔فرماتے ہیں۔

1- اے امیر! ہم خاندان نبوت اور معدن رسالت ہیں۔

2- ہمارے گھروں پر فرشتوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔

3- ہمارے خانوادے پر الٰہی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

4- اللہ تبارک تعالیٰ نے اسلام کو ہمارے گھرانے سے شروع کیا۔

5- آخری وقت تک ہمارا گھرانہ اسلام کے ساتھ رہے گا۔

6- لیکن (اس کے برعکس) تم یزید جیسے شخص کی بیعت کا (مجھ سے) مطالبہ کر رہے ہو۔

7- جو شراب خور ہے۔

8- بے گناہ انسانوں کو قتل کرتا ہے۔

9- اللہ تبارک تعالیٰ کے احکام کو پامال کرتا ہے۔

10- کھلے بندوں فسق و فجور کا مرتکب ہوتا ہے۔

11- میں ایسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔

12- اب ہم آنے والے وقت کا انتظار کرتے ہیں اور

13- دیکھتے ہیں کہ خلافت کا مستحق کون ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہم اپنی توجہ امام کے ان کلمات کی طرف مبذول کرتے ہیں جو انہوں نے (1) مروان بن حکم کی تجویز کے سلسلے میں کہے۔(2) اپنے جد رسولؐ اللہ کے روضہ اقدس پر کہے۔ (3) محمد حنفیہ کے سوال کے جواب میں اور وصیت کے ذریعہ کہے۔ (4) مدینہ سے روانگی کے وقت ارشاد فرمائے اور (5) عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر

سے گفتگو کے دوران کہے گئے۔ (6) منیٰ میں 58 ہجری کے خطبہ صدارت میں کہے (7) 60 ہجری مکہ سے روانگی کے وقت (8) شاعر فرزدق سے گفتگو کرتے ہوئے فرمائے۔

1- مروان بن حکم کی تجویز

مدینہ کے گورنر ہاؤس میں بیعت کے مطالبہ سے اگلے روز امام کی ملاقات مروان بن حکم سے سرراہ ہوتی ہے اور وہ انہیں یزید کی بیعت کی مشورہ دیتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں امام کی بھلائی اسی چیز میں ہے۔امام فرماتے ہیں:-

> اگر امت کی رہبری یزید جیسے شخص کے ہاتھوں میں ہوتو پھر اسلام پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔ میں نے اپنے جد رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا: خلافت خاندان ابوسفیان پر حرام ہے اور اگر معاویہ کو کبھی میرے منبر پر دیکھو تو اسے قتل کر دو لیکن اہل مدینہ نے معاویہ کو منبر پر دیکھنے کے باوجود اسے قتل نہیں کیا اور (اب اس کی سزا میں) خدا نے انہیں یزید جیسے فاسق و فاجر (کی حکمرانی کی مصیبت) میں مبتلا کر دیا ہے۔

2- روضۂ رسولؐ

امام دوبار اپنے جد امجد رسولؐ اللہ کے حضور حاضر ہوتے ہیں اور التجا کرتے ہیں:

> السلام علیک یا رسولؐ اللہ...... میں حسینؑ آپ کا فرزند اور آپ کا نواسہ حاضر ہوں۔ میں آپ کا وہ فرزند ہوں جسے آپ نے امت کی رہنمائی اور ہدایت کیلئے اپنا جانشین بنایا تھا۔اے رسولؐ اللہ آپ گواہ رہیے کہ انہوں نے مجھے بے یارومددگار چھوڑ دیا ہے۔ میری حفاظت نہیں کی۔ یہ آپ کی بارگاہ میں میری شکایت ہے یہاں تک کہ میں آپ سے آ کر ملوں (یعنی مجھے موت آ جائے)

یہ التجا امام نے گورنر ہاؤس سے واپسی کے بعد نانا جان کی قبر پاک پر پیش کی جب آپ سے نہایت ہی نازیبا اور دھمکی آمیز انداز میں یزید کی بیعت طلب کی گئی تھی۔ تاریخ میں امام کی دوسری حاضری بھی درج ہیں اور جو الفاظ آپ نے وہاں ادا کئے ان پر غور کرنے

سے ہمیں امام کے ارادوں کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔فرماتے ہیں۔

اے میرے اللہ یہ قبر تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے اور میں تیرے اس نبی کی بیٹی کا بیٹا ہوں جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے وہ تیرے علم میں ہے۔اے میرے پالنہار میں نیکی اور بھلائی سے محبت کرتا ہوں اور برائی سے نفرت کرتا ہوں (یعنی قرآنی اصول امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا داعی ہوں) اے ذوالجلال والاکرام! اس قبر اور اس صاحب قبر کا واسطہ (میں التجا کر رہا ہوں حضورؐ کے توسط سے) کہ آپ میرے لئے وہ راستہ پسند فرمائیں جس میں آپ کی اور آپ کے رسولؐ کی رضا اور خوشنودی شامل ہو۔

اس دُعا میں ہمیں مستقبل کے لائحہ عمل کی بنیاد یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہونا واضح طور پر نظر آتی ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول قرآن پاک نے پیش کیا ہے چونکہ اس اصول کا ماخذ قرآن ہے اور اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے لہٰذا اسے فقہی زبان میں محض مستحب یا واجب کہنا درست نہیں ہوگا بلکہ اسے ہم فرائض ہی میں شمار کریں گے۔فرض بھی ایسا کہ امام نے اپنے مستقبل کو اس فرض کی ادائیگی کیلئے وقف کر دیا ہے۔اس میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جبر یا مجبوری کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ امام بطیّب خاطر فرماتے ہیں کہ اے میرے پروردگار میں تیرے حکم یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے محبت کرتا ہوں یعنی میں نے اپنے نقطہ نظر، عمل، سوچ اور فکر کو تیرے ہدف کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے اور اس ہم آہنگی کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔کیونکہ میں نے اس چیز سے پیار کیا ہے جو تیری منشاء کا مظہر ہے۔

3- محمد حنفیہ سے گفتگو اور وصیت

محمد حنفیہ امام حسینؑ کے نسبی بھائی تھے۔آپ کی والدہ خولہ بنت جعفر حنفیہ تھیں جن کے بطن سے صرف ایک ہی اولاد پیدا ہوئی جن کا نام محمد، کنیت ابوالقاسم تھی۔آپ ابن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔آپ کی وفات 81 ہجری میں ہوئی اور آپ کا مدفن طائف میں ہے۔60 ہجری میں آپ بیمار تھے اور آپ کا ہاتھ شل تھا جس کی وجہ سے امام کے ساتھ کربلا

نہ جا سکے۔

ابن حنفیہ نے امام حسینؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر دُکھ کا اظہار کیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ امام کو کسی ایسے شہر جانا چاہیے جو یزید کی پہنچ سے باہر ہو اور کسی دور دراز علاقے سے اپنی تحریک کا آغاز کرنا چاہیے جو یزید کی پہنچ سے باہر ہو۔ انہوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ نزدیک شہروں میں ٹھہرنے کی وجہ سے لوگ تقسیم ہو جائیں گے اور اس طرح اہل بیت رسول کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ امام نے فرمایا:

اے میرے بھائی! اگر اس وسیع و عریض دُنیا میں میرے لئے کوئی پناہ نہ بھی رہے تب بھی میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔ اے میرے بھائی! اللہ تبارک تعالیٰ آپ کو اس خیر خواہی اور ہمدردی کا بہترین اجر عطا کرے۔ میں نے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے بھائی، بھتیجے اور کچھ لوگ ساتھ جانے کو تیار ہیں کیونکہ یہ لوگ میرے مشن سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے اہداف بھی وہی ہیں جو میرے مقاصد ہیں۔ آپ کے ذمہ یہ کام ہے کہ میری عدم موجودگی میں آپ یہاں مدینہ میں میری آنکھ بن کر رہیں اور کوئی اہم بات آپ سے پوشیدہ نہ رہے۔

امام کے اس بیان سے بات روز روشن کی طرح نظر آتی ہے کہ امام کے قیام کا فیصلہ محض ان کا ذاتی فیصلہ نہ تھا بلکہ گھر کے اندر اور عزیز و اقربا اور دوست احباب کے ساتھ اس موضوع پر اور اس کے ممکنہ نتائج پر پوری طرح غور ہوا تھا۔ مدینہ سے ہجرت کا فیصلہ مشترکہ اقدام تھا۔ خواتین کا امام کے ساتھ جانا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ عورتوں اور بچوں کو مجبوراً ساتھ نہیں رکھا گیا تھا۔

یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اپنے بھائی سے گفتگو کرنے کے بعد امام ایک بار پھر روضہ رسولؐ کی طرف گئے اور آپ مشہور شاعر یزید بن مضرغ کے جو شعر پڑھ رہے تھے ان کا مفہوم کچھ اس طرح ہے: مجھے کوئی خوف نہیں کہ صبح کے وقت مجھ پر حملہ ہو یا رات کی تاریکی میں نشانہ بنوں۔ اگر میں موت کے ڈر سے ذلت قبول کر لوں اور خطرات سے بچنے کی کوشش کروں تو

مجھے یزید بن مضرغ نہ کہنا۔

اس کے بعد آپ نے ایک وصیت نامہ محمد ابن حنفیہ کے سپرد کیا۔ وصیت نامہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد لکھا تھا کہ: یہ وصیت حسینؑ ابن علیؑ کی اپنے بھائی محمد حنفیہ کے نام ہے۔ حسین گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی کوئی اس کا شریک ہے اور محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جو منجانب اللہ دین حق لے کر آئے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جنت اور دوزخ حق ہیں اور روز جزاء کے آنے میں کوئی شک نہیں اور اس روز سارے اہل قبور زندہ کئے جائیں گے بحکم الٰہی۔ مدینہ سے میرا نکلنا نہ تو خود پسندی کیلئے ہے اور نہ ہی تفریح طبع کی غرض سے ہے اور نہ ہی میرا مقصد فساد برپا کرنا ہے یا ظلم و ستم بھی میرا مقصد نہیں۔ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کیلئے نکلا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دوں اور اس طرح اپنے نانا اور بابا کی سیرت کی پیروی کروں۔ اب اگر کوئی میری دعوت کو حق سمجھ کر قبول کرے تو ایسا شخص اللہ کا راستہ اختیار کرے گا اور اگر کوئی میری اس دعوت کو قبول نہ کرے تو میں صبر کروں گا تاوقتیکہ اللہ میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے اور اللہ ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اے بھائی! یہی آپ کیلئے میری وصیت ہے اور میری توفیقات تو اللہ ہی کی جانب سے ہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی جانب مجھے پلٹنا ہے۔

سید علی رضا موسوی نے اس وصیت نامہ کو تقریباً انہی الفاظ میں نقل کیا ہے۔

اس گفتگو اور وصیت نامہ سے امام کے قیام کے مقاصد، اہداف کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ امام نے 58 ہجری میں حج کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اپنی تحریک کا منشور پیش کیا تھا اس کا عملی جامہ ان کلمات میں نظر آ رہا ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ مدینہ سے ہجرت دراصل قیام حسینی کی ابتداء ہے۔ اب ہم مدینہ چھوڑتے وقت امام کی گفتگو پر غور کرتے ہیں۔

4- مدینہ چھوڑتے وقت

مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کوئی معمولی اقدام نہ تھا۔ یہ شہر محض ایک شہر نہ تھا اور نہ ہی اس

کی حیثیت یہ تھی کہ اس جگہ امام پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ اس شہر کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ نبی آخرالزماں اس شہر کی خاک میں آسودہ ہیں۔ یہ شہر اس دنیا میں پیغام الٰہی کی بنیاد پر پہلا اسلامی ملک تھا۔ اس شہر کو تبلیغ دین کا شرف حاصل ہے اور اس شہر میں اللہ کے کتنے نیک بندے دفن بھی ہے۔ آل رسولؐ کے اکثر افراد اور اصحاب کرامؓ کی قبریں اسی شہر میں ہیں اور یہ وہ شہر ہے جہاں وحی اختتام پذیر ہوئی اور شہر کو ریاض الجنتہ رکھنے کا شرف حاصل ہے۔

امام حسینؑ بروز اتوار ماہ رجب کے ختم ہونے سے دو روز قبل سب لوگوں کی موجودگی میں اپنے اہل و عیال و احباب کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے لوٹ کر اس شہر واپس نہیں آنا۔ آپ کو مشورہ دیا گیا کہ عبداللہ ابن زبیرؓ کی طرح نامانوس راستے کے ذریعہ ہجرت کریں لیکن آپ نے فرمایا:

قطعاً نہیں! خدا کی قسم میں کسی بھی صورت معروف شاہراہ چھوڑ کر

انجانے راستے پر سفر نہیں کروں گا یہاں تک کہ جو اللہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔

بظاہر تو اس خطاب میں اس تجویز کا جواب تھا کہ آپ چھپ چھپا کر مدینہ سے مکے جائیں جس طرح عبداللہ ابن زبیر مکہ بھاگ گیا ہے لیکن امام کے اس بیان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امام وہی معروف راستہ اختیار کرے گا جو اللہ کے خالص بندے اختیار کرتے ہیں چاہے وہ راستہ بظاہر بند گلی ہی کی طرف جاتا ہو۔ امام شیطانی راستوں کی طرف نہیں جاسکتے۔ امام شعوری طور پر حکومتی جبر کے خلاف ہجرت کر رہے ہیں اور ان کی ہجرت اللہ کے گھر کی طرف ہے۔ یہ ہجرت ایک مسلمان علاقہ سے دوسرے مسلمان علاقہ کی طرف ہے۔ ہجرتِ رسولؐ دارالکفر سے دارالامان کی طرف ہجرت تھی۔ ان دونوں ہجرتوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور ان کے اپنے اپنے محرکات و مقاصد ہیں۔ دین مکمل ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے لہٰذا آج کی ہجرت جوہری طور پر ہجرت نبوی سے مختلف ہے۔ وہ ہجرت اسلام کے طلوع کیلئے تھی جبکہ یہ ہجرت اسلام کے قیام کیلئے ہے۔ اس لمحے امام کی زبان پر سیدنا موسیٰؑ کے کلمات جاری ہیں جو سورہ قصص 20/28/21 میں اس طرح محفوظ ہیں

فخرج منها خائفاً يترقب قال رب نجني من القوم الظالمين

یعنی امام سیدنا موسیٰ کی طرح ہجرت کا سفر اختیار کر رہے ہیں تا کہ ظالموں کی قوم سے نجات کا بندوبست کیا جا سکے۔ اس آیت کا مطلب واضح ہے کہ امام ذاتی خوف کی وجہ سے ہجرت نہیں کر رہے اور نہ ہی غیر معروف راستوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔ سیدنا موسیٰ کی دُعا پڑھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ امام سنت انبیاء کا احیاء کر رہے ہیں۔ امام آزادی، حریت فکر، تکریم آدم، خوف وحزن سے نجات اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حصول کیلئے ہجرت کر رہے ہیں تا کہ ظلم و جور سے انسان کو نجات حاصل ہو سکے۔

سیدنا موسیٰؑ کی دُعا کو وردِ زبان لانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ قرآن پاک نے سیدنا موسیٰ کو تین بڑے ظالموں کے مقابلہ کیلئے ایک معیار بنا دیا ہے۔ سیدنا موسیٰ فرعون کو چیلنج کرتے ہیں جو حکومت کے نشے میں ربّ بن بیٹھا تھا۔ سیدنا موسیٰؑ قارون کا مقابلہ کرتے ہیں جو ریاست میں موجود ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے لوگوں کو معاشی غلامی میں جکڑ رہا ہے۔ تیسرا ہدف ہامان ہے جسے سیدنا موسیٰؑ چیلنج کرتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو دین کو تھوڑی قیمت پر بیچ کر فرعون کی طرف سے مسلط کردہ سیاسی غلامی اور قارون کی دی ہوئی معاشی غلامی کو مذہبی جواز مہیا کرتا ہے۔ چونکہ ہم نے ہجرت کے مسئلے کو چھیڑا ہے لہٰذا میں قارئین کو اس جگہ غلام احمد پرویز کی ہجرت کے حوالے سے ایک تحریر کے اقتباس کی طرف متوجہ کروں گا۔

سیدنا ابراہیمؑ کے حوالے سے صاحب مضمون ہجرت کے موضوع پر لکھتے ہیں۔

ہجرت کا مفہوم ومقصود

''اِس ترکِ وطن کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ دعوتِ حق وصداقت کی راہ میں اس قدر زہرہ گداز اور جگر شگاف آزمائشوں سے (معاذ اللہ) منہ موڑ کر چل دیئے بلکہ خدا کے حکم سے، خداہ کی راہ میں مزید سعی و کاوش کی غرض سے ایک مساعد ماحول اور تخم گیر اور بارآور سرزمین کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرات انبیاء کرامؑ کے اسوۂ مقدسہ میں ہجرت ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے جس کے اندر ملتِ حنفیہ کیلئے ایک بصیرت افروز اور حیات آور پیغام مضمر ہے۔ نظامِ خداوندی کا داعی بہر حال ایک خاص مقام میں پیدا ہوتا ہے

اور وہیں کے رہنے والے اس کے پیغام کے اوّلیں مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی گردوپیش کی فضا کو اس نظام کیلئے سازگار بنائے لیکن جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ فضا کی کثافتیں ایسی محکم ہو چکی ہیں کہ ان کا تجزیہ ناممکن ہے تو بجائے اس کے کہ اس ناسماعد ماحول میں غیر فطری زندگی بسر کرنے اپنے آپ کو مجبور سمجھ لے، وہ اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جاتا ہے، جہاں اس نظام الٰہیہ کے قیام و بقا کیلئے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ ہے خاکِ وطن اور ایمانِ مومن کا باہمی تعلق، مردِ مومن پا بگل نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ کسی خاص سرزمین میں پیوست ہو کر رہ جائے۔ وہ آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ جہاں اسے قانون خداوندی کی اطاعت کے بجائے انسانوں کی غلامی پر مجبور کیا جائے وہ اپنے خدائے ارض و سموٰت کی اس فضائے بسیط میں بال کشاء ہو اور جہاں اُسے خالص اللہ کی محکومیت کی فضا میسر آئے سکونت پذیر ہو جائے بقول علامہ اقبالؒ

ہجرت آئینِ حیات مسلم است
ایں زاسبابِ ثباتِ مسلم است
معنی اواز تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

''اگر آپ کسی ایسے کمرے میں بیٹھے ہوں جہاں کوئلہ کی گیس آہستہ آہستہ ساری فضا کو زہر آلود کئے جا رہی ہے تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جلدی سے کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیئے جائیں۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ وہ اس طرح سے بند ہیں کہ آپ کی کوشش سے کھل نہیں سکتے تو آپ اطمینان سے کمرے میں نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ پوری قوت سے دروازہ توڑ کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل جانے کی کوشش کریں گے تا کہ کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ یہ انسان کا طبعی تقاضا ہے۔ اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ پرندوں اور مویشیوں تک کی یہ حالت ہے کہ جب کسی ایک ماحول میں ان کی ضروریاتِ زندگی کے سامانِ مفقود یا اس کی فضا ناسماعد ہو جاتی ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ طبعی تقاضوں کے ماتحت رونما

ہوتا ہے لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) انسان کی زندگی فقط حیوانی (طبیعی) زندگی نہیں۔ اس سے آگے، انسانی زندگی اور اس کے تقاضے بھی ہیں جن انسانوں کو اس انسانی زندگی کا احساس ہوتا ہے، ان کے نزدیک کسی ایسی فضا میں سانس لینا، جہاں غیر اللہ کی حکومت سے اس کی انسانیت کا دم گھٹ رہا ہو، ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس فضا کو چھوڑ کر کسی مساعد فضا میں جانے کیلئے اُس شخص سے بھی زیادہ مضطرب و بے قرار ہوگا جو کوئلے کے گیس سے مسموم کمرے میں گھر چکا تھا۔ لیکن اس میں سوال فقط احساس کا ہے جو شخص کوئلے کے گیس سے بے ہوش نہ ہو چکا ہو وہ کمرہ چھوڑ دینے کیلئے مضطرب نہیں ہوگا۔ اس میں اسکی احساس و شعور ہی باقی نہیں رہا۔ اسی طرح جس کی ''انسانیت'' غیر خداوندی نظام کی محکومیت سے اس درجہ ماؤف ہو چکی ہو کہ اس میں احساس و شعور ہی باقی نہ رہے اس میں اس فضا کو چھوڑنے کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہوگا۔ نہیں! بلکہ وہ تو اس پرندے کی طرح، جو قفس کی زندگی کا خوگر ہو چکا ہو، اصل زندگی پنجرے کی تیلیوں کے پیچھے ہی محسوس کرے گا۔ اسے اگر آپ باہر نکالنے کی کوشش بھی کریں گے تو وہ پھر اندر جانے پر مصر ہوگا، جس کی ذہنیت یوں مسخ ہو چکی ہو وہ اِنِّیْ ذٰھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ کا مفہوم کیا سمجھے؟ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ اور اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہے کہ مؤمن ہمیشہ غیر خدا سے خدا کی طرف رُخ کرتا ہے اور اس میں وطن کی محبت کی خاردار جھاڑیاں بھی دامن گیر نہیں ہوتیں۔ اس کا حقیقی وطن وہی ہے جہاں قوانینِ خداوندی کی حکومت ہو اور جب ان قوانین کی حکومت ساری دُنیا پر پھیل جائے تو ساری دُنیا اس کا وطن ہے اور یہی اس کا نصب العین حیات ہے۔''

5- عبداللہ ابن عباسؓ اور عبداللہؓ ابن عمر سے گفتگو

عبداللہؓ ابن عمر بھی مکہ میں مقیم تھے کیونکہ وہ بھی یزید کی بیعت سے انکاری تھے۔ شروع میں جب ولید نے انہیں بیعت کیلئے طلب کیا تو عبداللہؓ نے کہا کہ جب سب لوگ بیعت کرلیں گے تو وہ بھی بیعت کرلیں گے۔ تاریخ طبری کے مطابق عبداللہؓ ابن عمر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاریخ ابن خلدون کے مطابق عبداللہ ابن عمرؓ نے امام حسینؑ کو ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''تم بیعت لینے اور امارت حاصل کرنے کیلئے مکہ معظمہ سے باہر نہ

جاؤ۔ اللہ جل شانہ نے رسولؐ اللہ کو دُنیا و آخرت دونوں میں سے ایک کے اختیار کر لینے کا اختیار دیا تھا۔ آپ نے آخرت منظور فرمائی تھی چونکہ تم (یعنی امام حسینؑ) آپؐ کا ایک جزو ہو (لہٰذا) دُنیان کی طلب نہ کرو اور نہ اس کے گرد و غبار میں اپنے دامان مبارک کو آلودہ کرو۔"

اس کے علاوہ ابن خلدون نے عبداللہؓ ابن عباس کی نصیحت کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ عراق کی بجائے امام یمن جائیں۔ عبداللہؓ ابن عباس کو امام نے کہا کہ اے چچا زاد بھائی بخدا میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ، ہمدرد اور مجھ پر مہربان ہیں لیکن میں نے (عراق کی جانب) سفر کا پختہ ارادہ کر لیا ہوا ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ (یزید کی نوکر شاہی) مجھے نہیں چھوڑیں گے اور جب یہ لوگ یہ ظلم (یعنی میرے قتل کا ارتکاب) کر بیٹھیں گے تو اللہ ان پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو انہیں ایسا ذلیل و خوار کرے گا کہ یہ عورت کے حیض کے استعمال کئے ہوئے کپڑے سے بھی زیادہ پست ہو جائیں گے۔

امام حسینؑ جب مکہ پہنچے تو عبداللہؓ ابن عمر مستحب عمرہ کی ادائیگی اور بعض ذاتی کاموں کے سلسلے میں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ابھی امامؑ کی تشریف آوری کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ عبداللہؓ ابن عمر نے مدینہ واپسی کا فیصلہ کیا اور امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؑ کو یزید سے مصالحت اور اس کی بیعت کر لینے کا مشورہ دیا اور طاغوت کی مخالفت اور جنگ جدال کے خطرناک نتائج سے متنبہ کیا۔ یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کیوں نواسہ رسولؐ ہی کی بیعت کو ہر قیمت پر یقینی بنانا چاہتی تھی اور دوسری صورت میں امام حسینؑ کا وجود بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ امام حسینؑ کے ہم عصر دیگر خلفاء راشدین کے صاحبزدگان، عبداللہ ابن عباس اور نوجوان نسل کے دیگر اہم لوگ بھی موجود تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی انتظامیہ باقی احباب کی طرف سے مطمئن تھی کہ ان کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوگی بلکہ یہ لوگ بتدریج یزید کی بیعت کے حلقے میں داخل ہو جائیں گے۔

خوارزمی نے تحریر کیا ہے کہ عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا: اے ابا عبداللہؑ! لوگوں نے اس

شخص کی بیعت کر لی ہے اور کیونکہ مال و دولت اسی کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا بہر حال اس کی حکومت کو تسلیم کر لیں گے۔ خاندان بنی اُمیہ کی آپ کے ساتھ دیرینہ دشمنی کے پیش نظر مجھے ڈر ہے کہ اس کی مخالفت کی صورت میں آپ مارے جائیں گے اور اس راہ میں بعض مسلمان بھی اپنی جان سے جائیں گے۔ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے، آپؐ نے فرمایا تھا کہ حسین مارے جائیں گے اور اگر لوگوں نے ان کی حمایت و نصرت نہ کی تو ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ کیلئے میرا تو یہی مشورہ ہے کہ باقی افراد کی طرح آپ بھی بیعت و صلح کا راستہ اختیار کر لیں اور مسلمانوں کے قتل و کشتار سے خوف کھائیں۔ اس بیان سے ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اگر موصوف کو اس حدیث کا علم تھا کہ حسین مارے جائیں گے اور اگر لوگوں نے ان کا ساتھ نہ دیا تو ذلیل و خوار ہوں گے، تو لامحالہ یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ موصوف نے حسینؑ کی نصرت و حمایت کرنے میں کوتاہی کیوں کی؟

امام علیہ السلام، جنہوں نے مختلف لوگوں کے ساتھ گفتگو کے دوران، ہر ایک کو اس کی فہم بصیرت اور طرزِ فکر کے مطابق جواب دیئے تھے، آپؑ نے عبداللہؓ ابن عمر کے مشورے کے جواب میں فرمایا:

''(اے ابوعبدالرحمٰن! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ دُنیا اللہ کے نزدیک اتنی پست اور حقیر ہے کہ یحیٰی ابن زکریا (جیسے برگزیدہ اور عظیم نبی) کا سر اقدس بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کو تحفے کے طور پر بھیجا گیا۔

کیا تم نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل (خدا کی نافرمانی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ) طلوع فجر سے طلوع شمس تک کے درمیان عرصے میں ستر پیغمبروں کو قتل کرتے تھے اور پھر اس طرح خرید و فروخت اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے جیسے کچھ کیا ہی نہ ہو اور خداوند متعال نے (ان پر) اپنے عذاب میں عجلت نہیں کی بلکہ انہیں ڈھیل دیتا رہا، یہاں تک کہ آخر کار اسی قادر اور منتظم نے ان پر شدید ترین گرفت کی۔''

امامؑ نے مزید فرمایا:

''اے ابوعبدالرحمٰن! خدا سے ڈرو اور ہماری مدد و نصرت سے کنارہ کش نہ ہو۔''یعنی امام نے اسی حدیث کے حوالے سے ان کی ذمہ داری کا انہیں شدت کے ساتھ احساس دلا کر حجت تمام کر دی۔

شیخ صدوق نے نقل کیا ہے کہ جب عبداللہؓ ابن عمر نے اپنا مشورہ بے سود ہوتے دیکھا تو عرض کیا: اے ابا عبداللہ! آپ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور الوداع کہتا ہوں کیونکہ اس سفر میں آپ قتل کر دیئے جائیں گے۔

6- مکہ میں 58 ہجری کا تاریخی اجتماع

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کا اہتمام شروع کر دیا۔ امیر کا یہ اقدام نہ صرف صلح امام حسنؑ کی شرائط کے خلاف تھا بلکہ اسلامی تعلیمات میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش تھی کیونکہ شرائط کے مطابق امیر معاویہؓ کی زندگی کے بعد خلافت کا مسئلہ عوامی رائے سے طے ہونا تھا۔ علاوہ ازیں امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں بعض اقدام ایسے ہوئے جن کے خلاف آواز اُٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔ سید علی رضا موسوی لکھتے ہیں۔

''حضرت امام حسن علیہ السلام 39 ہجری کو معاویہ کی زہر سے جو جعدہ بنت اشعث بن قیس کی توسط سے جو کہ حضرت امام کی بیوی تھی، شہید کیا گیا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد فتنہ و فساد اور مصائب و اعلام زیادہ ہو گئے۔ خصوصاً شیعوں پر زیادہ سختی کی گئی۔ پورے اسلامی مملکت میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی نہیں تھی کہ جہاں پر کوئی خدا کا نیک بندہ رہتا ہو اور اس کی جان محفوظ ہو اور وہ لوگوں سے کٹا ہوا نہ ہو اور لوگ اُسے بُری نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں۔ اس کے برعکس دشمنان خدا بغیر کسی پردے کے علانیہ بدعت اور گمراہی پر فخر و مباحات کیا کرتے تھے۔

معاویہؓ کے مرنے کے ایک سال پہلے امام حسینؑ، عبداللہ بن جعفرؓ اور عبداللہ بن عباس کے ساتھ صبح بیت اللہ کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے۔ حضرت امام حسینؑ نے اس موقع پر بنی ہاشم کے تمام لوگوں کو حتی کہ مرد، عورتیں اور بنی ہاشم کے آزاد شدہ غلاموں کو

جنہیں آپ جانتے تھے، ان سب کو اکٹھا کیا اور اس کے بعد مختلف علاقوں میں اپنے ایلچی بھیجے اور انہیں یہ پیغام دیا کہ جناب رسولؐ خدا کے اصحاب میں سے جو بھی زہد و تقویٰ اور عبادت میں مشہور و معروف ہوں اسے منیٰ میں میرے پاس لے آئیں۔

58 ہجری حج کے موقعہ پر پہلی بار ایک بین الاقوامی حج کانفرنس کا اہتمام ہوا جس میں خاصی تعداد میں مندوبین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں امام نے اپنی تحریک کا اعلان کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کانفرنس کی کارروائی کا ایک ایک لفظ حاکم دمشق کو پہنچا ہوگا جس کی روشنی میں ہیئت حاکمہ کو مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے اور منصوبہ بندی کیلئے آسانی پیدا ہوگئی ہوگی۔

حضرت امام حسینؑ خطبہ صدارت کیلئے کھڑے ہوئے خداوند کریم کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

''بے شک اس ظالم مرد نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اور ہمارے شیعوں کے ساتھ کیا ہے۔ اسے آپ نے دیکھا ہے اور جانا ہے اور مشاہدہ کیا ہے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرو اگر میں جھوٹ کہوں تو مجھے جھٹلاؤ۔

''تمہیں خدا کے حق کا واسطہ اور رسولؐ خدا کے حق کا واسطہ اور میری رسولؐ خدا سے جو قرابت ہے اس قرابت کا واسطہ جب تم لوگ یہاں سے اپنے شہروں کی طرف جاؤ تو میرے اس پیغام کو اپنے شہروں اپنے قبیلوں، رشتے داروں اور ان لوگوں تک پہنچاؤ جن پر تمہیں وثوق ہو ان تک پہنچاؤ اور ہماری روایت کی طرف ان کو دعوت دو۔

''اگر جھوٹ بولوں تو میری تکذیب کرو (مجھے جھٹلاؤ) آپ میری باتوں کو سنیں اور لکھیں اس کے بعد اپنے شہروں اور قبیلوں کی طرف پلٹو اور جس شخص کو آپ امین اور موثق سمجھتے ہو تو اسے ہمارے حق سے آگاہ کرو اور ہماری طرف دعوت دو۔ کیونکہ مجھے اس امر کے مٹنے کا حق کے ختم ہونے کا اور باطل کے مغلوب ہونے کا خطرہ ہے۔

''حضرت امام حسینؑ اپنے اس خطبہ میں تمام ان چیزوں کا ذکر فرمایا اور تفسیر فرمائی کہ جن کا ذکر خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا اور ان چیزوں کا ذکر فرمایا کہ جو پیغمبر اسلامؐ

نے اپنے والد، اپنی ماں، اپنے بھائی اور خود اپنے متعلق اور اپنی اہل بیتؑ کے متعلق فرمایا۔
ان فرمودات میں سے جو بات بھی حضرت امام حسینؑ کہتے تھے صحابہ کرام ہر بات کی تصدیق کرتے تھے کہ ہم نے پیغمبر اسلامؐ سے ایسا ہی سنا اور جب رسول اللہؐ نے یہ فرمایا تھا ہم وہاں موجود تھے اور تابعین میں سے بھی یہی کہتے تھے کہ یہ باتیں جو صحابہ کرامؓ نے ہم تک پہنچائی ہیں ہمیں ان پر اعتماد ہے اور یہ ہماری امانت تھیں جو انہوں نے ہم تک پہنچائیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا خدا کی قسم میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ان مطالب اور باتوں کو ایسے افراد تک پہنچاؤ جو دین سے متمسک ہیں۔

''سلیم کہتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے لوگوں کے سامنے جن الفاظ میں احتجاج کیا وہ یہ ہیں:

''میں خدا کا واسطہ دے کر تم سے کہتا ہوں کہ یہ بتاؤ کہ کیا علیؑ رسولؐ اللہ کے بھائی نہیں تھے۔ جب رسولؐ خدا نے تمام صحابہ کرام کے درمیان رشتہ اخوت کو استوار کیا تھا اور صیغہ اخوت پڑھا تھا تو کیا پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی اور کو اپنا بھائی بنایا تھا؟ خدا کی قسم نہیں بلکہ صرف اور صرف حضرت علیؑ کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھا تھا اور فرمایا تھا علیؑ تو میرا بھائی اور میں تیرا بھائی ہوں۔ ہمارے درمیان یہ رشتہ دنیا وآخرت میں قائم ودائم ہے اور میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ رسولؐ خدا نے غدیر خم کے مقام پر میرے پدر بزرگوار کو بطور خلیفہ، وصی اور جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور کیا یہ نہیں فرمایا تھا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ اور حاضرین پر واجب ہے کہ وہ نائبین کو اطلاع دیں اور یہ بتاؤ کہ کیا پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آخری خطبے میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر اور قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوں گے اور یہ بتاؤ کیا پیغمبرؐ خدا نے نہیں فرمایا تھا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن علیؑ سے عداوت رکھتا ہے۔ وہ شخص میرے ساتھ دعوئ محبت میں جھوٹا ہے اور حاضرین میں سے ایک فرد نے پیغمبر خداؐ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کیسے لازم آتا ہے کہ جو آپ سے محبت رکھتا ہو وہ علیؑ سے بھی محبت رکھے تو رسول اللہؐ نے فرمایا اس وجہ

سے یہ امر لازم ہے کہ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ یعنی یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص کسی کے سر سے محبت رکھتا ہو اور بدن سے عداوت رکھتا ہو تو یہ محبت کامل نہیں ہے کیونکہ میں اور علیؑ ایک نہ جدا ہونے والا نکتہ ہے۔ اس لئے جو مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے جب علیؑ سے دشمنی کرے تو وہ دشمنی درحقیقت مجھ سے ہے اور علیؑ سے محبت کرے وہ محبت درحقیقت مجھ سے ہے۔ پھر فرمایا کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ حق اور سچ ہے تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا: آپ نے جو کچھ فرمایا وہ حق و حقیقت اور صدق و صداقت پر مبنی ہے۔ پس اس بات کو سنتے ہوئے حاضرین مجلس یہ عہد کرتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے کہ حضرت امام حسینؑ کے فرمودات کو لوگوں تک پہنچائی۔ اس کے بعد لوگ متفرق ہو گئے۔" (کتاب سلیم بن قیس ہلالی کوفی، از ص 206 تا ص 209)

امام حسینؑ کے وقت ایک ایسا سیاسی نظام مستحکم ہو رہا تھا جس کی بنیاد جبر و استبداد پر رکھی جا رہی تھی۔ امام حسینؑ کو اپنے زمانے میں معاشرتی زبوں حالی، منافقت اور ریاکاری جیسے عوامل کا سامنا بھی تھا۔ ان جیسے حالات کے پیش نظر حساس شعراء نے اپنے اپنے عہد کے معاشروں پر ناقدانہ تبصرے کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مثال کے طور پر حافظ شیرازی متوفی 793 ہجری نے اپنے عہد کی تصویر کشی کرتے ہوئے وقت کی عدالت میں ایک موثر قلمی احتجاج درج کرایا ہے۔ ویسے تو ساری غزل مرصع ہے لیکن یہاں تبرکاً دو شعر قاری محترم کی نذر کرتا ہوں۔ حافظ فرماتے ہیں:

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

ابلہاں راہمہ شربت زگلاب و قندست
قوت دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

یعنی (1) یہ کیا فتنہ وفساد ہے جو میں ہم عصر دور میں دیکھ رہا ہوں۔ سارا زمانہ مجھے اس فتنہ کی لپیٹ میں نظر آتا ہے۔ (2) بیوقوف اور نااہل لوگ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں جبکہ صاحب عقل خون جگر پی کر گزر اوقات کر رہے ہیں (3) اعلیٰ قسم کے گھوڑے کو بے رحمانہ طریقہ سے سواری کر کے زخمی کر دیا ہے یعنی اعلیٰ ظرف کے افراد ناکارہ بنا دیئے گئے ہیں جبکہ گدھوں کی گردنوں میں سونے کے ہار ڈال دیئے گئے ہیں۔

اگر حافظ شیرازی چھٹی دھائی ہجری میں زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ اس غزل میں درج جذبات کو مزید شدت کے ساتھ بیان کرتے۔

7- مکہ سے روانگی کے وقت

سید رضا علی موسوی نے کتاب کشف الغمہ کے حوالے سے امام کا وہ خطبہ بھی نقل کیا ہے جو آپ نے 60 ہجری اپنے حج کو عمرہ میں تبدیل کرنے کے بعد اہل مکہ کو دیا تھا۔ خطبہ کا عام فہم ترجمہ درج ذیل ہے۔

''حمد وثنا کا مستحق صرف خدا ہے جو کچھ خدا چاہے گا صرف وہی ہوگا تمام قوت اور طاقت خدا ہی کے پاس ہے۔ درود وسلام ہو محمدؐ پر۔ بنی آدم کی گردن میں موت اس طرح آویزاں ہے۔ جس طرح ایک جوان عورت کے گلے میں ہار آویزاں ہوتا ہے۔

''جس طرح یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے دیدار کا شوق تھا اسی طرح مجھے بھی اپنے بزرگوں کی ملاقات کا شوق ہے۔ میرے لئے ایک جگہ کو معین کر دیا گیا ہے لہٰذا میرے جسم کو اسی جگہ گرنا چاہیے اور مجھے اسی جگہ پہنچنا چاہیے گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ نواویس اور کربلا کے درمیان بیابان کے بھیڑیئے میرے جسم کے بند بند کو جدا کر رہے ہیں اور مجھ سے اپنے خالی پیٹ کو بھر رہے ہیں اور اپنی گرسنگی کو دور کر رہے ہیں۔

''جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اس سے فرار ممکن نہیں ہے خدا کی رضا ہم اہل بیتؑ کی رضا ہے ہم اس کی بلاؤں اور امتحانوں پر صبر کریں گے اور وہ ہمیں اس کا مکمل اجر عطا فرمائے گا۔

''رسولؐ خدا کا گوشت (قربت دار) ہر گز اس سے جدا نہیں ہوں گے اور یہ تمام کے

تمام بہشت بریں ئیں رسولؐ خدا کے اردگرد جمع ہوں گے، جس سے رسولؐ خدا کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ پس جو بھی ہم میں موجود ہے اوراپنی جان راہ خدامیں قربان کرنا چاہتا ہے اوراپنے خون کوفدا کرنا چاہتا ہےاوراس نے اپنے نفس کولقا اللہ کیلئے تیار کیا ہوا ہے اسے چاہیے کہ وہ ہمارے ساتھ کوچ کرے ہم انشاء اللہ کل صبح یہاں سے کوچ کریں گے (انشاء اللہ تعالیٰ)'' (نفس المہموم،ص100، کشف الغمہ ،ص184)

8-فرزدق سے گفتگو

مکہ سے نکلنے کے بعد آپ نے کوفہ کا رُخ کیا۔

''فرزدق بن غالب جواپنے زمانے کے نامور شعراء میں سے تھا راستہ میں امامؑ سے ملا اور دوران ملاقات کہنے لگا کہ اے فرزند رسولؐ آپ کس طرح اہل کوفہ پر اعتماد کررہے ہیں جبکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے چچازاد مسلم بن عقیل اوران کے ساتھیوں کوقتل کیا۔ یہ سن کرامام عالی مقام نے حضرت مسلم بن عقیل کیلئے بارگاہِ ایزدی میں طلب رحمت کی اور پھر فرمایا مسلم اللہ کی راہ پر چلا (جو) اور کچھ اس کے ذمہ تھا اس نے انجام دیا اور جو کچھ ہمارے ذمہ ہے وہ ابھی ہمیں انجام دینا ہے اس کے بعد امام عالی مقام نے یہ اشعار پڑھے۔

وَاِنْ تكُنِ الدُّنيا تُعدُّنفَسَةً
فَدارُ ثَوابِ اللّٰهِ أَعْلٰى وَأَنبَلُ

وَانْ تكُنِ الْأَبْدانُ لِلْمَوْتِ اُنْشِأَتْ
فَقَتْلُ امْرِءٍ بِالسَّيفِ فِىْ اللّٰهِ أفْضَلُ

وَاِنْ تكُنِ الْأَرْزاقُ قِسماً مُقَدَّرًا
فَقِلَّةُ حِرْصِ الْمَرْءِ فِىْ الْكَسْبِ أجْمَلُ

وَاِنْ تکُنِ الْأَمْوالُ لِلتَّرکِ جَمْعُها
فَما بالُ مَتْرُوکٍ بِهِ الْمَرْءُ یَبْخَلُ

1- اگر دُنیا اپنے ظاہری وجود کے اعتبار سے پر کشش اور دیدہ زیب ہے تو جان لو کہ آخرت اس سے بھی زیادہ دلفریب اور جاذب نظر ہے۔

2- اگر انسانی اجسام کی انتہا موت ہے پھر وہ موت بہتر ہے جو تلوار کے ساتھ اللہ کی راہ میں ہو۔

3- اگر رزق قضاوقدر کے فیصلوں کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے تو پھر انسان کیلئے بہتر یہ ہے کہ کسب میں کم حرص کرے۔

4- اگر اموال کا جمع کرنا درحقیقت اس کی ذات کیلئے نہیں ہوتا غیروں کیلئے ہوتا ہے تو پھر کیا بُری حالت ہے اس شخص کی جو اپنے مال میں بخل کرتا ہے۔ (کشف الغمہ، ص183 اور 184)

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ ایک عظیم نظریاتی انقلاب برپا کرنے والے نبی آخر زمان کو خود اپنی نبوت کے دور میں اور ان کے بعد ان کی تین پشتوں کو مسلسل ایک ہی خاندان کی شدید ترین دشمنی کا نشانہ بننا پڑا۔ میرے لئے یہ بھی باعث حیرت ہے کہ اسلامی تاریخ کے پہلے ستر برسوں میں نبی محترم کی اولاد کو قتل کرنے اور ان کی نعشوں کو بربریت کا نشانہ بنانے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان کے خاندان کے بچوں' خواتین اور واحد بیمار مرد وارث کو قیدی بنایا جائے اور پھر انہیں زنجیروں میں جکڑ کر ملک کے مختلف شہروں کی شاہراہوں پر سرکاری پہرے داروں کی حراست میں گھمایا جائے تا کہ عامۃ المسلمین پر ظاہر کیا جائے کہ محسن عظیمؐ کے خانوادے کا ان کے اپنے ملک میں یہ حشر ہو رہا ہے اور کسی فرد بشر کو اتنی جراُت نہ ہو کہ حاکم وقت سے اس رویہ کے بارے میں سوال کرنے کی جراُت بھی کر سکے۔ ریاستی سطح پر آل رسوؐل کی اس طرح تذلیل کرنے کا اخلاقی یا فقہی جواز کیا ہے؟ کیا رسوؐل نے فتح مکہ کے وقت ابوسفیان یا قریش مکہ کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک نہیں کیا تھا؟ کیا قرآنی اصول ھل جزاء الاحسان کی یہی تعبیر ہے؟ آل رسوؐل کی بے بسی اور مجبوری کی تشہیر ہی پر بات ختم نہیں

ہوتی۔ تیسری بات جو مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ آخری نبی کی گیارہ پشتوں کے سربراہوں کو یکے بعد دیگرے، بغیر کسی تعطل کے، طبعی موت نصیب نہ ہوئی۔ سیدہ فاطمہ زہرا جیسی بے مثل خاتون اپنے بابا محمد مصطفیٰؐ کے وصال کے چند ہفتوں بعد نوحہ کناں اس دنیا سے رخصت ہوئیں اور آج تک یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ حضور ختمی مرتبتؐ کی چہیتی بیٹی کا مدفن روضہ رسولؐ سے ملحق سیدہ کے اپنے حجرہ میں ہے یا جنت البقیع میں ہے۔ حضرت علی شہید ہوئے۔ ان کے دونوں صاحبزادے، حسنؑ اور حسینؑ جو اپنے اپنے دور میں ال رسولؐ اور ال ابو طالب کے سربراہ اور امام تھے، شہید ہوئے۔ یہ دونوں بھائی تاریخ اسلام کی وہ منفرد شخصیات ہیں جن کی پیدائش پر حضورؐ نہ صرف انتہائی خوش تھے بلکہ ان کی ولادت اور ان کے وجود پر ختمی مرتبت کو ناز تھا۔ انہی دونوں ہستیوں کو نوجوانان جنت کا سردار بھی کہا گیا۔ انہی سرداران نوجوانان جنت کی نسل میں گیارہویں امام حسن عسکری تک ہر امام اور اکثر امام زادوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، مقام شہادت پر فائز ہوئے اور حالت بہ ایں جارسید کہ ال رسولؐ کے بارہویں جانشین امام مہدی اپنے والد محترم کی نماز جنازہ کے بعد دنیا کی نظروں ہی سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی غیبت صغریٰ کا احوال تو مل جاتا ہے لیکن اس کے بعد تاریخ خاموش ہے۔ تاریخ کے اوراق میں امام مہدیؑ کے ارضی احوال کا تذکرہ ہی موجود نہیں۔ تاریخ صرف اس عقیدے کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ امام مہدی غائب ہیں، یا غیبت کبریٰ میں ہیں اور قرب قیامت ان کا ظہور ہو گا۔ مذہبی سطح پر امام مہدی کے تصور کی حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہونا بذات خود ایک اہم سوال ہے۔ یہ سوال اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ سوال کہ حضورؐ کی وفات اور نواسوں کی شہادت کا درمیانی عرصہ نصف صدی سال سے زیادہ نہیں۔

ہمارے ممدوح حضرت امام حسینؑ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کا شمار دنیا کی ان چند منتخب شخصیات میں ہوتا ہے جن کی پیدائش سے شہادت تک کے دورانیے پر جناب رسالت مآبؐ کی احادیث ہر مکتب فکر کی کتب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپ وہ ہستی ہیں جن کی شخصیت، حسب ونسب، کردار، مشن اور تعلیمات پر مختلف مذاہب وملت کے نمائندوں نے اپنے اپنے انداز میں سیر حاصل تبصرے کئے۔ دنیا بھر کے حریت پسند حسینؑ کو اپنا امام تصور

کرتے ہیں۔ تکریم آدم کے پرستار امام حسینؑ کو بطل حریت قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انبیاء کی صف سے باہر حسینؑ ابن علیؑ انسانی آزادی، حریت فکر اور تکریم آدم کی تحریکوں کے بابا آدم ہیں تو یہ بیان حقیقت سے دور نہیں ہوگا۔

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ خود رسوؐل پاک نے نومولود حسینؑ کے کان میں اذان کہی یعنی امام وہ ہستی قرار پائی جنہوں نے پیدا ہوتے ہی خود رسوؐل کی زبانی پہلا سبق ہی توحید و رسالت کا علم بلند کرنے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو حرز جان بنانے کا ملا۔

اللہ اکبر ' اللہ اکبر '

اشھد ان لا الہ الا اللہ

اشھد ان محمد رسول اللہ

حی الصلوٰۃ

حی الفلاح

حی علی خیر عمل

اللہ اکبر اللہ

لا الہ الا اللہ

اور امام حسینؑ نے ساری عمر اس تعلیم پر عمل کیا اور اللہ عز و جل کے حضور جان بھی اسی حالت میں پیش کی جب کہ آپ کربلا کے تپتے ہوئے ریگستان میں سجدہ ادا کر رہے تھے۔ اس لئے علامہ اقبال مرحوم نے امام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات ما نوشت

حسین ابھی بچے ہی تھے کہ دوش رسوؐل پر سوار ہوتے اور رسوؐل اپنے نواسے کے ہونٹوں اور دانتوں کے بوسے لیتے۔ ان ہونٹوں نے رسوؐل کے بوسوں کی اس طرح لاج رکھی کہ زندگی بھر زبان پر جھوٹ یا فریب کا گذر بھی نہ ہو سکا۔ الحسین منی وانا من الحسین: قول نبیؐ درست ہی تھا کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔

بخاری شریف میں ابن عمرؓ کی زبانی حضورؐ کے حوالے سے یہ قول درج ہے کہ حسن اور حسین دونوں میری خوشبو ہیں، جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور یہ کہ جس شخص نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض کیا اس نے مجھ سے بغض کیا یعنی حضورؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب ان بچوں سے لوگ بغض وعناد رکھیں گے لہٰذا دنیا پر واضح کر دیا جائے کہ ان سے دشمنی کرنا رسولؐ سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہوگا۔

ثعلبی نے سورہ الرحمٰن 27/55/19 والی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ "**مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لایبغیان**" یعنی "اس نے دو دریا جاری کر دیئے جو ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں" کی تفسیر کرتے ہوئے سفیان ثوری اور سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ بحرین سے مراد حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمۃ الزہرہ ہیں جبکہ برزخ سے مراد خود حضورؐ کی ذات اقدس ہے اور **لؤلؤ والمرجان** سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔

حضورؐ کی بعثت کئی پہلوؤں سے منفرد تھی۔ آپ نبی آخرالزمان تھے۔ آپ کی ذات اور تعلیمات پر ہی قدسی پیغام تمام اور مکمل ہوا۔ حضورؐ کی بعثت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ کے ساتھ ایک امت کی بھی بعثت ہوئی جسے **کنتم خیر امت اخرجت للناس تاخرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللّٰہ** (سورہ ال عمران 4/3/110) یعنی تم بہترین امت ہو جو بنی نوع انسان کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ تم نیک باتوں کی تاکید کرتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو۔ اس آیت پاک سے ایک اصول یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تبارک تعالیٰ کے پیغام نے قیامت تک جاری و ساری رہنا ہے اس طرح امت محمدیہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہنا ہے۔ اس طریقہ سے ہی لوگوں کو یاد دہانی ہوتی رہے گی کہ اسلام کا نظام جزا بھی نافذ کیا جائے۔

اس ضمن میں ہم ایک حدیث کا حوالہ بھی دیں گے۔

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین

یعنی اے رسولؐ آپ کو مبعوث کیا گیا ہے یعنی مقرر کیا گیا ہے کہ لوگوں کیلئے آسانیاں

پیدا کی جائیں نہ کہ لوگوں کیلئے مشکلات پیدا کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اس سے بھی یہی اصول برآمد ہوتا ہے کہ بعثت رسولؐ کا مقصد انسان کی فلاح اور بہتری ہے۔ اسی اصول کو سورہ رعد 13/3/17 میں بیان کر کے کہا گیا ہے کہ لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں ہی زمین میں قیام کرتی ہیں۔

جناب رسول پاکؐ کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ آپ خاتم النبیین بن کر آئے تھے اور یہ پہلو سب انبیاء سے منفرد ہے یعنی آپ کے بعد نہ تو نئی شریعت نازل ہونا تھی، نہ ہی موجودہ شریعت کو منسوخ ہوتا تھا اور نہ ہی کسی نئے نبی یا رسولؐ نے مبعوث ہونا تھا لہٰذا جو بھی شریعت ہم تک پہنچی اس کا نفاذ اور اس کا تحفظ امت مسلمہ کی ذمہ داری تھی۔ آخری نبی کی آخری شریعت ایک ایسا فکری ورثہ ہے جس کی حفاظت مسلمان امت کی مشترکہ لیکن اہم ترین ذمہ داری تھی اگرچہ قرآن میں درج وحی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اسی وجہ سے ہی اللہ تبارک تعالیٰ نے امت محمدیہ کو بڑی برکت والی امت کہا ہے کہ اس نے ایک بڑی عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے کا عہد کیا ہوا ہے اور بہترین ورثہ کی محافظ بہترین امت ہی کہلائے گی۔

اسی حقیقت کا دوسرا گوشہ امت مسلمہ کی ذمہ داری کی شکل میں نظر آتا ہے یعنی حضورؐ کی امت کا فرض ہے کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ جل جلالہٗ کے پیغام کو نافذ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ چونکہ امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے لہٰذا اس ذمہ داری کو ریاستی سطح پر نافذ ہونا چاہیے۔ دلیل وہی ہے کہ اب نہ تو کسی نبی نے آنا ہے اور نہ ہی نئی امت تشکیل دی جاسکتی ہے۔ بنابراں امت مسلمہ والی ذمہ داری کسی اور جگہ منتقل بھی نہیں ہو سکے گی۔

مدینہ اور دمشق دو مختلف رویوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ دمشق نے ملوکیت کے ادارے کو جنم دیا اور اسے مستحکم کیا اور اسی شہر سے اسلامی ریاست میں اپنے ہی بیٹے کو ولی عہد نامزد کرنے کی رسم جاری ہوئی۔ دمشق میں دربار بنا اور دربار کے ساتھ نوکر شاہی اور درباری طبقہ کے وجود نے بھی نئے نظام میں قدم جمائے جبکہ اس کے مقابلہ میں امام حسینؓ کے وقت

کے مدینہ میں بوریا نشین بستے تھے اور جس کی گلیوں سے قال اللہ وقال رسول اللہ کی صدائیں گونجتی تھیں۔ مدینہ اسلامی تحریک کی روایات کا امین تھا جبکہ دمشق میں سیاسی اقتدار کو خاندانی ورثہ میں تبدیل کرنے کی حکمت عملی جاری تھی۔

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری کتاب حماسہ حسینی کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں کہ ابو سفیان نے حضرت عثمانؓ کے گھر میں کہا تھا کہ اے بنو امیہ! ملک ہے سلطنت ہے۔ حق' معنویت' جنت' جہنم سب جھوٹ ہے۔ اس گیند کو اپنے میدان سے خارج نہ ہونے دینا۔ ایک دوسرے کے پاس دے دو اور اسے اپنے بیٹوں کیلئے موروثی قرار دیدو۔

عرب کے نامور سیاستدان مغیرہ ابن شعبہ، عمرو ابن عاص اور زیاد ابن ابیہ دمشق کے حاکم امیر معاویہؓ ابن ابی سفیان کی حکومت کو مضبوط کرنے کیلئے مقرر کیۓ گئے تھے جبکہ مدینہ میں تعلیم و تعلم کا ماحول تھا۔ جو لوگ دمشق میں آباد ہوئے ان میں یزید بن ابوسفیانؓ اور ان کے بھائی ابوعبدالرحمٰن اور معاویہؓ بن ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ان احباب کو نہ تو ہجرت کا شرف حاصل ہوا تھا اور نہ ہی ابوسفیان کے بیٹے انصار گروہ میں شامل تھے۔ یہ دونوں بھائی عکرمہ بن ابوجہل کی طرح فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ دونوں بھائی یکے بعد دیگرے دمشق کے حاکم مقرر ہوئے۔ پہلے یزید بن ابوسفیان کی تقرری حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہوئی اور طاعون کی وبا میں یزید بن ابوسفیان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے معاویہ بن عثمان کو دمشق کا حاکم مقرر کیا جو 18 ہجری سے 60 ہجری تک حکومت پر قائم رہا۔ اس دوران حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ نے حضرت علیؑ کی خلافت کو تسلیم نہ کیا اور شہادت امیر المومنین کے بعد صلح امام حسنؑ کے نتیجہ میں خود خلیفہ بنے اور رفتہ رفتہ 54 ہجری میں اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا کر ابوسفیان کا خواب پورا کر دیا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے باوجود امام حسین کوئی عملی قدم اٹھاتے دکھائی نہیں دیتے۔ حالانکہ امیر معاویہؓ کی طرف سے معاہدہ کی متعدد خلاف ورزیاں ہو چکی تھیں۔ عہد نامے کے مطابق امیرؓ معاویہ کو اپنی زندگی کے دوران مسلم ریاست کی سربراہی کا حق حاصل تھا لیکن امیرؓ معاویہ کی زندگی کے بعد خلافت کا سوال امت مسلمہ کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ امام حسینؑ

کی شہادت کے بعد امیرؓ معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے مسئلے کو ریاست کا سوال نمبر ایک بنا دیا تاکہ امیرؓ معاویہ اپنی زندگی ہی میں خلافت کو آل ابوسفیان کیلئے محفوظ کر دیں۔ دوسری طرف امت کے مفادات تھے جن کے تحفظ کی ذمہ داری اہل بیت رسولؐ پر تھی اور اس وقت آل رسولؐ میں سے امام حسینؑ ہی اس خانوادہ کے امیر اور امام تھے۔ بنابراں آپ کی طرف سے امیرؓ معاویہ کی سیاست پر نظر رکھنا امام کی بنیادی ذمہ داری تھی اور اس ذمہ داری کی ادائیگی ہر پہلو سے قابل فہم امر ہے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا درست ہے کہ موجود زمینی حقائق اور نئے سیاسی رجحانات کے پیش نظر مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرنا حسینی تحریک کا حصہ تھا۔ حسینؑ بدلتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں کیونکہ آپ ال رسولؐ کے ممتاز ترین افراد میں سے ہیں اور اولاد علیؑ کے سردار بھی ہیں۔ مدینہ میں موجود صحابہ اور تابعین آپ کو یا ابن رسول اللہؐ کے لقب سے خطاب کرتے ہیں لیکن حکومت کے اہلکار آپ کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ امام حسنؑ کے شہادت اور پھر یزید کی ولی عہدی کے بعد ہیئت حاکمہ کے پاس امام حسینؑ کی کڑی نگرانی کے علاوہ اور چارہ بھی تو نہیں کیونکہ امام کا مدینہ میں امیر معاویہ کی حکومت کے باوجود اپنا خصوصی مقام ہے اور انہوں نے کوئی سرکاری عہدہ قبول کر کے اپنی حیثیت اور اپنے مقام کا سودا نہیں کیا تھا۔

امام حسینؑ دیکھ رہے ہیں کہ زکات کا مال، خمس، جہاد، بیت المال اور منبر یرغمال بن چکے ہیں۔ خلافت نے پہلے امارت کا لبادہ اوڑھا اور اب وہ ملوکیت کا جامہ پہن رہی ہے۔ وسیع علاقہ دارالسلام کی بجائے سلطنت کی مانند ذاتی ملکیت بن چکا ہے۔ ال ابوسفیان نے ایرانی شہنشاہیت اور رومی طرز جہاں بانی کا اتباع کرتے ہوئے بدعتوں کو اس انداز اور طمطراق سے پروان چڑھایا کہ شہریوں سے حکام کے رشتے ناطے ٹوٹے اور ہیئت حاکمہ پر قیصر و کسریٰ کے انداز مسلط ہوئے۔ بنی امیہ نے جاہلیت کے تکبر، غرور اور کینہ پروری کو سیاسی اقتدار کے استحکام کا ضروری جزو بنا دیا۔ حکمرانی کیلئے یہ اصول قائم ہوا کہ اصل ہدف اپنے مفادات کا تحفظ ہے جنہیں ہر قیمت پر حاصل کیا جانا ہے چاہے اس راستے کو اپنانے کیلئے دینی اور اخلاقی اقدار بھی قربان کرنا پڑیں۔

ایک وقت تھا جب کہ خلفاء راشدین کی نظر میں اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات والا صفات ہی طاقت کا سرچشمہ تھی اور اقتدار اعلیٰ کا سزاوار بھی وہی قادر مطلق تھا جو مالک الملک اور عزیز الجبار بھی تھا لیکن اب معیار یکسر بدل گئے تھے۔ اللہ رسولؐ اور اسلامی شعائر کو عزیز رکھنے والی نسل ختم ہو رہی تھی۔ مہاجرین اور انصار کی اکثریت ابدی نیند سو چکی تھی۔ السابقون الاولون ڈھونڈے سے بھی نہ ملتے تھے۔ عشرہ مبشرہ صرف روایات میں موجود تھے۔ اہل بیتؑ کا کنبہ سمٹ گیا تھا۔ حجر بن عدی جیسے احباب ریاستی جبر کے سامنے دم توڑ چکے تھے۔

ویسے تو حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد ہی ضد انقلاب قوتوں نے بغاوت برپا کر دی تھی۔ مکہ اور مدینہ کے علاوہ اکثر آبادیوں میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خلیفہ اول کو مانعین زکوٰۃ اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے ساتھ جنگیں لڑنا پڑیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں کے دوران نظریاتی بنیادوں میں کمزوری واقع ہو گئی۔ حضرت علیؑ کی شہادت تک حالات زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ فتنہ وفساد نے سر اٹھا لیا تھا اور بعض طبقات نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور حکومت کے کاروبار میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ تین خلفاء یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ مسلمان مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔ ایک عجیب نفسیاتی الجھن اور فکری تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔

امام حسنؑ کی زندگی میں مسئلہ زیر غور یہ تھا کہ کیا بنوسفیان یعنی بنوامیہ سے جنگ کرنا صحیح ہے؟ اہل بیت کے ارکان نے تسلسل کے ساتھ کسی حاکم' خلیفہ یا امیر کے خلاف خروج کیا نہ ہی اعلان جنگ کیا تھا۔ صاحبان اقتدار بھی جانتے تھے کہ اگر اہلبیت کرام جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تو حاکم بھی ان کے ساتھ مناسب حد تک تعلقات رکھتے تھے لیکن امام حسنؑ کی دستبرداری کے بعد یہ سوال شدت اختیار کر گیا تھا کہ حاکم شام نے حضرت علیؑ کی خلافت کو تسلیم نہ کر کے جس طرز عمل کو پروان چڑھایا اور جس طرح خلافت راشدہ کے طرز حکمرانی سے انحراف ہوا تھا کیا اس کا مداوا نہ ہونا چاہیے؟ کیا مسلم امت عذاب کا شکار رہے؟ کیا حضرت علی کو ریاستی حکم کے تحت ہر مسجد سے گالیاں بکی جائیں؟ کیا علی یا اہل بیت کی محبت جرم قرار دے دی جائے؟ کیا احادیث رسولؐ کی اشاعت کیلئے حکومت بنوامیہ خاموشی اختیار

کیئے رکھے؟ کیا مقاصد کے حصول کیلئے کوشش نہ کی جائے۔ کیا لوگ مسلم ریاست کے شہری ہونے کے باوجود غیر محفوظ رہیں؟

امام حسنؑ نے اجتہاد کو بروئے کار لا کر امت کی بہتری کیلئے ایک فیصلہ دستبرداری کی شکل میں کر دیا تھا لیکن دوسری جانب سے معاہدہ کی خلافت ورزیاں بھرپور طریقہ سے ہوئیں۔ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد حالات مزید خراب ہو چکے تھے اور اہل خبر کے سامنے یہ سوال تھا کہ عدل اجتماعی' امر بالمعروف' نہی عن المنکر کی اسلامی روایت کی تجدید کیسے کی جائے؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہم تھا کہ جبر کے سامنے ڈٹ جانے کی بجائے گوشہ نشینی' خاموشی کی روایت جنم لے چکی تھی۔ لہٰذا اہم سوال یہ تھا کہ الہامی منشور کو معاشرتی سطح پر نافذ کرنے کی تحریک کس طرح کی جائے۔

ان حالات میں امام حسینؑ جیسی شخصیت کا کیا ردعمل ہونا چاہیے۔ ان کا پس منظر' فکر مصطفوی کی وراثت' تربیت اور احساس ذمہ داری نے ان کے انتخاب کے حق کو محدود کر دیا تھا۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا جو نظریہ ضرورت سے ماوراء تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جو نبی' رسولؐ اور امام کی شان کے شایاں ہوتا ہے یعنی لاتلبسو الحق بالباطل۔ حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ۔ ان احباب کی تعلیم کا بنیادی عنصر ایک ہی شعار تھا جو سورہ فاتحہ کی آخری تین آیات میں درج ہے:

ایاک نعبد و ایاک نستعین
اھدنا الصطراط المستقیم
صراط الذین انعمت علیھم
غیر المغضوب علیھم و لا الضالین

اور یہ وہ راستہ ہے جس کی یاددہانی ہر روز ہر نماز میں بار بار ہوتی رہتی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کا اینٹ اور پتھر نظریاتی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس راستہ کو اپنانے کیلئے کسی مددگار' اسلحہ' دولت' ساز و سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ راستہ طے بھی اکیلے کرنا ہوتا ہے۔ حسینؑ نے بھی اسی راستہ کا انتخاب کیا۔ کٹھن ترین راستہ اختیار کر کے انبیاء کی سنت کا

احیاء کر دیا اور اس طرح حسینؑ نہ صرف ذبح عظیم کا فدیہ بنا بلکہ رسولوں اور نبیوں کا فخر بنا اور رہتی دنیا تک آزادی کے متوالوں کیلئے مینارہ نور بن گیا۔

حسینؑ کے سامنے سورہ نساء کا حکم بھی تھا5/4/69:

اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی رسولؐ کی فرمانبرداری کرے' وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔ یہ بہترین رفیق ہیں۔

بخاری شریف میں درج حدیث مبارک میں وارد ہوتا ہے: **المرء مع من احب** یعنی آدمی آخرت میں انہی کے ساتھ ہوگا جن سے ان کو محبت ہوگی۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ اس قول کو سن کر صحابہ کو جتنی خوشی ہوئی اتنی کسی اور قول سے نہ ہوئی کیونکہ اس حدیث کی روشنی میں انہیں جنت اور اعلیٰ قسم کی رفاقت کی وعید حاصل ہوئی تھی۔

حسینؑ پر یہ بات واضح تھی کہ ان کے قیام کے نتیجہ میں عسکری فتح ممکن نہیں ہے۔ انہیں تو احتجاج رقم کرنا تھا۔ زندگی کے نئے گوشوں سے مخلوق خدا کو متعارف کرانا تھا۔ انہیں بتانا تھا کہ ظلم و جبر کو برداشت کرنا غلط بات ہے اور برائی کی مدد کرنے والا برائی سے زیادہ برا بن جاتا ہے۔ قرآن پاک کے سورہ القصص 20/28/17 میں سیدنا موسیٰ ہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> کہنے لگے اے میرے رب! جیسے تو نے مجھ پر یہ کرم فرمایا ہے اب آئندہ سے میں کبھی بھی کسی گنہ گار کا مددگار نہ بنوں گا۔

یعنی قرآن نے اس اصول کی تعلیم دی ہے کہ کسی صورت بھی بُرائی کی معاونت نہیں کرنی۔ حسینؑ نے یہ بتانا تھا کہ جب سب راستے مسدود ہو جائیں تو پھر فدا کاری کا جذبہ آزمانا چاہئے۔ وفا شعاری اور قربانی کی عظیم روایت کو اپنے پاک خون سے' اس خون سے جو سیدنا ابراہیمؑ سے چلتا ہوا حضرت محمدؐ رسول اللہ کی رگوں میں رواں تھا' اس خون سے سیراب کرتے ہوئے آنے والی نسلوں کیلئے قیمتی ورثہ کی شکل میں سپرد کرنا تھا تاکہ زندگی کے طویل سفر میں ایک اور روشن نظیر کا اضافہ ہو جائے اور لوگ جان لیں کہ اس انداز کا کام اور اس

انداز سے رضائے الٰہی کو حاصل کرنا بھی ممکن ہے اور اسی طرز عمل میں ہی زندگی ہے۔

امام کے سامنے قرآن کی ایک بنیادی تعلیم تھی جس کا ذکر سورہ ال عمران 03/03/79 میں اس طرح ہوا ہے:

کسی ایسے انسان کو جسے اللہ تبارک تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت دے، یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری محکومیت اختیار کرلو...... بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب کتاب پڑھ کر اور کتاب سیکھ کر رب کے بندے یعنی ربانی بن جاؤ۔

اس اصول کے پیش نظر مخلوق خدا کو اپنا تابع فرمان اور محکوم بنانے کا سوال ہی شرک کے مترادف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رب العزت نے انسان کو آزاد اور خود مختار بنا کر واجب التکریم کر دیا ہوا ہے۔ کائنات بنانے والا بھی رب العرش العظیم ہے اور بندے بھی سارے اسی کے ہیں لہٰذا مساوات کے اس اصول کو توڑنے والا دراصل اللہ کے اختیارات کو چیلنج کرتا ہے۔ ملوکیت کے نمائندہ فرعون نے اعلان کیا تھا کہ وہ رب ہے۔ ہر دور کے بادشاہ اسی سوچ ہی کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ بات امام حسینؑ کو معلوم تھی کہ سیدنا موسیٰؑ کو باغی فرعون کی طرف جانے کا حکم ملا تھا اور سیدنا موسیٰؑ نے دعا کی تھی: سورہ طٰہٰ 16/20/23-25

اے میرے پروردگار! میرا سینہ میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو مجھ پر آسان کردے، اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے تاکہ میری بات کو لوگ سمجھ سکیں اور میرے اہل میں سے مجھے ایک وزیر دے یعنی میرے بھائی ہارون کو اور تو اس طرح میری کمر مضبوط کردے اور اسے میرا شریک کار بنادے۔

حسینؑ کو اس حدیث کا علم تھا کہ حضورؐ نے علیؑ کو سیدنا موسیٰؑ کی نسبت سے ہارون کہا تھا اور حسینؑ اسی علیؑ کا فرزند تھا۔ لہٰذا کار رسالت کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری حسینؑ پر بھی تھی کیونکہ رسولؐ نے برسوں پہلے اعلان کردیا تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

حسینؑ کی تحریک میں تبلیغ کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ جس گھرانے میں حسینؑ نے

تربیت حاصل کی تھی اس گھرانے کا امتیازی نشان تبلیغ کا عمل تھا۔سیدنا ابراہیمؑ کی اولاد میں یہ وصف اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بدرجہ اتم موجود تھا۔تبلیغ کا مطلب اپنے قول وعمل سے اس نظریہ سے لوگوں کو متعارف کرانا ہے جو آپ کی فکر کی اساس ہے۔لفظ تبلیغ کا مادہ ب۔ل۔غ ہے جس کا مطلب کسی مقام تک پہنچنا یعنی مقصد کی آخری حد تک پہنچنا چاہے وہ حد امکانی ہو یا زمانی یا اندازہ کی ہوئی ہو۔البلاغ کا مطلب اتنا کافی ہونا کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے مقصد تک پہنچ جائے اور اسے کسی سامان کی ضرورت نہ رہے۔اسی لئے کنوئیں میں ڈول لٹکانے والی رسی کو تبلغ کہتے ہیں۔لہٰذا تبلیغ کا مقصد ذاتی استعداد میں کمی کو پورا کرنا ہوتا ہے۔قرآن پاک نے خود کو سورہ ابراہیم کی آخری آیت 13/14/52 میں بلاغ للناس کہا ہے کیونکہ یہ صحیفہ ایک ایسا اطلاع نامہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوق خدا کو باخبر کر دیا گیا ہے کہ انسان کی اپنی حدود وقیود کیا ہیں جبکہ احسن الخالقین کا مقام کیا ہے۔اسی آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ اس بات پر اچھی طرح غور کریں کہ اللہ ہی واحد معبود ہے۔اس پس منظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابلاغ ہی وہ عنصر ہے جو جاہلیت اور علم وعرفان کے ادوار کے درمیان حد فاصل ہے۔ابلاغ کا عنصر کئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے مثلاً تبیان' کتاب' قلم' تعلیم وتعلم' قانون' حکمت' مکالمہ' مساوات وعدم امتیاز' حریت فکر' تدبیر منزل' تحقیق وجستجو' صبرو استقامت تفقہ فی الدین' عدل' تعقل' تفکر' تذکر' تشکر اور اجتہاد جیسے راستوں سے ابلاغ کا ظہور ہوتا ہے۔تبلیغ ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے لیس ہو کر ہر نبی اور رسوؐل میدان عمل میں آتے ہیں۔اسی تبلیغ کے عنصر کی وجہ سے نبی نہ صرف ایمان' علم وعرفان ویقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے بلکہ بہترین اخلاق کا مظاہرہ کر کے' بہترین طرز عمل اختیار کرتے ہوئے خلوص نیت اور نہایت ہمدردی' شفقت اور مدلل لہجے میں عجز وانکساری کے ساتھ اپنا موقف نہایت تسلسل کے ساتھ لوگوں تک پہنچاتا ہے اور خود اپنی زندگی کو ہر لحظہ اس معیار پر پورا اتار کر لوگوں کے تدبر اور تجزیہ کیلئے پیش کرتا ہے۔ایسا کرتے ہوئے اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ ہی رنج وملال کا شکار ہوتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے وہ ہمہ وقت تیار بھی رہتا ہے۔شہادت' شجاعت اور استقلال ان کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔یہ تمام باتیں ہمیں قرآن

میں درج انبیاء و رسل کی روداد میں مل جاتی ہے۔ اسی تبلیغ کے عمل سے ہی لوگوں میں فکری انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔

رسولؐ اللہ کے فکری وارث اور قرآن و سنت کے گہرے طالبعلم کی حیثیت میں امام حسینؑ پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر تھی کہ سابقہ امتوں کی تباہی کی بنیادی وجوہات میں حقائق کا چھپانا' احکام میں ردو بدل کرنا اور اس قسم کے دوسرے عوامل تھے جنہیں ہم تحریف' اخفا' کتمان اور تبدیلیوں کے عناوین سے یاد کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ 01/02/159,174 میں درج ہے کہ:

''جو لوگ ہماری نازل کردہ دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کیلئے بیان کر چکے ہیں' ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔ (آیت 159)

''بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اُتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں' یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا' نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (آیت 174)

سورہ بقرہ ہی کی دو اور آیات قابل غور ہیں:

''اور حق کے ساتھ باطل کو خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ' تمہیں تو خود اس کا علم ہے۔ آیت 42 ''مسلمانو! کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایماندار بن جائیں' حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر' عقل و علم والے ہوتے ہوئے' پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں۔ (آیت 75)

اسی بات کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیات 03/03/71,187 سے بھی ہو جاتی ہے۔

''اے اہل کتاب! باوجود جاننے کے حق و باطل کو کیوں خلط ملط کر رہے ہو اور کیوں حق کو چھپا رہے ہو۔ (آیت :71)

''اور اللہ تبارک تعالیٰ نے جب اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اسے
سب لوگوں سے ضرور بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں، تو پھر بھی ان
لوگوں نے اس عہد کو اپنی پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اسے بہت کم قیمت پر بیچ
ڈالا۔ ان کا یہ بیوپار بہت برا ہے۔ (آیت 187)

سورہ ال عمران کی 03/03/19 میں فرمان باری تعالیٰ ہے کہ بے شک اللہ کے نزدیک دینِ اسلام ہی ہے اور اہل کتاب نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد آپس کی سرکشی اور حسد کی بنا پر ہی اختلاف کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ جو بھی کفر کرے اللہ تعالیٰ اس کا جلد حساب لینے والا ہے۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان حدود شکن گروہوں کا ذکر بھی کیا ہے جو اللہ تبارک تعالیٰ کے نظام سے بغاوت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ معاشرہ کے صاحب ثروت لوگ پیغام الٰہی کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ قوم نوح کے دولت مند لوگ ہی مجرم تھے جنہیں سورہ الاعراف 08/07/60 میں الملا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ رسولؐ اللہ کی مخالفت بھی اسی طبقہ نے کی تھی۔ سورہ الزخرف 25/43/31,32، اس حقیقت پر گواہ ہیں۔ گواہ ہے کہ قریش یہ کہتے تھے کہ اگر نبوت ملنا تھی تو مکہ یا طائف کے رؤسا کو ملتی یعنی قریش اللہ تبارک تعالیٰ کی وحی کو طبقات و اقتصادیات کے تابع کرنا چاہتے تھے۔ یہ اصول قرآن ہی نے بیان کیا ہے کہ ہر عہد میں اہل ثروت اور سرداران قوم جرائم کرتے رہے اور عوام ان کا اتباع کرتے تھے اور اس طرح قومیں تباہ ہوتی رہیں۔ سورہ ہود 12/11/116-118 کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''پس کیوں نہ تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ایسے اہل خیر
لوگ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے، سوائے ان چند کے
جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی۔ ظالم لوگ تو اس چیز کے پیچھے پڑ
گئے ہیں جس میں انہیں آسودگی دی گئی تھی اور وہ گنہگار تھے۔ آپ کا رب ایسا

نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے لوگ نیکوکار رہوں۔ اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا۔ وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے۔

اس پس منظر میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حالات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس وقت دانشور طبقے کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے اولی الامر پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب سورہ نساء 5/4/59 کے حوالے سے واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسولؐ کی اور تم میں سے صاحبان امر کی۔ پھر اگر کسی چیز میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے لوٹاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسولؐ کی طرف اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

اس ضمن میں قرآن پاک نے ایک اور اصول کی طرف اپنے قاری کو متوجہ کیا ہے یعنی سچی گواہی دینے اور اس پر قائم رہنے، سچی بات کو نہ چھپانا اور دشمنی کی صورت میں بھی انصاف پر قائم رہنے کا حکم۔ ملاحظہ ہو 05/04/135، 06/05/08، 03/03/41

قرآن پاک نے ایک اور ہدایت کی ہے۔ سورہ توبہ 11/09/119 و سورہ الزمر 24/33/39 میں راست باز لوگوں کا ساتھ دینے کا حکم ہے اور سورہ المائدہ 6/5/2 میں واضح طور پر حکم قطعی موجود ہے:

اور دیکھو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ وظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا کا عذاب سخت ہے۔

اور اسی سورہ المائدہ کی 33 ویں آیت میں حکم ہے:

جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی

چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

سورہ مجادلہ 28/58/05 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل کئے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل کئے گئے تھے اور ہم نے صاف اور صریح آیات نازل کر دی ہیں جو نہیں مانتے ان کو ذلت کا عذاب ہوگا۔

امام حسینؑ ایک مثالی صابر گھرانے کے فرزند تھے۔ بنو امیہ نے رسولؐ پاک کے منبر سے حضرت علیؑ کو سب و شتم کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اس طویل دورانیہ میں صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز وہ واحد مکرم شخصیت تھی جنہوں نے خطبے میں حضرت علیؑ کو گالیاں بکنے کی رسم توڑ کر قرآن پاک کی اس آیت کا اضافہ کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ عدل' احسان اور قرابت داروں کے حقوق کے تحفظ کا حکم دیتا ہے اور فحش اور برائی اور ظلم سے روکتا ہے کہ شاید تم سمجھو۔ (سورہ النحل 14/16/90) آل رسولؐ سے بنو امیہ نے یہ سلوک اس لئے کیا کہ حضرت علیؑ کی تلوار نے قریش قبیلہ کے بہادروں کو جو حضورؐ کے خلاف جنگ میں نکلے تھے' ہر بار موت کے گھاٹ اتارا۔ قریش کے اکثر رؤسا فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے جن میں ابو سفیان اور امیر معاویہ بھی شامل تھے۔ نہج البلاغۃ کی شرح' اشاعت چہارم سال 1976ء میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ:

امیر معاویہؓ کے عہد میں علیؑ کو گالیاں بکنے کی بدعت منبر' مساجد پر شروع ہوئی' اور جب تک بنو امیہ تباہ و برباد نہ ہو گئے (ایک مختصر سے وقفہ عہد عمر بن عبدالعزیز کے سوا) یہ رسم جاری رہی۔ جن لوگوں کے بارے میں اربابِ حکومت کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شیعیان' (دوستداران) علیؑ میں سے ہیں ان پر (خواہ وہ صحابی ہوں یا تابعی یا عامہ مسلمین ہوں) طرح طرح کی سختیاں کی جاتی تھیں' انہیں کوڑوں سے پیٹا جاتا تھا' ان کے حقوق ضبط کر لیے

جاتے اور بالآخر ان کی جان لے لی جاتی تھی' اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری یا رحم و رعایت کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مساجد میں برسرعام عین نماز کے وقت خطبہ کے اختتام پر پیش نماز جہاں ملوک بنی امیہ کے لیے درازیٔ عمر و اقبال کی دعائیں مانگتا تھا' وہاں علیؑ پر تبرا بھیجتا تھا۔ دشنام طرازی کرتا تھا' لعن طعن کرتا تھا اور کسی میں حوصلہ نہ تھا (باستثناء خاص) کہ اُٹھتا' ٹوکتا اور اس سلسلہ کو بند کروانے کی کوشش کرتا، یہ سب کچھ اس لیے ہوتا تھا کہ حکومت کی دہشت سے زبانیں بند ہو جائیں۔ دماغ سوچنا ترک کر دیں' حضرت علیؑ اور حضرات اہل بیت اطہار کی محبت' جو دلوں کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے نکل جائے' تلواروں کے پہرے' سنگینوں کے جلوے' کوڑوں کی نمائش' سیم و زر کی رشوت......ان سب کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا' کہ لوگ بنو امیہ کی حکومت کو برحق سمجھ لیں' اور اسے فراموش کر دیں کہ یہ حکومت حق پر نہیں' باطل پر قائم ہے۔ ایسے پروپیگنڈا کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نئی نسل پیدا ہو جاتی ہے جسے بچپن سے ایسی چیزیں بتائی جاتی ہیں جو بالآخر ملوکیت یا باطل نظام کے حق میں جاتی ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ تاریخ مسخ کر دی جاتی ہے اور مکروہات کو مبدوب و مباح بنا کر اعلیٰ اقدار کی بیخ کنی کر دی جاتی ہے۔

جعفری لکھتے ہیں کہ حجر بن عدی کو اس لئے قتل کیا گیا تھا کہ وہ حضرت علیؑ کو گالیاں نکالنے کی رسم کے خلاف شدید احتجاج کرتا تھا۔ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے صدمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو انہیں حجر بن عدیؓ جیسے بزرگ صحابی کے قتل پر پہنچا تھا۔ جعفری یہ بھی لکھتے ہیں کہ عہد بنو امیہ اور بعد میں عہد بنو عباس میں وہ تمام لوگ کسی نہ کسی طرح موت کے گھاٹ اتارے گئے جو یا تو خاندان رسالت سے تعلق رکھتے تھے یا حُبِ آل محمدؐ سے مخمور و سرشار تھے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کے خلاف کبھی تلوار نکلی اور کبھی انہیں زہر پلا دیا گیا لیکن آل محمدؐ سے محبت ظاہر کرنے کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ امام شافعی نے اپنے شعر میں اس سوال کا قطعی جواب دیدیا: فرماتے ہیں۔

ان کان رفضاحب آل محمد فلیشهد الثقلان ان رافض

یعنی اگر محمدؐ کی آل کی محبت رفض ہے تو کائنات گواہ رہے کہ میں رافضی ہوں۔

دنیا گواہ ہے کہ ال محمدؐ نے بنوامیہ کی اس سب وشتم کا جواب صبر سے دیا اور حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت میں اسی بابت پیشین گوئی بھی کی تھی۔ نہج البلاغۃ کے خطبہ 56 میں لکھا ہے کہ:

''یہ شخص عنقریب تمہیں حکم دے گا کہ مجھے گالیاں نکالو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ اگر تم سب کرنے پر مجبور ہو جاؤ تو دشنام دے لینا' اس لئے کہ وہ سب وشتم میرے لئے زکوٰۃ اور تمہارے لئے پریشانی سے چھٹکارا ہے لیکن مجھ پر تبرا نہ کرنا یعنی براٗت کا اظہار نہ کرنا کیونکہ میں فطرتِ اسلام پر پیدا ہوا ہوں اور ایمان وہجرت میں پیش قدمی کی ہے۔

صفین کی جنگ (صفر 37 ہجری) کے وقت امام حسینؑ 32 سالہ جوان مجاہد تھے۔ یہی فرات کا دریا تھا جہاں امام علیؑ کی افواج پر امیر معاویہ کی افواج نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی پانی بند کر دیا تھا۔ اس وقت سیدنا علیؑ نے اپنی فوج کے ایک دستہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اے میرے سپاہیو' میں یہ نہیں کہتا کہ تم جاؤ اور لڑو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ جاؤ اور ان دو طریقوں میں سے ایک کا انتخاب کرو: یا ذلت اختیار کر لو کہ وہ پانی بند کر دیں اور تم دیکھتے رہو یا یہ کہ تم اپنی ان تلواروں کی پیاس ان نامعقولوں کے خون سے بجھاؤ تا کہ تم خود بھی سیراب ہوسکو۔ پھر آپ نے یہ تاریخی فقرہ فرمایا:

فالموت فی حیاتکم مقھورین و الحیاۃ فی موتکم قاھرین

(یعنی) زندگی یہ ہے کہ تم مر جاؤ لیکن باوقار اور باعزت رہو اور مرنا یہ ہے کہ تم زندہ رہو لیکن سر پر دھولیں کھاتے رہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو گھنٹوں کے اندر فرات کے گھاٹ سے دشمن میلوں دور بھاگ گیا اور پیاس سے بے تاب ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے بہر حال حکم دیا کہ دشمن کو روزانہ گھاٹ پر آ کر پانی حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔

حسینؑ کی تربیت اس نہج پر ہوئی تھی کہ حالت جنگ میں بھی اعلیٰ انسانی اقدار کا احترام مومن پر لازم ہے لیکن آپ کے مدمقابل کا شعار یہ تھا کہ جنگ میں ہر حربہ استعمال کرو تا کہ اپنے مقاصد فوراً حاصل کر لئے جائیں چاہے ارفع اقدار کو قربان ہی کرنا پڑے۔

حسینؑ کے اس طرز عمل کا ایک مقدس پس منظر تھا۔ آپ کو اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت لگاؤ تھا۔ امام آغوش رسالت کے پروردہ تھے اور ان کی کوشش ہوتی کہ رسولؐ کی سیرت آپ کی رہنمائی کرتی رہے۔ کتاب ''احیائے دین میں آئمہ کا کردار'' علامہ محقق سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب نقش آئمہ در احیاء دین جلد اول کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مترجم محمد فضل حق ہیں جسے مجمع علمی اسلامی نے شائع کیا۔ یہ کتاب میں نے 3 جون 2001 کو نیویارک سے حاصل کی تھی۔ اس کتاب کے صفحات 428 سے 432 تک امام حسینؑ کے سوال پر امیر المومنین کا سیرت رسولؐ کے بارے میں بیان درج ہے۔ اسے قارئین کرام کی نذر کر رہا ہوں۔

''امام حسینؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے والد بزرگوار سے درخواست کی کہ مجھے رسولِ اکرمؐ کی سیرت اور آنحضرتؐ کے گھر میں اور گھر سے باہر اور مجلس میں طرز عمل کے بارے میں بتائیں۔

''میرے والد نے فرمایا: رسول اکرمؐ نے گھر میں اپنا وقت تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ خدا کے لیے' دوسرا حصہ خود آنحضرتؐ کے لیے تھا اور تیسرا حصہ خاندان کے لیے تھا اور جو حصہ آپ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا وہ بھی لوگوں کے اختیار میں دے دیا تھا اور اس میں خاص اور عام لوگوں کے کام سرانجام دیتے تھے۔ جب ہم گھر میں ہوتے تھے تو حاجت مندوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے تھے اور کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ جو صاحبانِ فضیلت حاجتمند ہوتے تھے اور ایک یا دو یا زیادہ حاجتیں رکھتے تھے ان سے ملاقات ان کی فضیلت کے اندازے اور حاجت کی مقدار کے مطابق مقدم رکھتے تھے اور انہیں اس کام کی ترغیب دیتے تھے جس میں امت کی اور خود ان کی بہتری ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں سے ان کا حال پوچھتے اور انہیں جن چیزوں کا سزاوار سمجھتے ان سے انہیں آگاہ کرتے تھے۔ آپ یہ کام حاضرین کے سپرد کرتے تھے (کہ جو معارفِ اسلامی تم نے مجھ سے سیکھے ہیں) وہ ان تک پہنچا دو جو موجود نہیں ہیں اور اسی طرح ضرورتمندوں کی ضروریات کے بارے میں مجھے اطلاع دو۔ بلاشبہ جو شخص کسی ضرورت مند کی ضرورت کے

بارے میں حاکم کو مطلع کرتا ہے آخرت میں خدا اسے پل صراط پر ثابت قدم رکھے گا اور ڈگمگانے نہیں دے گا۔

''لوگ آنحضرتؐ سے ملاقات کے لیے آتے اور اپنے دین و دنیا کے امور کے بارے میں معرفت حاصل کر کے آپ کے پاس سے چلے جاتے تھے۔ بلاشبہ اس قسم کی باتوں کے علاوہ اور کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ آپ کسی کو کچھ اور کہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ امام حسینؑ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا کہ گھر سے باہر رسول اکرمؐ کا طرز عمل کیا تھا؟'' میرے والد بزرگوار نے فرمایا: آپ ضرورت کے مطابق بات کرتے تھے اور خاموش ہو جاتے تھے' سوائے ان کاموں کے بارے میں جن میں آپ لوگوں کے دلوں کو متحد کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ آپ سے اور خود اپنے آپ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نہ نکلیں۔ آپ ہر قوم کے معزز شخص کی عزت کرتے تھے اور انہیں ان لوگوں کا سردار بنا دیتے تھے۔ آپ لوگوں کو فتنوں سے خبردار کرتے تھے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی اور خوش خوئی سے پیش آتے ہوئے ان کے درمیان رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان سے الگ بھی رہتے تھے۔ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے تھے اور لوگوں سے عوام کے حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔

''آنحضرتؐ اچھائی کی تعریف کرتے تھے۔ آپ میانہ رو تھے اور آپ کے عمل کا معیار دوہرا نہ تھا۔ آپ کے کاموں میں کوئی بے قاعدگی نہ تھی۔ نیک لوگ آپ کے قریب ہوتے تھے اور ان میں سے سب سے بلند مقام اس کا ہوتا تھا جو لوگوں کا سب سے زیادہ خیرخواہ ہوتا تھا۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ اس شخص کا ہوتا تھا جو سب سے زیادہ لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

''آپ نے مزید فرمایا: جب میں نے رسولِ اکرمؐ کی مجلس کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو میرے والد بزرگوار نے فرمایا کہ: آنحضرتؐ خدا کو یاد کیے بغیر نہ اٹھتے تھے نہ بیٹھتے تھے۔ آپ کے بیٹھنے کے لیے کوئی خاص جگہ مخصوص نہ تھی اور آپ دوسروں کو بھی اپنے لیے بیٹھنے کی جگہ مخصوص کرنے سے منع فرماتے تھے۔ آپ جس مجلس میں بھی تشریف لاتے تھے۔

اس جگہ بیٹھتے تھے۔ جہاں تک بیٹھنے والوں کا دائرہ بن چکا ہوتا تھا اور دوسروں کو حکم دیتے تھے کہ مجلس میں اس طرح بیٹھیں۔ آپ تمام اہل مجلس کی جانب توجہ دیتے تھے تاکہ کسی کے ساتھ امتیازی سلوک کا گمان نہ ہو۔

''اگر کوئی شخص کسی حاجت کے لیے آنحضرتؐ کے پاس بیٹھتا تھا تو آپ اس وقت تک صبر فرماتے تھے جب تک وہ خود نہیں چلا جاتا تھا۔

جب کسی شخص کی ضرورت کسی وجہ سے پوری نہیں ہو سکتی تھی تو آپ اپنی خوش مزاجی اور میٹھی باتوں سے اسے خوش کر دیتے تھے۔ آپ امت کے مہربان باپ تھے۔ چنانچہ حق کے معاملے میں سبھی آپ کے سامنے برابر تھے۔

رسول اکرمؐ کی مجلس، بردباری، شرم، صبر اور امانتداری کی محفل ہوتی تھی۔ وہاں بڑوں کی عزت کی جاتی تھی اور چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ ہوتا تھا۔ آپ کی مجلس میں بے ادبی اور اونچی آواز میں گفتگو نہیں کی جاتی تھی۔ وہاں کھلم کھلا لغزشیں نہیں ہوتی تھیں۔

''آپ کے تمام ہم نشیں برابر اور ہم رتبہ تھے۔ برتری کا واحد معیار پرہیزگاری اور فروتنی تھا۔ تاہم آپ حاجتمندوں کو اپنے آپ پر مقدم رکھتے تھے اور مسافروں پر مہربانی فرماتے تھے۔

امام حسینؑ مزید فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد بزرگوار سے پوچھا کہ رسولِ اکرمؐ اپنے اہل مجلس سے کیسا برتاؤ کرتے تھے؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

''آنحضرت لوگوں کے ساتھ میل جول میں خوش طبیعت اور نرم خو تھے۔ بدزبانی، عیب جوئی اور ستائش آپ کی فطرت میں نہ تھی۔ اگر کوئی چیز آپ کو پسند نہ ہوتی تو آپ دوسرا کام کرنے لگتے۔ اگر کوئی شخص آرزو لیکر آپ کے پاس آتا تو ناامید ہو کر واپس نہ جاتا۔

''آپ نے اپنے آپ میں تین چیزیں ترک کر دی تھیں یعنی لڑائی جھگڑا، باتونی پن اور ہر وہ چیز جس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس طرح لوگوں کے ساتھ بھی آپ نے تین چیزیں ترک کر دی تھیں یعنی مذمت، سرزنش اور لوگوں کی عیب جوئی۔

''آپ بجز اس امر کے بارے میں جس میں خدا کی مرضی شامل ہوتی تھی، کوئی بات

نہیں کرتے تھے۔آپ کے صحابہ آپ کی مجلس میں خاموش رہتے تھے اور اس وقت بات کرتے تھے جب آپ اپنی بات ختم کر لیتے تھے۔

''آپ کی مجلس میں صحابہ ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو یا بحث مباحثہ نہیں کرتے تھے اور جو شخص کچھ کہہ رہا ہوتا تھا اس کی بات ختم ہونے تک اسے توجہ سے سنتے تھے۔ہنسی، خوشی، حیرت اور دوسرے معاملات میں آپ حاضرین مجلس کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔

''آپ غیروں کی بدتمیزی اور کج خلقی برداشت کر لیتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ صحابہ غیروں کو آپ کی مجلس میں لاتے تھے تاکہ وہ آپ سے سوال کریں۔

''آپ اپنے صحابہ سے فرماتے تھے کہ جب وہ کسی حاجتمند کو دیکھیں تو اس کی مدد کریں۔اس کے میزبان بنیں اور اس کی ضرورت پوری کریں۔

''آپ تعریف پسند نہیں فرماتے تھے سوائے اس صورت کے کہ وہ حق شناسی اور شکر گزاری پر مبنی ہو۔آپ کسی کی قطع کلامی نہیں کرتے تھے سوائے اس کے کہ وہ اپنی حد سے بڑھ جائے۔اس صورت میں آپ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے تاکہ اس شخص کی بات ادھوری رہ جائے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب میں نے رسول اکرمؐ کی خاموشی کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد بزرگوار نے فرمایا کہ آنحضرتؐ کی خاموشی کی چار قسمیں اور وجوہات تھیں: (1) حلم اور بردباری کی خاطر (2) فساد سے، خوف کی خاطر۔(3) اپنے مخصوص طریقے کے مطابق اور خاموشی سے سننے کی خاطر (4) سوچ بچار کی خاطر۔

''آپ کے صبر اور بردباری کا یہ عالم تھا کہ کوئی چیز آپ کو خشمگیں نہیں کرتی تھی اور آپ آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے۔

آپ کا خوف مندرجہ ذیل چار چیزوں کی خاطر تھا:

1- آپ ہر کام میں اچھی چیز کو اختیار کرتے تھے تاکہ دوسرے آپ کی پیروی کریں۔

2- آپ برائی کو ترک فرماتے تھے تاکہ دوسرے بھی اس برائی سے پرہیز کریں۔

3- آپ ان چیزوں کے لیے کوشش فرماتے تھے جن سے امت کی اصلاح ہوسکتی ہو یا

جن میں لوگوں کے دین و دنیا کی بھلائی ہو۔

4- آپ کا اپنے طرز عمل میں سکوت اسی انداز سے تھا جس طرح آپ لوگوں کی باتیں یکساں توجہ سے سنتے تھے اور سوچ بچار میں آپ کا سکوت اس بارے میں تھا کہ دنیا و مافیہا اور اس کے معاملات میں کونسی چیز باقی رہنے والی ہے اور کونسی فنا ہونے والی ہے۔

''رسول اکرمؐ کے اخلاق کے بارے میں امیر المومنین علی علیہ السلام نے مندرجہ ذیل چیزیں روایت فرمائی ہیں:

1- یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے اپنے ہم نشین کے سامنے اپنے پاؤں پھیلائے ہوں۔

2- جب کبھی آپ پر ظلم ہوا (چونکہ آپ رحمت اللعالمین تھے) آپ نے اس کے خلاف کبھی قیام نہیں فرمایا۔ تاہم آپ کسی حرام فعل کے مقابلے میں چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ قیام نہیں فرماتے تھے بجز اس کے کہ آپ کا غصہ اور قیام خدا کی راہ پر ہوتا تھا۔

3- کھانا کھاتے وقت آپ کبھی کسی چیز سے ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ آپ سے کبھی کوئی حاجت پوری کرنے کے لیے نہیں کہا گیا جس کا جواب آپ نے نفی میں دیا ہو۔

4- آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ قطعی ہوتا تھا اور ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سننے والا پریشانی محسوس کرے اور جو کوئی آپ کے ارشادات سنتا انہیں سمجھ لیتا تھا۔

''رسول اکرمؐ فرمایا کرتے تھے: تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کی عادتیں سب سے اچھی ہوں۔

''پھر امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے کسی کو آنحضرتؐ جیسا نہیں پایا۔

''علاوہ ازیں خود رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں مزاح (ہنسی مذاق) کرتا ہوں لیکن سچی بات کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔''

''ابن عباس نے رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے پروردگار

نے تربیت دی ہے۔خدا نے مجھے سخاوت اور نیکی کا حکم دیا ہےاور بخل اور جفا (ترشی روبی اور بدخوئی) سے منع فرمایا ہے۔خدا کے نزدیک کوئی چیز بخل اور بدخوئی سے زیادہ بری نہیں ہے بدخوئی عمل کواسی طرح خراب کردیتی ہے جیسے سرکہ شہد کوخراب کردیتا ہے۔''

یہ چند صفحات ہم نے بطور نمونہ پیش کئے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ امام حسینؑ کی تربیت کن خطوط پر ہوئی تھی اور آپ کو زندگی میں کون سی باتیں مرغوب تھیں۔امام حسینؑ اپنے جد امجدؐ کے اخلاق، اطوار، رہن سہن اور گفتگو تک کے طریقوں کو جاننے کیلئے طویل سوال کیا کرتے تھے۔امام حسینؑ ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ انہیں اپنے کردار کواس ماڈل کے مطابق بنانا ہے جواللہ کی دھرتی پر سب سے بہتر مخلوق اور مقام محمود پر فائز تھا۔کیونکہ حضورؐ کا فرمان تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے لہٰذا حسینؑ کوایک رول ماڈل کی حیثیت اختیار کرنا تھی تاکہ اگر کوئی شخص سیرتِ رسول کا عملی نمونہ دیکھنا چاہے تو اس حدیث کی روشنی میں امام حسینؑ کی زندگی، تعلیمات، اقوال، اطوار اور اعمال کی پیروی کرلے۔

ایک طرف یہ عالم ہے تو دوسری طرف ال ابوسفیان کا لشکر جاہلیت کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے۔قرآن نے سورہ البقرہ 02/02/190 میں جنگ کے متعلق لاتعتدوا یعنی جہاد کرتے وقت بھی زیادتی نہ کرنے کا حکم دیا ہے لیکن یوم عاشور شمر نے امام مظلوم کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کرنے کیلئے امام کے اہل حرم کے خیام پر حملہ شروع کروادیا۔اس وقت امام نےایک مختصر لیکن نہایت بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا:

> اے خاندان ابوسفیان کے پیروکارو! اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہےاور قیامت کا بھی تمہیں کوئی خوف نہیں تو کم ازکم اس دنیا میں آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرو اور اگر خود کو عرب سمجھتے ہو تو اپنے اجداد کے رواج کے طریقوں ہی کا پاس رکھو (یعنی جنگ کرنے والوں سے لڑو اور عورتوں پر حملہ نہ کرو)

اس پکار پر شمر تڑپا اور کہنے لگا اے حسینؑ کیا کہہ رہے ہو۔امام نے جواب میں کہا کہ:

> میں تم سے لڑرہا ہوں۔تمہاری جنگ میرے ساتھ ہے۔ان عورتوں

کو اس میں کوئی تقصیر نہیں ہے۔ اپنے تیر اندازوں اور سرکشوں سے کہو کہ جب تک میں زندہ ہوں میرے اہل خانہ پر حملہ آور نہ ہوں۔

اس جواب پر شمر نے اپنے لشکر کو خواتین کے خیام پر حملہ کرنے سے روکا۔

امام نے اس مختصر سے خطبہ میں اسلام کے ابدی اصول اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو زندہ رکھنے اور دشمن کو پیغام دینے کی کوشش کی کہ مقبول رواج اور قانون کا احترام میدان جنگ میں بھی ضروری ہے۔ اگر چہ وقتی طور پر شمر کے لشکری خواتین کے خیموں سے دور ہو گئے لیکن امام کی شہادت کے بعد ان درندوں نے آل رسولؐ کی حرمت کا کوئی پاس نہ رکھا۔ کربلا کے میدان میں بھی ہم کو دو رویے نظر آ رہے ہیں ایک طرف مدینہ کا کلچر ہے اور دوسری طرف شام کے دربار کا دستور جس کی بنیاد جاہلیت پر رکھی ہوئی تھی۔

زیارت امام حسینؑ پڑھتے وقت ہم اقرار کرتے ہیں۔ **اشھدانک قد اقمت الصلوہ واتیت الزکوۃ وامرت بالمعروف ونھیت عن المنکر وجاھدت فی اللہ حق جھادہ**۔ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ (اے امام حسینؑ) آپ نے نماز قائم کی' زکات ادا کی' نیک باتوں (اور کاموں کا) حکم دیا (تلقین کی) اور برے کاموں (برائیوں کے سرزد ہونے سے) منع کیا۔ ہر مومن امام کی زندگی' ان کے کارناموں اور تعلیمات کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آپ نے ان تمام فرائض کو بخیر و خوبی سرانجام دیا جن کی ادائیگی کی ذمہ داری آپ پر عاید ہوتی تھی۔

امام حسین کی زندگی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ سورہ القلم 29/68/10-13 میں مومنین کو تاکید ہے کہ بھلائی کے کاموں سے روکنے والے اور حد سے بڑھنے والوں کی اطاعت نہیں کرنی۔ سورہ الحج 17/22/41 میں گروہ مومنین کو خطاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جب اللہ تبارک تعالیٰ زمین کے کسی ٹکڑے پر مومنین کی جماعت کے قدم جما دیتا ہے تو یہ پوری پابندی سے نظام صلوٰت وزکوٰۃ قائم کرتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی نیک کام کرنے اور برے کاموں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتے ہیں اور بے شک سارے کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس ضمن میں سورہ محمد 26/47/22 بھی پیش نظر رہنی چاہیے جہاں اللہ تبارک تعالیٰ مومنین کو آگاہ کرتے ہیں کہ ایسے نہ ہو جانا کہ جب تمہیں حکومت مل جائے تو زمین میں فساد برپا کرو اور رشتے ناطے توڑ دو۔ اس آیت سے پہلے 21ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ صحیح روش فرمان کا بجالانا اور اچھی بات کے کہنے کرنے میں ہے۔ اسی حوالے سے منکر کے متعلق بھی قرآن پاک کے احکام کو دیکھ لیں۔ سورہ نور 18/24/21 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اے ایمان والو! شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔ جو شخص شیطانی قدموں کی پیروی کرے تو وہ بے حیائی اور برے کاموں کا ہی حکم کرے گا۔

لفظ منکر کا مطلب ناپسندیدہ یا ناپسندیدگی بھی ہوتا ہے۔ سورہ الحج 17/22/72 میں لکھا ہے کہ جب اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے تو کفار کے چہرے پر (منکر) ناپسندیدگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سورہ المجادلہ 28/58/02 میں بیوی کو ظہار کرتے ہوئے ماں کہہ بیٹھنے والے عمل کو منکر یعنی نامعقول' ناپسندیدہ اور جھوٹ کہا گیا ہے۔ لفظ منکر کے معانی کے تعین کیلئے سورہ لقمان 19-21/31/18 بھی دیکھی جاسکتی ہے جہاں تکبر اور شیخی خورے کو برا کہا گیا ہے اور میانہ روی اختیار کرنے اور اپنی آواز کو پست کرنے کی تاکید ہے اور مثال کے طور پر کہا گیا ہے کہ انکر الاصوات یعنی بدتر آواز گدھوں کی آواز ہے۔

قرآن پاک نے اہل کتاب کے حوالے سے سورہ البقرہ 44-01/02/41 میں حق و باطل کو خلط ملط کرنے' آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچ دینے سے منع فرمایا اور نماز و زکوٰۃ اور لوگوں کو نیکی کے کام کرنے کی تلقین کی ہے۔ سورہ المائدہ 06/05/63 میں اہل کتاب کے علماء کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ یہ طبقہ لوگوں کو جھوٹ کہنے اور حرام چیزوں کے استعمال سے منع کیوں نہیں کرتا۔ اسی سورہ مبارکہ کی آیت 79 میں اہل کتاب ہی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے اور قرآن پاک کی مخصوص اصطلاح امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں امر بالمعروف کا عام فہم مفہوم یہی ہوگا کہ وہ کام جنہیں شرعی معاشرہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے یا وہ کام جو احکام الٰہی کو آگے بڑھاتے ہیں اور نہی عن المنکر ایسے وہ تمام کام یا امور ہونگے جو قرآنی

تعلیمات سے متصادم ہوں اور قرآنی معاشرہ میں قابل قبول نہ ہوں۔ لغات القرآن کے مطابق معروف سے مراد وہ تمام امور ہونگے جنہیں ایک صحیح قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم کرے اور منکرات میں وہ تمام باتیں یا امور شامل ہونگے جنہیں قرآنی معاشرہ صحیح تسلیم نہ کرے۔ اس اصطلاح میں قرآنی احکام کے علاوہ وہ ضابطے' قوانین اور معاشرتی رسوم و آداب بھی شامل ہونگے جنہیں ایسا متدین معاشرہ رائج و نافذ کرتا ہے۔ ایسے کاموں کی مثال ہمیں مدینہ کے معاشرہ میں ملیں گی جو حضورؐ کی زیر نگرانی تشکیل پا رہا تھا کیونکہ آپ اپنے اصحاب کرام کو اچھے کاموں اور ناپسندیدہ کاموں سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل امت مسلمہ کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں سورہ ال عمران 04/03/110 ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم (اے مسلمانو) بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک کاموں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ اس آیت میں امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ حکم ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ اس میں استمرار کا پہلو ہے۔ خیر امت کہنے کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ (1) یہ کہ تم اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ (2) نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور (3) برے کاموں سے روکتے ہو۔ یعنی اگر یہ امت ان تینوں کاموں کو جاری رکھے گی تو خیر امت کہلانے کی حقدار رہے گی۔ یہ کام دراصل کسوٹی قرار پا چکے ہیں۔ امام حسینؓ کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ آپ امت محمدی کے رکن ہونے کے علاوہ اہل بیت رسولؐ کا پانچواں فرد ہونے کا منفرد اعزاز حاصل تھا لہٰذا آپ پر اس فریضہ کی ادائیگی بدرجہ اتم لاگو ہوتی تھی۔

دراصل آیت نمبر 110 سے پہلے چھ آیات پڑھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مقام پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر نہ صرف قرآنی تعلیمات کا اعادہ ہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ انسان کی پیدائش اور فضیلت کا مقصد وحید ہی یہی رکن ہے۔ آیت نمبر 104 شروع ہی اسی اصول سے ہوتی ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے' نیک کاموں کی تعلیم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ نجات

پانے والے ہیں۔ ان آیات کے ساتھ آپ اگر سورہ الذاریات 27/51/56 کو ذہن میں لائیں جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت ہے۔ عبادت کیا ہے؟ شارع کے احکام کا اتباع۔ لہٰذا ان سب آیات کو ملا کر پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا اور انہیں برے انجام سے بچانا عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ حاکم اور عوام کو انسان دوست اعمال و افعال بجالانے کی تعلیم دینا بھی عبادت ہے۔ بخاری شریف کی ایک حدیث کے مطابق خیر الناس کا مطلب خیر الناس للناس ہے یعنی تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی بہتری اور انسانیت کی نجات کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں امر، نہی، معروف اور منکر کے چار الفاظ پر غور و فکر سے سوچ کی کئی راہیں کھل جائیں گی کیونکہ قرآن پاک نے ان چار الفاظ کو کئی بار استعمال کیا ہے۔

اسی نکتے کو ایک اور خوبصورت طریقے سے سورہ التوبہ 11/09/111-112 میں بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں آیات کا مفہوم درج ذیل ہے:

> بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے۔ تو تم لوگ اپنے اس سودے پر خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (مومنین کی صفات بیان ہو رہی ہیں) وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، نیک کاموں کی تعلیم دینے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے (یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل کرنے والے) اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ خوش خبری سنا دیں۔

یہاں یہ خیال نہ کر لیا جائے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے صرف مردوں کی جنس ہی سے ان

کے اعمال کے بدلے جنت کا سودا کیا ہے۔ اسی سورہ کی آیت 71 '72 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ مومن مرد اور مومن عورت آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں' دوست ہیں جو کہ نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور مزید یہ کہ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ تبارک تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

سورہ الاعراف 181-09/07/180 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اچھے اچھے نام اللہ ہی کیلئے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے کیئے کی سزا ضرور ملے گی اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتی ہے اور اُس کے موافق انصاف بھی کرتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے قرآنی اصول کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ حسین ابن علیؑ و فاطمہ و نواسہ رسولؐ جیسی مقدس، پاک اور طاہر ہستی نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ امام نے عملی طور پر بتایا کہ یہ اصول اتنا وزنی اور نافذ العمل ہے کہ امام اور اس کے لواحقین اجتماعی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہم اس حقیقت کا اندازہ ایک اور پہلو سے بھی لگا سکتے ہیں۔ سورہ الرعد 13/13/11 میں اصول قائم کر دیا گیا ہے کہ ''اللہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود داخلی طور پر اپنے احوال کو درست کرنے کی کوشش نہ کرے۔''

قرآن نے امر بالمعروف کے اصول کو اتنی بار تاکید کی ہے اور اقوام کے عروج و زوال کے ساتھ منسلک کر کے اس ضابطے کو اتنی بار بیان کیا ہے کہ قرآن کے قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ باقی ارکان کی طرح اس رکن کو بھی اصولِ دین میں شمار ہوتا چکا ہے اگرچہ شیعہ سنی فقہ میں یہ رکن اصولِ دین شمار نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ تو معلوم نہیں لیکن ایک بات ضرور سمجھ آتی ہے کہ اس اصول کا خود احتسابی اور معاشرتی جانچ پڑتال کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ خصوصیت ایسی ہے جو ملوکیت' دربار اور نوکر شاہی اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اس اصول کو فقہ سے خارج رکھنا ہیئت حاکمہ کے

لئے مفید ہے۔

جہاں تک رسوؐل اللہ کے مشن کا تعلق تھا سورہ الاعراف 09/07/159 کا ذکر ہم نے دوبار کر دیا ہے۔اس آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم موجود ہے۔سورہ الانعام 07/06/70 میں حضوؐر کو تاکید ہے کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے جنہوں نے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔مزید حکم ہے کہ اس قرآن کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت ونصیحت کرتے رہیں تاکہ کوئی شخص اس لئے تباہ و برباد نہ ہو کہ اسے نصیحت نہیں پہنچی تھی۔سورہ الاعراف کی آیت 199 میں اسی بات کا اس طرح اعادہ ہوتا ہے کہ (اے رسوؐل) آپ درگذر کو اختیار کریں، نیک کاموں کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جائیں یعنی تعلیم دینے کے باوجود اگر وہ کہا نہ مانیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

امام حسینؑ کے ذہن میں اپنے ناناؐ کی تعلیم نقش تھی: بشرّا ولا تنذّرا، لیسّرا ولا تُعسِّرا یعنی لوگوں کو خوش خبریاں دو اور انہیں ڈراؤ دھمکاؤ مت۔آسانیاں پیدا کرو اور مشکلات مت پیدا کرو۔صحیح مسلم میں حدیث ہے بشرا ولیسّرِا وعلّما ولا تنفرا یعنی بشارت دو، آسانیاں پیدا کرو، علم کو عام کرو اور نفرت نہ پیدا ہونے دو۔آپ اندازہ لگائیں کہ حضوؐر کی تعلیم کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے حاکم اللہ کی مخلوق کے ساتھ فیاضی کا سلوک کریں نہ کہ انہیں غلام بنالیں اور ان کا سیاسی و اقتصادی استیصال شروع کر دیں۔یہ روایت اس وقت کی ہے کہ جب حضرت ابوموسوی اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ وفد کی شکل میں روانہ ہونے لگے تو حضور نے وصیت فرمائی: خوش خبری دو اور آسانیاں پیدا کرو۔علم پھیلاؤ اور نفرت مت پھیلاؤ۔یہ ایسا انتظامی منشور ہے جسے ہر حاکم کو جلی حروف میں لکھ کر اپنے دفتر میں لگانا چاہیے۔

اس پس منظر میں جب ہم تحریک حسینی کے منشور کا جائزہ لیتے ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کو اتنی اہمیت کیوں دی تھی۔امام کو معلوم تھا کہ قرآن نے واضح طور پر فیصلہ صادر کر دیا ہے 06/05/78-79 کہ جو قومیں امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو چھوڑ دیتی ہیں وہ قومیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی لعنت کی مستحق ہو جاتی ہیں' تباہ ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ اس اصول کو ہر دم معاشرہ میں فعال رہنا تھا لیکن امام نے محسوس کیا کہ قرآن کے اس بنیادی حکم کو وقت کے حاکموں نے معطل کر دیا ہے۔ اس موضوع پر نہ بحث ہوتی ہے' نہ اس موضوع کو جمعہ وعیدین کے خطبات کا حصہ بنایا جاتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

آیت اللہ شہید مرتضی مطہری نے اپنی کتاب حماسہ حسینی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے دو احادیث کا ذکر کیا ہے۔ میں ان احادیث کو قارئین کرام کی نذر کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ روایت ہے کہ جب لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایک دوسرے پر ٹالتے رہیں گے (یعنی ہر شخص خاموش رہ کر یہ انتظار کرے کہ دوسرا شخص نیکی کا حکم لگائے گا اور بدی سے منع کرے گا اور یوں نتیجہ میں کوئی بھی کھڑا نہ ہو) تو پھر لوگوں کو اللہ کے عذاب کا منتظر اور اس کیلئے تیار بھی رہنا چاہئے۔ دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے رہو اور بدی سے منع کرتے رہو ورنہ اللہ تم پر بدوں کو مسلط کر دے گا پھر تمہارے نیک لوگ بھی (اللہ کے حضور دعا کر کے) بلاتے رہیں گے تو انہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔ امام غزالی نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا سے فریاد کرتے رہیں گے اور خدا ان کی دعا قبول نہیں کرے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اصول چھوڑنے والے اتنے حقیر و پست ہو جائیں گے کہ ان کا رعب' دبدبہ' عزت اور کرامت ختم ہو جائے گی چنانچہ جب وہ انہی ظالموں کے دربار میں جائیں گے تو جتنا زور لگالیں ان کی بات کوئی نہیں سنے گا یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری عزت قائم رہے اور لوگ تمہارے سامنے جوابدہ ہوں تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل احتساب کا دروازہ ہے۔ احتساب ذات کا اور احتساب اجتماعی کا بھی۔ حاکم اس عمل سے ڈرتا تھا کیونکہ اس کے سارے افعال و اعمال قرآن و سنت کی نفی تھے۔ اسلام وہ پہلا نظام ہے جس نے ہر زندہ' بالغ' عاقل' نظریاتی افراد

کو معاشرہ کے سامنے جوابدہ بنایا ہے۔ اسی اصول کے تحت حاکم وقت اور ہیئت حاکمہ کا ہر رکن جوابدہ ہے۔ یہ انقلابی تصور تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ متوازن بنیادوں پر قائم رہے اور حقوق بشری کی ہمہ وقت ضمانت مہیا ہوتی رہے۔ امام نے اس رکن کو اپنے منشور کا اس لئے بھی حصہ بنایا کہ آنے والی نسلوں کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ فقہ کی تدوین کے وقت صرف نماز پڑھنے' حج کرنے' روزہ رکھنے ہی کے طریقوں پر بحث نہ کی جائے بلکہ معاشرہ کی رہنمائی اور معاشرہ کو قرآنی بنیادوں پر (استوار کرنے کیلئے ہر فرد بشر کے ذہن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اصول موجود رہے۔

یزید کی بیعت کے مطالبہ کو رد کرنے کے بعد امام اپنے جد امجد محمد رسوؐل کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر دعا کرتے ہیں کہ اے باری تعالیٰ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے کا وقت آ گیا ہے۔ اس مقصد کیلئے اے اللہ تیری مدد کا طالب ہوں اور واسطہ دیتا ہوں تجھے تیرے رسوؐل کا کہ میرے حق میں اسی چیز کو منتخب فرمانا جو تجھے اور تیرے رسوؐل کو پسند ہو۔ اس پہلی دعا کے بعد یعنی رجب 60 ہجری سے محرم 61 ہجری تک آپ نے متعدد بار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو اپنے خطبات کا موضوع بنا کر لوگوں کو بھی اس واجب امر کی طرف متوجہ کیا۔ اگر آپ امام کے سابقہ خطبہ جو 58 ہجری کے حج کے موقع پر دیا گیا ہے' کا تجزیہ کریں تو اس میں بھی یہی عنصر نظر آئے گا۔ مدینہ چھوڑتے وقت بھی امام نے اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ کو اپنی تحریری وصیت میں اپنے مشن کے محرکات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو نمایاں حیثیت دی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی پابندی آل رسوؐل کا طرہ امتیاز تھا۔ آپ نہج البلاغۃ کو پڑھ لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس قرآنی اصطلاح نے کس حد تک امیر المومنین کو متاثر کیا تھا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے متعلق نہج البلاغۃ میں حضرت علیؑ کا قول درج ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ان میں سے کچھ لوگ منکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہاتھ سے' زبان سے

اور دل سے۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اچھے صفات میں کمال چاہا ہے'

اور ان میں وہ بھی ہیں جو زبان و دل سے تو اظہار ناپسندیدگی کرتے ہیں لیکن ہاتھ سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس نے دو صفتیں حاصل کر لیں اور ایک خصلت کو چھوڑ دیا'

وہ بھی ہیں جو دل سے نفرت کرتے ہیں لیکن زبان اور ہاتھ سے کچھ نہیں کرتے۔ انہوں نے تین میں سے دو بہترین خصلتیں چھوڑ دیں اور ایک کو اپنا لیا'

ایک ایسا شخص ہے جو منکر باتوں کو زبان' دل اور ہاتھ سے نہیں روکتا۔ یہ زندہ لاش ہے'

تمام نیک اعمال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے جنگ کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے سمندر میں چلو بھر پانی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر موت سے قریب اور روزی میں کمی نہیں کرتے (کہ اس ڈر سے اسے اپنا یا جائے) اور ''سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے کہی جائے'': وافضل من ذلک کلمۃ عدل عن امام الجابر۔

بحوالہ شرح نہج البلاغۃ سید مرتضیٰ حسین فاضل عبداللہ بن ابی لیلۃ الفقیہ نے حجاج بن اشعث سے لڑائی شروع ہونے سے قبل حضرت علیؑ کے خطاب کا ایک حصہ یوں بیان ہوا ہے:

مومنو! جو دیکھے کہ ظلم ہو رہا ہے اور منکر خداوندی کی دعوت دی جا رہی ہے اور اسے دل سے ناپسند کرے تو وہ محفوظ اور بری ہے اور جو زبان سے اظہار ناپسندیدگی کرے اسے عوض دیا جائے گا اور وہ اس سے اچھا ہے جس نے صرف دل سے انکار کیا اور جس نے تلوار سے اظہار ناپسندیدگی کیا تا کہ اللہ کا نام بلند ہو اور ظالم ذلیل ہوں تو ایسے شخص نے ہدایت کا رستہ پایا' صراط مستقیم پر بھی ٹھہرا اور دل کو یقین سے منور بھی کیا۔

اسی کتاب میں امر بالمعروف کے حوالے سے پیراگراف 367 میں حضرت علیؑ کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

اسی موضوع (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) پر حضرت فرماتے ہیں:

ان میں سے کچھ لوگ منکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہاتھ سے بھی، زبان و دل سے بھی، یہ وہ ہیں جنہوں نے اچھے صفات میں کمال چاہا ہے اور ان میں وہ بھی ہیں جو زبان و دل سے تو اظہار ناپسندیدگی کرتے ہیں لیکن ہاتھ سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس نے دو اچھی صفتیں حاصل کر لیں اور ایک خصلت سے ہاتھ دھولیا، وہ بھی ہیں جو دل سے نفرت کرتے ہیں لیکن زبان اور ہاتھ سے کچھ نہیں کرتے۔ انہوں نے تین میں سے دو بہترین خصلتیں چھوڑ دیں اور ایک کو اپنا لیا۔ ایک ایسا شخص ہے جو منکر باتوں کو زبان دل اور ہاتھ کسی سے نہیں روکتا۔ یہ زندہ لاش ہے۔ (یوں سمجھنا چاہیے کہ) تمام نیک اعمال امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے جنگ کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے سمندر میں کلی (چلو بھر پانی) اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر موت سے قریب اور روزی میں کمی نہیں کرتے (کہ اس ڈر سے اسے نہ اپنایا جائے)'' اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ حق بات ظالم بادشاہ کے سامنے کہی جائے۔''

میرے امام کے پیش نظر قرآن کا یہ اصول بھی تھا۔ سورہ الانفعال 09/08/24۔ کہ اے ایمان والو تم اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہا مانو۔ یہ رسولؐ تمہیں زندگی کی طرف بلاتے ہیں۔ یعنی اس لائحہ عمل اور منشور کی طرف جو قوموں کو زندہ کرتا ہے، انہیں تاریخی مقام اور منفرد تشخص عطا کرتا ہے اور انہیں بہترین امت کا لقب عطا کرتا ہے۔ آپؑ نے دراصل اپنے مشن میں اپنے ہم عصروں اور آنے والی نسلوں کو قرآن کی طرف متوجہ ہونے کا درس دیا ہے۔ امامؑ نے قیام کر کے احکام خداوندی کی زندگی میں فعالیت RELAVANCE کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ حسینؑ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس انجام سے بچ جائیں جو ان اقوام کا مقدر بنی جنہوں نے اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے پیغامبروں کو جھٹلایا اور

ان کی تعلیمات کوفراموش کر دیا۔

حسینؑ کی تحریک نے اسلام کے جسد میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس حقیقت کا احساس صدیوں سے امت مسلمہ کو ہو رہا ہے۔ اسی پس منظر میں شاعر نے کہا تھا:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

علامہ اقبال نے بھی اپنی اردو و فارسی شاعری میں دل کھول کر امام حسینؑ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ جسد اسلام میں ملوکیت نے زہر گھولنا شروع کیا لیکن حسینؑ کے بروقت اقدام نے اسلام کو نئی روح سے آشنا کر دیا۔

فقر عریاں گرمی بدر و حنین
فقر عریاں بانگ تکبیر حسین

یعنی بدر و حنین کے معرکوں کا نام فقر عریاں ہے اور دراصل فقر عریاں یعنی خالص، بے دھڑک اور کھرا فقر امام حسینؑ کی تکبیر ہی کا دوسرا نام ہے۔

تا کجا بے غیرت دیں زیستن
اے مسلماں مُردن است ایں زیستن

یعنی اے مسلماں! دین کی غیرت کے بغیر تو کب تک زندہ رہے گا، ایسی زندگی تو سراپا موت ہے۔

مرد حر از لا الہ روشن ضمیر
می نہ گردد بندہ سلطان و میر

یعنی مردان حر کی روشن ضمیری لا الہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ کسی بادشاہ یا رئیس کا غلام نہیں بنتا۔

پھر اقبال کہتا ہے:

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

یعنی حق کو دوبارہ زندگی حسینؑ کی قوت ہی سے ملی۔

آں اماں عاشقاں پور بتولؑ
سرو آزادے زبستانِ رسولؐ

یعنی حسینؑ عاشقان الٰہی کے امامؑ ہیں جو کہ فاطمۃ الزہرا کے فرزند ہیں اور باغ رسالت کے آزاد اور سربلند سرو ہیں۔

اقبال خلافت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چوں خلافت رشتہ از قراں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
برزمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

یعنی جب خلافت نے قرآن سے رشتہ توڑ لیا اور آزادی کے حلق میں زہر ٹپکا دیا تو حسینؑ اس صورتحال کو برداشت نہ کر سکے اور بادلوں کی طرح آگے بڑھے اور کربلا کی ریگزار پر فکر کی آزادی کی بارش برسا کر آگے چلے گئے۔ آپ نے اس طرح ظلم و جبر کا تا قیامت راستہ بند کر دیا اور ان کے خون کی موجوں سے دنیا آزادی کی بہار سے ہمکنار ہو گئی۔

اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

یعنی حسینؑ حق کی خاطر مٹی اور خون میں لوٹے اور اسی وجہ سے لا الہ کی بنیاد قرار پا گئے۔

سرخ رو عشق غیور از خونِ او
شوخی ایں مصرع از مضمون او

حسینؑ کے خون کا صدقہ ہے کہ عشق غیور اب سرخرو ہو گیا ہے۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

یعنی حسینؑ کا باپ ایسا ہے جیسے بسم اللہ میں ب کا مقام ہے اور خود حسینؑ قرآن کے اعلان ذبح عظیم کی زندہ تفسیر ہے۔

درمیان امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ھواللہ در کتاب

یعنی امت محمدیہ میں حسینؑ کی مثال ایسی منفرد اور بے مثل ہے جس طرح حرف قل ھواللہ قرآن پاک کی سینکڑوں آیات میں منفرد مقام کا حامل ہے۔

امر بالمعروف کی اہمیت کے متعلق گفتگو ہوئی اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ امام حسین نے مسلسل دو سال اس اصول کو جگہ جگہ بیان کیا۔ سب سے پہلے آپ نے 58 ہجری کی حج کانفرنس میں اس اصول کو اجاگر کیا اور اس کے بعد مختلف مواقع پر زبانی اور تحریری طور پر اپنے وصیت نامہ میں بھی اس اصول کا ذکر کیا تا کہ آنے والی نسلوں کو بھی تحریک حسینی کے عوامل کی آگاہی ہو سکے۔ بنابراں سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کے محرکات کیا تھے یعنی وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے امام حسینؑ کو اتنا شدید اور سخت ردعمل اپنانے پر مجبور کیا۔

عام طور پر مندرجہ ذیل امور کی طرف امام کی تحریک کے طالبعلم کا دھیان جاتا ہے۔

1- یہ کہ امام سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا اور اس مطالبہ کی شدت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ حکومت کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔

2- یہ کہ امیر معاویہ نے امام حسنؑ کے ساتھ صلح کی شرائط کی خلاف ورزی کی اور یزید کو ولی عہد مقرر کر کے حکومت کو موروثی خلافت میں تبدیل کرنا چاہا اور امام سے بیعت طلب کرنے کا مقصد اس آئینی بدعت وانحراف کیلئے شرعی جواز حاصل کرنا تھا۔

3- بیعت کے مطالبہ کے پیش نظر مدینہ چھوڑ کر مکہ میں قیام کرنے پر امام حسینؑ کا مکہ میں حج کے دوران قتل اور امام کو ایسے خاموش طریقہ سے قتل کہ یہ ایک عام حادثاتی قتل نظر آئے اور اس میں حکومت کی سازش شامل نہ تصور کی جائے اور امام کو باقاعدہ جنگ کرنے یا لوگوں کو اکٹھا کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

4- کوفہ سے موصول ہونے والے خطوط نے امام کے قیام کی راہ ہموار کی۔

5- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو قائم کرنا تھا۔

6- حلال کو نہ صرف حرام اور حرام کو حلال کیا جارہا تھا بلکہ خلافت کی کرسی پر بیٹھنے والا کھلم کھلا ممنوعات کا ارتکاب کر کے شعائر اسلام کا مذاق اڑا رہا تھا اور اس رجحان کا روکنا امام کا فریضہ تھا تاکہ اسلامی قانون کی بالادستی کم از کم ظاہری طور پر قائم ہو جائے۔

ان عوامل کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ امام حسینؑ کی تحریک کا اساسی محرک صرف اور صرف قرآن پاک کا وہ اصول تھا جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اصطلاح سے ظاہر ہو رہا ہے۔ قارئین کرام کے سامنے میں کچھ مزید دلائل بھی پیش کرتا ہوں تاکہ میرا محترم قاری اپنے طور پر ان نتائج کے حسن و قبح کا تجزیہ کر سکے۔

1- اگر یزید اپنے والد امیر معاویہ کی طرح سمجھداری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتا تو وہ امام سے بیعت کا مطالبہ نہ کرتا۔ کیا ایسی صورت میں امام حالات سے سمجھوتہ کر کے خاموش بیٹھ جاتے جس طرح ابن عمر نے بالآخر کیا اگرچہ ابن عمر نے بیعت بھی کر لی تھی۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر یزید خاموش بھی رہتا تب بھی امام حسینؑ قیام کرتے۔

2- اگر کوفہ والے خطوط نہ بھیجتے تو کیا امام حسینؑ قیام نہ کرتے؟ میرا جواب یہ ہے کہ کوفہ والوں نے امام کو مدینہ میں خطوط نہیں بھیجے تھے۔ جب امام مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ چلے گئے اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ امام نے یزید کی بیعت پر ہجرت کو ترجیح دی ہے تو اس کے بعد کوفہ والوں کو احساس ہوا کہ حسینی تحریک کا آغاز ہو چکا ہے لہٰذا انہوں نے اس تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے بوجوہ اپنا حصہ ڈالا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض خوارج نے خط اس لئے لکھے ہوں کہ مکہ سے کسی اور طرف جانے کی بجائے امام کا

رُخ کوفے کی طرف موڑا جائے تا کہ حسینؑ ابن علیؑ اور یزید ابن معاویہ کا ٹکراؤ یقینی ہو جائے اور اس طرح خوارج کے دونوں حریف گھاٹے میں رہیں۔

3- امام نے اندازہ کر لیا تھا کہ کوفہ میں بسنے والے شہریوں میں سے زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار افراد نے انہیں دعوت دی ہے کہ کوفہ میں آ کر تحریک کو تیز کریں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارا کوفہ ان کا حمایتی ہو گیا ہے اور ان کے ساتھ مل کر یزید کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

4- اگر فرض کر لیا جائے کہ سارا کوفہ امام کا حمایتی بننے کو تیار تھا تو اس کا مطلب تو واضح تھا کہ اتنے وسیع ملک میں صرف ایک شہر ہی امام کا ساتھ دینے کو تیار ہوا تھا جبکہ مصر، عراق، عرب، عجم کے دوسرے متعدد شہروں کی طرف سے امام کی تحریک کی حمایت میں کوئی موثر آواز نہ اٹھی تھی۔ بنابریں صرف ایک شہر کی آبادی امام کو امت مسلمہ کا امیر اور خلیفہ بنانے کیلئے کافی نہ تھی جبکہ ہر طرف سے رجب اور شعبان کے مہینوں میں یزید کی کھلی بیعت مکمل ہو چکی تھی۔ بنابراں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ کوفہ سے آنے والے خطوط امام کی تحریک کا محرک بنے بلکہ واقع یہ ہے کہ امام کے قیام کے نتیجہ میں کوفہ والوں کو حوصلہ ہوا کہ حق کا ساتھ دیا جائے۔

5- حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے اسلامی شعائر کا حکومتی سطح پر مذاق اڑانا اور اس طرز عمل کو معاشرہ کی طرف سے خاموشی سے قبول کر لینا ایک ایسا عنصر تھا جس نے امام کو قیام کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہو گا۔ امام کی ذمہ داری تھی کہ دین کا تحفظ کیا جائے۔ امام نے اپنی قربانی پیش کر کے یہ اصول بھی متعارف کرایا کہ یہ صرف اسلام ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو تحفظات مہیا کرے اور ان کے لئے آسانیاں پیدا کرے بلکہ مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ جب اسلامی شعار کو ضرورت پڑے تو مومنین آگے بڑھ کر ان کا تحفظ کریں تا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی سنت جاری رہے۔

6- امیر معاویہ کی طرف سے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جانا ایک ایسا عمل تھا جسے آج کی

سیاسی زبان میں آئینی انحراف کہا جا سکتا ہے اور جو کوئی آئین کی شقوں کو پامال کرتا ہے وہ قوم کا مجرم بن جاتا ہے لہٰذا اس واقعہ نے بھی امام کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا ہوگا۔ اگر ولی عہدی کی بیعت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولؐ کے خاندان کے ایک اہم فرد نے ایسے انحراف کو شرعی جواز مہیا کر دیا۔ ایسا کرنا قرآن وسنت کی واضح نفی تھی۔

7- مکہ میں قیام کے دوران حج کے موقع پر امام کا قتل ایک ایسا عمل تھا جو امام نہیں چاہتے تھے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں جن میں خانہ کعبہ کی تکریم اور حسینی تحریک کے مقاصد و عوامل سے عوامی عدم آگہی کا عنصر بھی موجود تھا۔

8- سلطنت یا حکومت کا حصول امام کی تحریک کا مقصد نہ تھا۔ اگر خلافت کا حصول امام کا مقصد ہوتا تو برسوں پہلے امیر معاویہ سے سمجھوتہ کرتے ہوئے یزید کی ولی عہدی کو مدینہ یا کوفہ کی گورنری کے عوض قبول کر لیتے تاکہ ایک دفعہ سیاسی اقتدار کی دوڑ میں شامل ہو کر آئندہ کیلئے اپنا راستہ صاف کریں جس طرح امیر معاویہ نے گورنری سے خلافت کا عہدہ سنبھالا تھا۔ امام کی سیاست قرآنی اصول وضوابط پر استوار تھی اور ان کے پروگرام میں کسی قسم کا دھوکہ' فریب شامل نہ تھا۔ ان کی سیاست مساوات' فلاح' تکریم آدم' انسان دوست رویہ' درگذر' عدل واحسان اور حقوق بشری کے تحفظات سے عبارت تھی۔

9- امام کی جنگ یزید کے ساتھ نہ تھی۔ امام کا ہدف قانون الٰہی کی بالادستی اور اصول کا نفاذ تھا۔ امام کی جنگ اللہ کے بندوں کی آزادی کیلئے تھی۔ امام کے پیش نظر نہ ذاتی مفاد تھا اور نہ ہی ذاتی نفرت یا ذاتی دشمنی تھی۔ امام ان باتوں سے بہت بلند تھے۔

10- بنابریں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی وہ عنصر ہے جسے ہم امام کی تحریک کا بنیادی رکن قرار دے سکتے ہیں۔ امام نے امیر معاویہ ہی کی زندگی میں 58 ہجری میں حج ہی کے موقع پر واشگاف الفاظ میں اپنا ماضی الضمیر اور موقف اور اپنے دینی' سیاسی' سماجی اور اخلاقی فرائض اور ذمہ داریوں کا اعلان کر دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اتنا

سخت موقف پیش کرنے سے حکومت ان کی نہ صرف دشمن ہو جائے گی بلکہ ان کی نگرانی بھی سخت ہوگی اور حکومت ہر طرف سے متوقع عوامی مدد کا راستہ بند کرنے کی بھی کوشش کریگی چاہے حکومت کو سرکاری خزانے کا منہ کھولنا پڑے۔ امام نے حج کانفرنس میں واضح کر دیا تھا کہ:

الف: حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق قائم نہ ہے۔

ب: اسلامی نظام کے عطا کردہ حقوق بشری غیر محفوظ ہیں۔

پ: عامۃ الناس خوف وہراس کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

ت: لوگوں کو قومی دولت سے حصہ ملنا بند ہو گیا ہے۔

ٹ: خلافت علی منہاج النبوۃ کی روایت قائم نہیں رہی۔

ث: شوریٰ کا تصور ختم ہو گیا ہے۔

ج: منبر پر مفاد پرست سرکاری تنخواہ داروں کا قبضہ ہو گیا ہے۔

چ: صاحبان علم خاموش کر دیئے گئے ہیں۔

ح: بے یقینی کا دور دورہ ہے اور قوم سمت نا آشنا ہو گئی ہے۔

خ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلامی معاشرت کا جز ولاینفک نہیں رہنے دیا گیا اور جنہیں احتجاج کرنا تھا وہ خاموش کر دیئے گئے ہیں۔

د: ظالم طاقتور بن چکے ہیں اور ضعیف وکمزور لوگ ان کے رحم وکرم پر ہیں۔

ڈ: اے صاحبان علم تم پر ذمہ داریاں ہیں اگر تم اللہ کی راہ میں مشکلات برداشت کرلو تو لوگ تمہاری طرف متوجہ ہوں گے۔

ذ اندھے، بہرے اور معذور افراد کی بہتات ہو گئی ہے اور ان پر رحم کھانے والا کوئی نہیں۔

ر: اے صاحبان ثروت تم خود اپنے لئے امان طلب کرتے ہو اور اس کے عوض ظالموں سے چشم پوشی کرتے ہو حالانکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ ظالموں کو ظلم کرنے سے باز رکھو۔

ژ: امام نے امیرؓ معاویہ کو اپنے ایک خط میں آگاہ کر دیا تھا کہ حسین وقت آنے پر قیام کرے گا اور حاکم وقت نے اس تنبیہ کا مکمل نوٹس لیا اور باضابطہ کارروائی شروع کی اور اس کیلئے منصوبہ بندی بھی کر لی گئی۔

ان حالات کے پیش نظر امام اپنے ناناؐ کی مسجد میں یا مملکت اسلامیہ کے سرحدی علاقوں کی کسی مسجد میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے اپنی ذاتی نجات اور روحانی درجات کی بلندی کیلئے ذکر واذکار میں مشغول ہو سکتے تھے۔آپ کسی دور دراز علاقے میں جہاں حکومت کا اثر ورسوخ ممکن نہ ہو ایک تحریک کو منظم کر سکتے تھے تاکہ آل ابوسفیان کی حکومت کو متزلزل کیا جا سکے۔ کیا یہ اس لئے نہ کیا گیا کہ عوام کی طرف سے خاموشی تھی اور حکومت کے معاملات میں عدم مداخلت کا رجحان مضبوط ہو گیا تھا اور زمینی حقائق کو جوں کا توں تسلیم کرنے کے علاوہ لوگوں کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔آپ فقہ کی گتھیاں بھی سلجھا سکتے تھے۔ یہ کام تو آپ کر ہی رہے تھے کیونکہ لوگ اپنے مسائل لے کر آپ کے پاس آتے تھے لیکن آپ نے انسانوں کی آزادی کے علاوہ اسلامی نظریات کی آزادی کیلئے بھی جدوجہد کرنا تھی۔ سابقہ شریعتیں اس لئے منسوخ ہوئیں کہ ان میں تحریف ہو گئی تھی اور بگڑی ہوئی فقہ ذہنی وجسمانی غلامی کا پیش خیمہ بن جمایا کرتی ہے۔اگر شریعتوں میں مفاد پرست دخل اندازی نہ کرتے تو بار بار انبیاء ورسل آنے کی ضرورت نہ ہوتی۔امام حسینؑ کے سامنے دین کے حوالے سے بھی مسائل کا ایک گہرا الجھاؤ تھا۔اجتہاد کو زندہ رکھنے اور اجتہاد کو دربار سے آزاد کرانا بھی ایک اہم سوال تھا۔ چونکہ اب کسی اور نبی نے نہیں آنا لہٰذا شریعت محمدیؐ کے دھارے کو صحیح سمت سے نہ ہٹنے اور نہ ہٹائے جانے والے لائحہ عمل کو اختیار کرنا تھا۔امام کے والد محترم نے اسلامی معاشرہ کے مستقبل کا اندازہ لگاتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ لوگوں میں اسلام کی حالت اس پوستین جیسی ہو جائے گی جسے الٹ کر پہن لیا گیا ہو یعنی الٹی تعبیریں ہوا کریں گی۔اس صورتحال نے امام کو خبردار کر دیا تھا کہ اسلام کو ملوکیت کے شکنجوں سے آزاد کرانے اور مخلوق خدا کو سیاسی واقتصادی وفکری آزادی دلانے اور اعلیٰ اقدار کے نفاذ اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے اپنی جان تک کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرنا۔قرآن کے

اصولوں کی اتنی رفعت اور اہمیت ہے کہ ان کی بقا کیلئے جانیں بھی قربان کی جاسکتی ہیں۔

اس مقام پر اس بات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ امام کو قدم قدم پر لوگ مشورے دے رہے ہیں کہ اپنی جان بچائیں لیکن امام جواب میں کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو اجاگر کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ جب امت یزید جیسے حاکم کی بیعت میں مبتلا ہو جائے تو ایسے اسلام کو میرا سلام ہے۔ ایک رجحان بقائے ذات کا تھا جبکہ دوسرا رویہ اسلامی اصولوں کے بقاء کا تھا۔ یہ نکتہ امام کے قیام کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

دراصل حسینؑ کی تربیت حامل وحی کے گھرانے میں ہوئی تھی اور قرآنی اصول ان کی فکر وعمل کے اساس تھے۔ قرآن قربانی اور خود فراموشی کی تعلیم دیتا جائے اور اس میں سستی واقع نہ ہونے پائے۔ خدا مسلمانوں کو روزانہ پنجگانہ نماز کی تاکید کیوں کرتا ہے؟ حق و صداقت کا تصور ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔ توحید کا عملی مظہر دُنیا میں ہوتا رہے۔ اسلام ایک متحرک نظر آئے نہ کہ جامد رسومات کا مجموعہ۔ سورہ حشر 09-28/59/08 میں فے کے مال کی تقسیم کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یہ لوگ مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں گو خود ان کی اپنی ذات کی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سورہ دھر 29/76/08 میں مومنین کی تعریف میں لکھا ہے کہ اپنی ضروریات سے بلند ہو کر یہ لوگ صرف اللہ کی محبت کی خاطر مسکین، یتیم اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

امام نے اپنے گھر میں یہی سبق سیکھا تھا کہ پیغمبر کی اصل سنت یہ ہے کہ وہ جہالت، تعصب، فساد، عدم مساوات، ظلم و استبداد کے خلاف جہاد جاری رکھا جائے اور اس میں سستی واقع نہ ہونے پائے۔ خدا مسلمانوں کو روزانہ پنجگانہ نماز کی تاکید کیوں کرتا ہے؟ حق و باطل کا تصور ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔ توحید کا عملی مظہر دُنیا میں ہوتا رہے اور نظر بھی آئے۔ اسلام ایک متحرک دین نظر آئے نہ کہ جامد رسوم کا مجموعہ۔ نبی اس لئے آتے ہیں کہ انسان کو شکنجوں سے آزاد کرایا جائے اور لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔ رسولؐ شرک کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ شرک صرف یہ نہیں ہے کہ مٹی یا پتھر کے بت کے سامنے سجدہ کرلیا جائے بلکہ وہ ظالم حاکم جو اللہ تبارک تعالیٰ کی بجائے خود کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دے کر

فرعونی فکر کو آگے بڑھاتے ہیں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ طبقات جو خود ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر اللہ کی مخلوق کو محروم کرتے ہیں دراصل شرک کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی ربوبیت کو چیلنج کر رہے ہوتے ہیں۔ بنابراں امام حسینؑ کا قیام دراصل سنت انبیاء کا احیاء تھا۔ امام اپنی جدو جہد سے رسولوں کے کام کو آگے بڑھا رہے تھے لہٰذا یہ سوال کہ حسینؑ نے اپنی جان بچانے کی بجائے قیام کیوں کیا دراصل مقاصد بعثت انبیاء سے عدم واقفیت ہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا نبی سے بھی یہی سوال کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر نبی کی پیروکار سے یہ سوال کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ سورہ توبہ 10/09/24 کا فرمان بھی ملاحظہ ہو:

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ کے جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے۔ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہ آیت امام کے قیام کی حتمی دلیل مہیا کر دیتی ہے اور امام کے عمل کا جواز بھی پیش کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے زیادہ اس جہاں میں مومن کو کوئی چیز عزیز نہیں ہو سکتی۔ امام نے اپنے ایمان کو کربلا کے میدان میں ثابت کر دکھایا۔

اسی ضمن میں سورہ ہود 12/11/116-118 قابل ذکر ہے: مفہوم درج ذیل ہے۔

پس کیوں نہ تم سے پہلے کے زمانوں کے لوگوں میں سے ایسے اہل خیر لوگ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے' سوائے ان چند کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی۔ ظالم لوگ تو اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جس میں انہیں آسودگی دی گئی تھی اور وہ گنہگار تھے۔ آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے لوگ نیکوکار ہوں۔ اگر

آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا۔ وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے۔

بنابراں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ امام حسینؑ کا اپنے بال بچوں سمیت مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کوفہ کی طرف سفر کا محرک صرف یہ جذبہ تھا کہ مملکت اسلامیہ میں بسنے والے لوگوں کو استعماری قوتوں کے شکنجے سے آزاد کرانا تھا۔ امام اس شعور کو بیدار کرنا چاہتے تھے کہ خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کرنے کا مقصد وحید مخلوق خدا کا استیصال ہے اور جبر کی کیفیت طاری کر کے وطن عزیز کے ذرائع پیداوار پر سیاسی ہیئت حاکمہ کی گرفت کو مضبوط کرنا ہے۔ امام حسینؑ کی نگاہیں اس مستقبل کی طرف تھیں جس کی خبر حضرت علیؑ اپنے خطبات میں دے چکے تھے اور وہ یہ تھا کہ بنو امیہ کی قیادت میں امت تاریکی اور بے یقینی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آپ نے تبلیغ و نصیحت کا وظیفہ نہ چھوڑا۔ جب آپ کربلا کے درمیان میں اترے تو اس وقت بھی آپ نے اپنے اصحاب کو ان الفاظ میں متنبہ کیا کہ حالات دگر دوں ہیں' برائیاں عام ہیں اور اچھائیاں رخصت ہوگئی ہیں۔ زندگی کی سچائی میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل کو پنپنے کی کھلی چھٹی ہے۔ ایسی دنیا میں اور ان حالات میں مومن بندوں کو اس کے سوا اور کوئی آرزو نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے خدا سے جلد جا ملے۔ آج مجھے موت سعادت معلوم ہو رہی ہے اور ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دکھ اور تکلیف کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہاں سے امام اپنی ارضی زندگی کا آخری خط کوفہ میں موجود سلیمان' میتب' عبداللہ اور رفاعہ اور دیگر مومنین کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> میرے دوستو! میرے ناناؐ نے فرمایا کہ لوگ جب کسی ظالم بادشاہ کو دیکھیں کہ اس نے خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے' وہ سنت رسولؐ کے خلاف کام کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ گناہ اور ظلم کے طریقے سے معاملہ کرتا ہے اس کے باوجود وہ کچھ نہ کہیں اور کوئی اقدام نہ کریں تو اللہ تبارک تعالیٰ انہیں اس جگہ بھیجے گا جس جگہ کے وہ مستحق ہیں۔

''میرے ساتھیو! آپ کو معلوم ہے کہ بنی امیہ نے شیطان کے فرمان کی اطاعت کی ہے اور وہ خدا کے فرمان سے سرکشی کرتے ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے زمین پر کیسا فساد برپا کیا اور کس حد تک انہوں نے احکامِ خدا کو معطل کیا۔حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا ہے۔'' ''دوستو! آپ واقف ہیں کہ میں خلافت کے لیے سب سے زیادہ اہل ہوں اور صرف عدالت اسلامی کے سائے ہی میں یہ ممکن ہے کہ استعمار اور ظلم کے دباؤ سے نجات حاصل کی جائے۔''

''کوفہ کے لوگو! یہ تم ہی تھے جنہوں نے بڑی تعداد میں خطوط لکھے اور اپنے پیغام رساں بھیجے اور تم ہی نے اپنے ان دعوت ناموں میں دلکش اور امید بخش باتیں لکھی اور کہی تھیں۔''

''میں تمہاری ہی دعوت کو قبول کر کے تمہاری جانب آیا ہوں۔اگر تم اپنے وعدوں پر قائم ہو تو کیا کہنے۔اس صورت میں تم نے زندگی میں اپنے حصے کا کردار ادا کر دیا ہے اور ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے سعادت کی راہ طے کر لی ہے۔''

''اس کے برعکس اگر تم ہمارا ساتھ دینے پر شرمندہ ہوئے اور تم نے عہد توڑ دیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔یہ تم ہی تھے کہ جنہوں نے میرے باپ اور بھائی کے ساتھ اور میرے چچا زاد بھائی کے ساتھ بے وفائی کر کے زندگی اور سعادت کے ملنے والے اپنے حصے کو پامال کیا تھا۔اچھی طرح جان لو اللہ تعالیٰ ہمیشہ میرا یار و مددگار رہا ہے اور مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔(والسلام)

امام نے شعوری طور پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول کو اپنی تحریک کا بنیادی رکن بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔آپ کو معلوم تھا کہ اس تحریک کے نتائج کیا ہونگے لیکن فرائض کی ادائیگی سود و زیاں کی پرواہ نہیں کرتی۔امام کو معلوم تھا کہ اس کام کے لوازمات کیا ہیں اور انہیں کون کون سی دشواریوں کا سامنا ہوگا۔آپ کو معلوم تھا کہ عوام بے حسی کا شکار ہو چکے

ہیں۔ ظلم واستبداد نے لوگوں کو خاموش کر دیا ہے۔ لوگ اپنی جان، مال اور عزت کو بچانے کی فکر میں تھے۔ امام کو ایسے وقت میں جان فروشوں کی جمعیت تیار کرنا تھی۔ امام کو حکومت سے مکمل لاتعلقی اختیار کر کے اپنا مؤقف سب پر واضح کرنا تھا۔ امام کو اپنا منشور واضح طور پر اہل علم اور عامۃ الناس کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اس کا مطلب رابطہ عوامی اور تبلیغ کا پہلو بھی تھا۔ اپنی زندگی کو بطور نمونہ بھی پیش کرنا تھا اور اپنے حسب نسب کو گواہ بنا کر لوگوں کو حق کی حمایت میں تیار کرنا تھا۔ عمومی شعور کو بیدار کرنا تھا۔ عملی جدوجہد کا آغاز بھی کرنا تھا۔ اس ساری کارروائی میں ہجرت کی نوبت بھی آسکتی تھی اور بالآخر حکومت کی طاقت سے ٹکر یعنی جنگ بھی درپیش ہوسکتی تھی اور غیر متوازن جنگ کا نتیجہ چھوٹی جمعیت کیلئے ہلاکت بھی ہوسکتا ہے۔ امام کو ان ساری باتوں کا ادراک تھا کیونکہ وہ کئی جنگوں میں شریک رہ چکے تھے اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے چشم دید گواہ بھی تھے۔ امام کو یہ بھی احساس تھا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تصور حدود نا آشنا ہے۔ یہ کہنا کہ یہاں تک نیکی کی تعلیم دو اس حد تک لوگوں کو برائی سے روکو لیکن اس کے بعد رک جاؤ۔ قرآن نے اس حکم کو عام کیا ہے اور اسے حالات کی نرمی کے ساتھ مشروط نہیں کیا۔ یہ فریضہ ہر صورت میں ادا ہونا ہے۔

امام حسینؑ کے قیام کا ایک بڑا عظیم مقصد اسلام کو ملوکیت کے شکنجہ سے آزاد کرانا تھا۔ امام کی قربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا حق جسے خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت اپنے دائرہ اثر میں رکھنا چاہتی تھی ان سے چھن کر صاحبان علم کے پاس واپس آ گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی اگرچہ مورخین کا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ علم کی تعبیر وتفسیر کا حق قرآن اور حامل وحی نے صاحبان علم کو دیا تھا۔ یہ خصوصی تشخص تھا جو اسلام نے اہل علم کو عطا کیا تھا۔ یہ اعزاز امت مسلمہ کو حضورؐ کی تعلیمات کے طفیل ملا تھا۔ آپ کے صدقہ میں ایک امت بنی، لائحہ عمل میسر آیا، سمت مقرر ہوئی، اہداف و مقاصد حیات واضح ہوئے اور خلفائے راشدہ نے شوریٰ کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اجتہاد جیسی نعمت کو بروئے کار لا کر فقہی ارتقاء کا عمل شروع کیا۔ لیکن خلفاء راشدین کے بعد جب ملوکیت کا دور دورہ شروع ہوا اور حالات بے قابو ہو گئے تو حسینؑ نے خاک وخون میں لوٹ کر اجتہاد وتعبیر وتفسیر قرآن وسنت

کا عمل دربار سے چھین کر علماء کے سپرد کر دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ پھر مملکت اسلامیہ کی سرحدوں اور دارالخلافہ سے دور شہروں میں امام محمد باقر' امام جعفر صادق' امام ابوحنیفہ' امام مالک' سفیان ثوری' امام شافعی اور امام حنبل جیسے مجتہد اور امام نمودار ہوئے جنہوں نے دربار کی سرپرستی کے بغیر فقہ کے علم کو چار چاند لگا دئے۔ جس انداز سے ان بزرگوں نے تفقہ فی الدین کر کے اجتہادی عمل کے ذریعہ فقہ و اصول فقہ کا ذخیرہ جمع کیا اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب نہیں دے سکتا۔ یہ سب کچھ کربلا ہی کا صدقہ تھا۔

امام حسین کی بے مثل قربانی کے پیش نظر ذہن میں سوال یہ ابھرتا ہے کہ امام کی تحریک کی بنیاد کن عوامل پر تھی اور آپ کو شہید کرنے والے کون تھے۔ سوال کے پہلے حصہ کا جواب یہ ہے کہ حق و باطل کے اس عظیم معرکہ میں حسینؑ کا آسرا مندرجہ ذیل چیزوں پر تھا۔

1- اللہ اور اس کے رسولؐ پر غیر متزلزل یقین۔

2- قرآن و آخرت پر مکمل ایمان۔

3- اہل بیت رسولؐ کا معزز فرد ہونے کی ذمہ داری۔

4- قرآنی تعلیمات کے نفاذ کا جذبہ۔

5- تربیت کا منطقی نتیجہ۔

6- شرک کے خلاف جہاد کا فریضہ۔

7- صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد طلب کرنا۔

8- ذاتی کردار' شجاعت' حق کا ساتھ دینا۔

9- رضائے الٰہی کا حصول۔

10- یہ احساس کہ ہر انسان اپنے اعمال کے عوض گروی ہے۔ (سورہ مدثر 29/74/38)

یہ عوامل حسینؑ کا سرمایہ تھے۔ حسینؑ کے سامنے مستقل اقدار تھیں جن کو زندہ رکھنا عباد الرحمٰن کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اب ہم ان رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے مل کر حسینؑ کو قتل کیا۔ یہ وہ رجحانات ہیں جو دس محرم کے سانحہ کا سبب بنے۔

1- اقتدار کی ہوس۔

2- لالچ، طمع، سرکاری مناصب حاصل کرنے کیلئے دین تک قربان کرنے کا رجحان جو اکثر معاشروں کے صاحبان ثروت میں ہوتا ہے اس اصول کو قرآن نے متعدد بار دہرایا ہے۔

3- رشوت۔

4- کچھ صاحبان علم اجرت وصول بن گئے۔

5- بے حسی۔

6- تکبر، غرور اور خود پسندی۔

7- خوف اور جبر کی کیفیت۔

8- جہالت اور شعور کا فقدان۔

امام حسینؑ اپنی تعلیمات، عظمت کردار، ذاتی و اجتماعی قربانی، اہداف کے ساتھ والہانہ وابستگی، نظریاتی سوچ، اعلیٰ انسانی اقدار اور قانون کی بالادستی کیلئے عملی اقدام اور نسبت رسولؐ کے باعث عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں اور ان کی بے نظیر قربانیوں کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر مخصوص ایام میں ان کی یاد منائی جاتی ہے اور انہی ایام میں ان کے روضہ مبارک پر لاکھوں لوگ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کیلئے حاضری دینے کو اپنے لئے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ حتی کہ عراق پر حالیہ امریکی جارحیت، قبضہ اور بے پناہ تباہی کے باوجود 25/30 لاکھ کا مجمع عاشور کے روز امام کی خدمت میں موجود تھا۔ امام حسینؑ کے حوالے سے عظیم اجتماعات کا مسلسل انعقاد مذہبی اور روحانی دنیا کا ایک ایسا فینامینہ (Phenamenon) ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اور ان اجتماعات کو روکنے میں مختلف بادشاہوں اور حکومتوں نے بھرپور کوششیں بھی کیں لیکن ہر جابر حاکم اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا کہ امام سے بڑھتی ہوئی عقیدت کا سیلاب روکا جا سکے۔ اس رجحان کی مختلف سطحوں پر تعبیریں اور تشریحات کی جا چکی ہیں۔ اقوام کی زندگی کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مشاہیر اور محسنوں کی یاد منانے کی روایت زندہ رکھتی ہیں۔

بایں ہمہ بعض اوقات کھلے بندوں اور بعض حلقوں کی جانب سے دبے لفظوں میں امام کی یاد منانے پر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ حلقے جو کسی زمانے میں معترض ہوا کرتے تھے اب کھلے عام اپنے مسلک سے متعلق تہواروں، جلوس اور تقریبات کو اسی انداز میں منانے کی طرف مائل ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود امام عالی مقام کے پرستاروں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے امام کی یاد منانے کے سلسلہ میں خصوصی احتیاط برتیں کیونکہ امام جس شخصیتؐ کے نواسے تھے وہ سراپا رحمت، سراپا مواحد، سراپا اصول اور سراپا ایمان تھے۔ حضورؐ کا مشن بھی واضح تھا اور آپؐ کی سیرت آج بھی زندہ ہے اور اہل ایمان کی رہنمائی کر رہی ہے اور خود سیدنا امام حسینؑ کے قیام کا ایک مقصد سیرت رسولؐ کو زندہ کرنا تھا۔

بنابراں مقاصد حسین سے آگاہی ہماری ذمہ داری ہے تا کہ ہم امام کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ، احکام اسلام، اللہ اور رسول کے حرم، اللہ کی بادشاہت، قانون کی بالادستی، انسانی تکریم اور انسانی آزادی اور حقوق بشری کا دفاع کر سکیں اور جبر واستبداد وفساد وظلم وملوکیت جیسے انسان دشمن عناصر کا قلع قمع کر سکیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مقدمات قابل غور ہیں۔

1- یہ کہ حسین چند خبیث لوگوں کو نیچا دکھانے کیلئے شہید نہیں ہوئے تھے۔

2- امام کی قربانی کا مقصد ذاتی منفعت نہ تھی۔ اپنے لئے کسی سرکاری عہدے کو قبول کرنا یا اس کیلئے کوشش کرنا یا اس کیلئے تلوار اٹھانا نہ تو ان کا ورثہ تھا اور نہ ہی یہ ورثہ انہوں نے اپنی اولاد میں چھوڑا۔

3- امت کی امامت کا عہدہ ایک شہر یا چند امصار کی حکومت سے بہت بلند ہے خاص طور پر جبکہ امامت کا عہدہ سیدنا ابراہیمؑ کی دُعا سے ان کے خاندان کیلئے مخصوص ہو چکا تھا اور یہ منصب کا دائرہ اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ کل انسانوں تک کیلئے تھا۔ حاکم یا خلیفہ کا دائرہ اختیار تو جغرافیائی و سیاسی حدود کا پابند ہوتا ہے جبکہ امام کے منصب کا دائرہ کار حدود نا آشنا ہے۔ اسی لئے خواجہ معین الدین چشتیؒ نے

فرمایا تھا کہ

شاہ ہست حسین و بادشاہ ہست حسین

اور بادشاہ اپنے کارندوں یا نائبین کے آگے سر جھکاتا ہے نہ ہی ان کی بیعت کرتا ہے۔ بیعت اعلیٰ وارفع وصاحب اقتدار کی جاتی ہے صاحب اقتدار کسی کی بیعت نہیں کرتا۔

4- یہ کہ حسینؑ نہ تو ناتواں تھے اور نہ ہی ضعیف تھے۔ صرف یہ نہیں کہ آپ کے پاس ایمان و کردار کی قوت تھی بلکہ آپ اگر چاہتے تو خاموشی سے کسی جگہ بیٹھ کر اپنی تحریک کو عملی عسکری رنگ دے کر خود خلافت کا تخت حاصل کر سکتے تھے یا کم از کم حاکمان وقت کا جینا حرام کر دیتے۔

5- یہ کہ حسینؑ کا قیام ان کے اور ان کی اہل بیت اور اصحاب کا سوچا سمجھا شعوری فیصلے کا نتیجہ تھا۔ نہ تو حالات و واقعات نے انہیں مجبور کیا تھا نہ ہی ان کے پاس متبادل راستوں کی کمی تھی۔ حسینؑ کا قیام ایک نظریاتی عمل تھا جو اسلامی تحریک کی ایک کڑی تھی۔ اس قیام کے سوتے انقلاب محمدی سے پھوٹتے تھے۔ اور یہ عمل نہ تو وقتی، علاقائی یا زمانی تھا اور ہی جغرافیائی حدود کا پابند تھا۔ یہ قرآن وسنت کا اصول ہے جسے قیامت تک زندہ رہنا ہے۔

6- یہ کہ قیام حسینؑ ختم نبوت کی موثر دلیل تھی۔ امام کی تحریک نے ثابت کر دیا کہ اب آئندہ نہ کبھی کسی نبی یا رسول نے آنا ہے نہ ہی کسی نئی شریعت کو نافذ ہونا ہے۔ جس طرح حضورؐ سے پہلے اقوام کی بگاڑ کی وجہ سے نئی شریعتیں یا مزید نبی یا رسول آ جایا کرتے تھے۔ امام نے اپنے قیام کے ذریعہ یہ بتایا کہ اب شریعت محمدؐ ہی کے تابع اجتہاد کے ذریعہ مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور اس حل میں کسی طبقے خاندان، فرقے، گروہ یا قبیلے کے مفادات کو قطعاً کوئی اہمیت حاصل نہ ہوگی۔ بالادستی صرف اسلامی اصول وضوابط ہی کی ہوگی۔

7- امام کے قیام کا مقصد اسلام کو آزاد کرانا تھا۔ جب تک خلافت راشدہ قائم تھی اسلامی فقہ مشاورت اور اجتہاد کی بناد پر ارتقائی منازل طے کرتی رہی لیکن امام علیؑ کی شہادت

کے بعد جب خلافت علیٰ منہاج رسالت کی جگہ ملوکیت کی داغ بیل پڑی تو پھر اسلامی فقہ دربار میں مقید ہونا شروع ہوگئی تھی اور ایسے رجحان منظر عام پر آئے جن کی بیخ کنی کرنا لازمی تھا۔ امام نے قیام کر کے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا حق حاکم، بادشاہ، دربار سے چھین کر علماء اور اہل علم کے سپرد کیا اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد امام محمد باقر، امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام حنبل، ثفیان ثوری جیسے مجتہدین اور آئمہ نے صرف اسلامی فقہ کی خدمت کیلئے اپنی زندگیاں وقف کیں بلکہ یہ سب کچھ سرکاری سرپرستی کے بغیر دارالخلافہ سے بہت دور عوامی علمی مجالس کے ذریعہ ہوا۔ ان میں سے کوئی امام یا مجتہد دمشق کی سرکاری سرپرستی میں پروان نہیں چڑھا۔ امام حسینؑ کا یہ کارنامہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے اگرچہ آج بھی بعض عربی ریاستیں فقہ کی ترویج وتنقید پر قابض اپنے اقتدار کو طول دے رہی ہیں۔ علامہ سر محمد اقبالؒ نے اپنے تاریخی خطبہ سال 1930ء بمقام اللہ آباد میں اسلام کو عرب امپیرلزم سے نجات دلانے کا ایک بار پھر نعرہ بلند کیا تھا۔

8- امام حسینؑ نے اپنے قیام کے ذریعہ امت مسلمہ کو بالخصوص اور دُنیا بھر میں آزادی کے متوالوں کو حریت فکر کی اہمیت اور اس کیلئے نظریاتی وابستگی اور ان کے حصول کیلئے شجاعت اور قربانی کا درس دے کر یہ بات ممکن بنائی کہ کوشش کے ذریعہ ضد انقلاب قوتوں کو شکست دی جاسکتی ہے۔

9- امام حسینؑ کے قافلہ میں بیمار، بچے اور خواتین بھی شامل تھیں۔ اس میں یہ سبق پنہاں ہے کہ ریاستی امور اور زندگی کے معاملات میں عورت برابر کی شریک ہے۔ نظریاتی وابستگی، عبادت، تزکیہ نفس، احتسابی عمل، ایمان، عمل میں صرف مرد ہی شریک نہیں ہوتے بلکہ عورتوں کا حصہ برابر ہے۔ امام نے اپنی خواتین کو اپنے ہمراہ شامل کر کے اپنی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ زہراؑ کی سنت اور رسولؐ اللہ کی سنت کو زندہ کر دیا تھا۔ امام یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے تھے کہ عورت سراپا رحمت ہے اور اقوام کی تعمیر ماں کی گود

ہی میں ہوتی ہے۔عورت بڑا مہربان وجود ہے اور اللہ کے تخلیقی عمل کا نہایت اہم رکن ہے۔اگرچہ عورت اور مرد کے حقوق وفرائض برابر ہیں لیکن عورت کا وظیفہ بہت اہم ہے اور اس کی ذمہ داریوں کی نوعیت بڑی نازک ہے۔عورت عائلی زندگی کا بنیادی ستون ہے۔ان میں فرق تقسیم کار کا ہے۔قرآن نے عورت کے ذریعہ ہی گھر کے سکون اور رحمت کو یقینی بنایا ہے۔

اقبال نے کہا ہے کہ قوم کا حقیقی سرمایہ اس کا مال و دولت نہیں بلکہ آنے والی نسلیں ہوتی ہیں اور اقوام کا مال و دولت صحت مند بچے ہوتے ہیں جو محنتی اور تیز دماغ ہوں لہٰذا قرآن وملت کی صحیح محافظ امت کی مائیں ہیں جن کی وجہ سے انسانوں میں اخوت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مال اُو فرزندہائے تندرست
تر دماغ وسخت کوش وچاق وچست
حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآں و ملت مادراں

امام کے اس قیام میں ان کے ہمراہ ان کی خواتین کی موجودگی قرآن کے مندرجہ ذیل احکام کی تعبیر ہی تو ہے: سورہ توبہ 11/09/71,72

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار و معاون اور دوست ہیں۔وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور بُرائیوں سے روکتے ہیں۔نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں۔زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی بات مانتے ہیں۔یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔بے شک اللہ غلبے والا اور حکمت والا ہے۔(71)

ایماندار مردوں اور عورتوں سے اللہ تعالیٰ نے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا

ہے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان صاف ستھرے پاکیزہ محلات کا جو ایسی ہمیشگی والی جنتوں میں ہیں۔ اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔

سورہ البقرہ 02/02/228

اور عورتوں کا حق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔

سورہ ال عمران 04/03/195

میں کسی عمل کرنے والے کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔

سورہ الاحزاب

22/33/35

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمان بردار مرد اور فرمان بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں، بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والیاں ان سب کیلئے اللہ تعالی نے وسیع مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

10- اسی طرح نوجوانوں کی شرکت نے ہر دور کے نوجوانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ جواں سال اپنے دین کے ارکان سے آگاہی حاصل کریں اور صرف اسلام سے فوائد حاصل کرنا ہی اپنا مقصد نہ بنائیں بلکہ اسلام کے دفاع کیلئے عملی اقدام اگر کرنا پڑیں تو ان سے گریز نہ کریں۔ انسان خلوص کے ساتھ صرف اسی وقت کسی نظریہ کا دفاع کرسکتا ہے جس پر اس کا ایمان پختہ ہو اور ایمان کی پختگی شعوری فکر کا تقاضا کرتی

ہے۔ یہ سب کچھ تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے لہٰذا قوم کے نام پیغام یہ ہے کہ نئی نسل کی فکری بنیادوں کی طرف اجتماعی دھیان دینا ضروری ہے تاکہ نوجوان نسل کی صحیح خطوط پر تربیت ہو سکے اور ان کے عمل بے یقینی کا شکار نہ نے پائیں۔

11- امام نے میدان جنگ سے پہلے اور میدان جنگ میں جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔ امام کے عمل میں اسلامی تعلیمات کا بھرپور اثر نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسی ہستیؐ کے نواسے ہیں جس کی سیرت کل عالم کیلئے نمونہ ہے۔ آپ نے حر کے پیاسے لشکر کو بے آب ریگستان میں پانی سے سیراب کیا اور دشمن کے سپاہیوں کے جانوروں تک بھی پانی پہنچایا حالانکہ آپ پر دشمن کو سیراب کرنے کی ذمہ داری نہ تھی۔ امام نے بڑھ کر کسی پر حملہ نہ کیا۔ امام نے حتی الوسیع جنگ شروع کرنے سے گریز کیا۔ امام نے ہر موقع پر اپنے مخالف گروہ کو خطبات کے ذریعہ اسلام کی تعلیمات، اسلام کے تقاضوں اور امامت کے فرائض سے آگاہ کیا۔ امام نے شرافت کا معیار قائم کیا اور اعلیٰ اقدار سے مزین کردار کا اس حد تک مظاہرہ کیا کہ دشمن فوج کے کئی عسکری اور سپہ سالار امام کے لشکر میں شریک ہو کر شہادت کے مقام پر فائز ہوئے۔ امام نے اس سارے سفر میں کسی پر غصہ کا اظہار کیا نہ ہی کسی سے انتقام لینے کا سوچا۔ جب حر جیسے دشمن جس نے آپ کو گھیر کر کربلا میں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کیا تھا، نے آپ کی طرف بڑھ کر معذرت کرنا چاہی تو آپ نے حر کو معافی مانگنے اور توبہ کرنے سے پہلے معاف کر کے گلے لگایا اور کہا کہ تیرا نام تیری ماں نے حر رکھا تھا۔ تو اس دنیا میں بھی آزاد ہے اور جنت میں بھی آزاد ہوگا۔ لفظ حر کی نسبت سے امام نے ہمیں حریت فکر اور انسان کی آزادی کا درس دیا اور بتایا کہ انہیں یہ اصول کتنے عزیز ہیں۔

اعلیٰ اقدار کے مظاہرہ کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ لوگ ایک با اخلاق شخص کے عمل کے ذریعہ اس نظریہ سے آگاہی حاصل کریں جس نظریہ، تصور اور لائحہ عمل نے انسان کو باادب اور با اخلاق بنایا ہے۔ وہ کیا وجوہات ہیں کہ ایک ظالم جاہل، اکھڑ انسان

میں اتنی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر دوسرے لوگوں کی تکریم، خدمت اور منفعت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ عمل ال رسولؐ کا خاصہ تھا اور حسینؑ نے تلخ ترین حالات میں بھی اعلیٰ اقدار اور اعلی اخلاق کو فراموش نہیں کیا۔

-12 امام نے میدان جنگ میں اپنے ناناؐ کی اقامت الصلوٰۃ کی سنت کو بھرپور طریقے سے قائم رکھا۔ آپ کی نماز میں ایسی وارفتگی اور خلوص تھا کہ اس کے تصور سے ہی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس نماز کے ذریعہ عبادت کے فلسفہ اور عبادت کی حکمت کو ذہن نشین کرایا کہ عبادت کا مطلب دراصل اطاعت الٰہی اور اطاعت رسولؐ ہے۔ انسان کی زندگی کا مشن اسی ایک لفظ اطاعت ہی میں مضمر ہے۔ جو شخص اطاعت کے راز کو پالیتا ہے وہ نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچ کر دنیا و مافیہا میں سرفراز ہو جاتا ہے۔

-13 امام حسینؑ کے مشن کی معرفت، حسینؑ کی تعلیمات کی معرفت دراصل اللہ تبارک تعالیٰ کے منشور اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی معرفت ہے۔ حسین دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ تک پہنچنے کا محفوظ زینہ ہے۔ حسینؑ کی ذات، حسینؑ کا عمل اسلام کے مقاصد تک پہنچنے کیلئے پل کا کردار ادا کرتا ہے۔

-14 حسینؑ کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کی اعلیٰ اقدار، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تقاضوں کے مطابق باعزت اور باوقار زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ امام کی زندگی دراصل ان اصحاب المنتجبین کی زندگی کا تسلسل تھا جنہوں نے اسلام کے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ حسینؑ کی قربانی ظاہر کر رہی تھی کہ ضروری نہیں کہ رسولؐ موجودگی ہی میں جان قربان کرنا افضل عبادت ہے بلکہ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ رسولؐ کے مشن کو ہر دور اور ہر نسل میں بلند کر کے وہی مقام حاصل کیا جاسکتا ہے جو مقام ان لوگوں نے حاصل کیا جنہوں نے شروع شروع میں شہادتیں پیش کیں۔ یہ درست ہے کہ اوّلین کا مقام بہت ارفع ہے اور اعلیٰ ہے۔ قرآن میں

السابقون الاولون یعنی ایمان میں سبقت لے جانے والوں اور اسلامی تحریک کی ابتداء ہی میں شامل والوں کی بہت شان بیان فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ واقعہ 27/56/05-14

15- امام حسینؓ نے اجتماعی قربانی کے ذریعہ شہادت کے مقام کو نہ صرف عزت بخشی بلکہ نظریاتی جدوجہد میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اجتماعی شہادت کو ایک ارفع مقام عطا کر دیا۔ امام نے اس بات کو ثابت کیا کہ اسلامی اصول وضوابط کی نفی قبول نہیں کی جاسکتی اور کسی قسم کے جبر و استبداد کو خاطر میں نہیں لایا جائے گا۔ یعنی بالادستی صرف اصول وضوابط کی قبول کی جائے گی۔

16- امام حسینؓ کی قربانی کا ایک مقصد دراصل سابقہ انبیاء کی سنت کا احیاء تھا۔ امام حسینؓ کی قربانی اس جہاد کا تسلسل ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے۔ امام حسینؓ کا قیام ان عوامل کی نشاندہی ہے جو انسانی آزادی کے حصول میں صدیوں سے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ امام حسینؓ کا قیام ان منفی رجحانات کو ظاہر کرتا ہے جو تکریم آدم کے تصور کی نفی کرتا ہے۔ امام حسینؓ کا مشن ہمیں انبیاء ورسل کی تاریخ اور جدوجہد سے متعارف کراتا ہے۔ سیدنا امام حسینؓ نہ صرف قرآن کے قاری تھے بلکہ سورہ مزمل کی لغت میں رتل القرآن ترتیلا کے مقام پر فائز تھے۔ حسینؓ مزاج شناس وحی اور مزاج شناس رسولؐ تھے۔ حسینؓ قرآن میں درج حکمت کے عارف تھے۔ حسینؓ اچھی طرح جانتے تھے کہ انقلابی دعوت کے عناصر کیا ہوتے ہیں اور سلسلہ انبیاء نے اپنے اپنے زمانے میں کن طاغوتی قوتوں سے مقابلہ کیا تھا اور اپنی اپنی قوم کے سامنے منشور الٰہی کے کون کون سے نقاط پیش کئے تھے۔

سیدنا نوح کی دعوت کا مرکزی نقطہ (1) اطاعت الٰہی تھا۔ آپ نے اللہ تبارک تعالیٰ کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ سورہ الانبیاء 17/21/23، سورہ الشعراء 19/26/107، سورہ یونس 11/10/03۔ سیدنا نوح نے اپنی قوم کو پیغام دیا کہ (2) جو رسوم واعتقادات تمہیں ورثے میں ملے ہیں ان کی کورانہ تقلید چھوڑ کر

اس روشنی کی طرف آؤ جو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی پرورش بھی کرنے والا ہے۔ سورہ ابراہیم 13/14/10۔ اسی طرح قرآن گواہ ہے کہ سیدنا نوح نے انسان کو صدیوں پہلے یہ سبق دیا تھا کہ (3) حق و صداقت کا پیغام قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ گروہ ہوتا ہے جن کے پاس وافر دولت ہوتی ہے، جو حکومت اور طاقت کے نشے میں لوگوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ سورہ المومنین 18/23/24، سورہ الاعراف 64-08/07/59 وسورہ ہود 28-12/11/20۔ سیدنا نوح نے اپنی قوم کو (4) طبقاتی تقسیم کے مضر اثرات سے بھی آگاہ کیا کیونکہ وہاں اہل ثروت اور ہیئت حاکمہ نے مساوات بشری وتکریم آدم کے اصول کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ وہاں ہاتھ سے کام کرنا باعث عار تھا۔ سورہ الشعراء 19/26/144/115 وسورہ ہود 12/11/30۔ یہ تھے حالات جب سیدنا نوحؑ نے دُعا مانگی۔

قال نوح رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا۔

یعنی اے میرے پالنہار تو ان نافرمانوں کا نام ونشان دُنیا سے مٹا دینا۔

اور پھر کشتی تیار ہوتی ہے اور طوفان نوح آ جاتا ہے۔

قرآن سیدنا ہودؑ کا قصہ بیان کرتا ہے جنہیں قوم عاد کی طرف معبوث کیا گیا تھا۔ یہ لوگ قوم نوح کے جانشین تھے۔ آبادی کم تھی اور وسائل پیداوار بہت تھے۔ ہر طرف باغات، پھلوں، چشموں اور اولاد کی بہتات تھی۔ انہیں ہدایت ہوتی ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کے قوانین کی نگہداشت کی جائے۔ سورہ الشعراء 135-19/26/128۔

سیدنا ہودؑ اپنی قوم کو اللہ کو حکومیت اور اسی کی عبادت واطاعت کی طرف دیتے ہیں، جس طرح سیدنا نوح نے تعلیم دی تھی۔ سورہ الاعراف 08/07/65۔ یہ بھی بتایا کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ اس کے نبی کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ رسول قوم سے اجر رسالت نہیں مانگتا۔ سورہ الشعراء 131-19/26/125۔ لیکن ارباب اقتدار کی طرف سے حضرت ہود کی تکذیب

ہوئی۔سورہ الاعراف 08/07/66۔اس قوم نے بھی یہی کہا کہ اپنے معبودوں کو کیسے چھوڑیں اور تم تو ہم جیسے ایک انسان ہو۔تمہیں کیسے رسول مان لیں۔سورہ ابراہیم 18/14/10۔اس قوم نے بھی وحی سے منہ موڑ لیا۔پھر ایک ایسی آندھی چلی جس نے قوم عاد کو آٹھ دن اور سات راتوں میں ملیا میٹ کر دیا۔سورہ الحاقۃ 29/69/06-08۔حضرت صالح کو قوم ثمود کی طرف مبعوث کیا گیا۔سورہ الاعراف 09/07/74۔جنہوں نے اپنی قوم کو نصیحت کی۔سورہ الشعراء 19/26/146-149 کہ یہ دولت اور فراوانی صدا بہار نہیں ہے۔قوم ثمود بھی جابر و مستبد قوم کی طرح فساد برپا کرتی تھی حالانکہ انہیں فساد کرنے سے منع کیا گیا تھا۔سورہ الاعراف 09/07/74۔انہیں کہا گیا کہ حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔سورہ الشعراء 19/26/151-153۔انہیں اللہ تبارک تعالیٰ کی محکومی اختیار کرنے کو کہا گیا۔سورہ الاعراف 09/07/73۔ادھر بھی ارباب قوت کی طرف سے مخالفت ہوئی کیونکہ طاقت وحکومت کا نشہ مفاد عاجلہ سے آگے دیکھنے نہیں دیتا۔اس قوم نے حضرت صالح کو جادوگر کہہ ڈالا۔سورہ الشعراء 19/26/152۔انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ ایک انسان کے روپ میں رسول کیسے آ سکتا ہے۔یہ قوم بھی اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم رہی اور وحی کی پیروی نہ کی۔سورہ ہود 12/11/62۔حضرت صالح کے خلاف نوکر شاہی نے سازش شروع کر دی کہ انہیں رات کو قتل کر دیا جائے پھر ناقہ کا واقع پیش آیا۔یہ آخری حجت تھی کہ اللہ کی مخلوق میں رزق مساوی تقسیم ہوتا ہے کہ نہیں۔قوم ثمود نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔سورہ القمر 27/54/29۔اس کے بعد ہلاکت خیز عذاب آ گیا۔

سیدنا ابراہیمؑ نے بھی اپنی قوم کو محکومیت خداوندی کا درس دیا۔اسلاف پرستی سے منع کیا۔شرک کے خلاف دلیلیں دیں لیکن ان کیلئے آگ کے شعلے تیار کئے گئے۔انہیں ہجرت کرنا پڑی اور پھر بیٹے کی قربانی کا امتحان۔یہ دوسری بات کہ مستقبل میں حسینؑ کی قربانی کا فدیہ لینے پر کر سیدنا اسماعیلؑ کو چھوڑ دیا گیا جن کی نسل سے ہی امام حسینؑ پیدا ہوئے سیدنا اسمٰعیلؑ کو زندہ رکھنے کی حکمت یہ تھی کہ آپ کی نسل سے خاتم النبیینؐ کا ظہور ہونا تھا اور پھر ان کے فرزند امام حسینؑ کو اپنا سر کٹا کر اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنتا تھا۔سیدنا ابراہیمؑ کا پیغام بھی توحید و احکام الٰہی

کی پیروی تھا۔

سیدنا ابراہیمؑ کی تعلیمات کی بنیادی بات یہ تھی کہ ملت کو ٹکڑے ٹکڑے نہ ہونے دیا جائے۔ فرقہ بندی کو شرک کہا گیا۔ سورہ الروم 32-21/30/31 میں نسل اور وطن کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کی مخالفت کی گئی۔ انسان کو نظریہ سے وابستگی اور اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے گھر کا طواف کرنے کا درس دیا گیا۔

اگر آپ قوم لوط کا قصہ پڑھیں تو اس میں جنسی بے راہ روی کی شکل میں احکام الٰہی کی خلاف ورزی نظر آتی ہے۔ قوم لوط ہی کے حوالے سے قرآن نے کہا کہ جو لوگ عقل استعمال نہیں کرتے انہیں غور و فکر کرنے والوں کیلئے نشانی بنا دیا جاتا ہے۔ سورہ العنکبوت 20/29/35۔

انہی قصص القرآن میں سیدنا یوسفؑ کا قصہ بھی ملتا ہے کہ کس طرح نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے انسان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک یوسف وہ تھا کہ مال کی مانند بکا، پھر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن بالآخر نبوت جیسا انعام حاصل کر کے حکومت سے بھی سرفراز ہوئے گئے۔

17- امام حسینؑ اپنے مشن کے ذریعہ اپنے ہم عصروں پر یہ بات واضح کرنا چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ کا بنیادی رکن توحید ہے۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تبارک تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے اور کسی فرد بشر کو یہ اختیار یا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے اشخاص کو اپنا محکوم بنا لے۔ اطاعت بنیادی طور پر قوانین الٰہی کی ہوگی اور اس ایمان پر ہر مومن کاربند ہو جائے یعنی وہ اپنے اعمال سے اس بات کا ہر لحظہ ثبوت مہیا کرے کہ وہ صرف اور صرف احکام الٰہی کا پابند ہے۔ توحید کا ایک اور پہلو بھی تحریک حسینی میں اُجاگر ہوتا ہے یعنی صفاتِ خداوندی کا انسان کی عملی زندگی میں اظہار۔ تسبیح پر اللہ اکبر کہنا کافی نہیں ہے۔ قانون کی بالادستی قائم کرتے ہوئے اللہ اکبر کہنا اللہ کی منشا ہے۔ مخلوق خدا کی منفعت کیلئے کام کرنے کے بعد اگر ہم اللہ کو رحمٰن، رحیم، معطی، ربّ اور کریم کہیں گے تو زندگی کا لطف دوبالا ہوتا ہے کیونکہ یہ

احساس بھی ہوتا ہے کہ پیدا ہونے کا مقصد پورا ہو رہا ہے اور بقول شاعر:

الحمد کہ قانون الٰہی جریاں شد
بہ بہ چہ بجا شد بہ بہ چہ بجا شد

اطاعت اور غلامی دو مختلف کیفیات ہیں۔ اطاعت علی وجہ البصیرت کی جاتی ہے جبکہ غلامی میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اطاعت کا ایک پہلو بہت اہم ہے اور وہ ہے قانون و آئین کی بالادستی۔ یہ قرآن کا اٹل اصول ہے اور اب سائنس کے تجربات اور انسانی محنت نے اس اصول کو ثابت کیا ہے کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے ہی اصولوں، ضابطوں، قوانین اور آئین کے پابند ہوتے ہیں۔ یہی اطاعت شعاری ترقی و کامرانی کا ذریعہ بنتی ہے۔

اسی تصور کے پیش نظر اقبال کہتے ہیں:

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند
خویش را زنجیریٔ آئین کند

یعنی چاند اور ستاروں کو وہی لوگ مسخر کر سکتے ہیں جو خود اپنے آپ کو قانون و آئین کا پابند بنا لیتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ کائنات کی اساس ہی غیر متبدل قوانین پر ہے۔

امام اپنی تحریک کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے دوسرے اساسی رکن یعنی ختم نبوت کا اعلان بھی کر رہے تھے کہ توحید خالص کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کے بعد اطاعت کا حق اللہ ہی کے حکم سے اللہ کے رسولؐ کو ہے اور اب جب کہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اطاعت رسولؐ کا محفوظ ذریعہ سنت رسولؐ ہی ہے۔ اگر انسان ان دو اطاعتوں پر ایمان لے آئے تو پھر اسے نہ صرف زندگی کا اعلیٰ نصب العین میسر آ جاتا ہے بلکہ وہ خود منشائے ایزدی کا ایک رکن بن کر قانونِ الٰہی کے نفاذ کے عمل کا حصہ بن جاتا ہے۔

17- امام حسینؑ کے قیام کا ایک اور دلچسپ اور ایمان افروز پہلو یہ ہے کہ آپ کا عمل ناامیدی کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ یاس و ناامیدی وہ منفی عوامل ہیں جو انسان سے زندگی جیسا قیمتی جوہر چھین لیتے ہیں۔ یاس اور ناامیدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

یاس انسان کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے اور انسان نہ صرف اپنی سمت کھو بیٹھتا ہے بلکہ اپنے مقاصد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ یاس و ناامیدی انسان کو تنہا کر دیتی ہے۔ منزل ناآشنا شخص بھٹکتا پھرتا ہے اور بالآخر یاس و ناامیدی انسانی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ امید سے محروم ہو جانا ابلیسی صفت ہے اور ناامیدی انسان سے ایمان، عمل، صداقت، شجاعت کا جوہر چھین لیتی ہے۔ ناامیدی خوف و حزن کا پیش خیمہ بن کر انسان کی رگوں کا خون خشک کر دیتی ہے۔ یہ کیفیت سوہان روح ہوتی ہے۔ امام نے استقلال و جرأت کا مظاہرہ کیا، اپنے مقاصد و اہداف سے وفا کی، اپنے ایمان پر قائم رہے، اللہ تبارک تعالیٰ پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس کے مشن کو اپنایا اور اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ غیر اللہ کا خوف پاؤں کو آگے نہیں بڑھنے دیتا اور انسان اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ بھول جاتا ہے کہ انسان کی ممکنات حدود فراموش ہیں اور انسان کو جس انداز میں اللہ عزوجل نے صاحب ارادہ و اختیار بنایا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی قوتیں قیود و حدود کی محتاج نہیں ہیں جبکہ دلِ مومن میں نہ خوف ہوتا ہے نہ ہی حزن۔ اس کیفیت کو اقبالؔ اس طرح بیان کرتے ہیں

اے پریہا جوہر اندر قاف تو
ذوالفقار حیدر از اسلاف تو

یعنی تیرے وجود کے اندر عجیب و غریب جوہر پوشیدہ ہیں جس طرح کوہ قاف کی پریاں اور تو اس قدر عالی نسب ہے کہ علیؑ کی ذوالفقار تیرے آباؤ اجداد میں سے ہے۔

خوف اور شرک کے پہلو کو اقبالؔ ایک اور انداز میں بڑی عقیدت اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یعنی جس شخص نے تحریک مصطفوی کی رمز پہچان لی وہ اس راز کو جان گیا کہ خوف کے

اندر شرک کا پہلو چھپا ہوتا ہے۔ اقبال کے اس شعر کی روشنی میں امام حسینؑ کے موقف کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ توحید خالص کے موسس کی حیثیت میں کس مقام پر فائز ہیں۔

18- امام حسینؑ کے قیام کا ایک لطیف پہلو العصر یعنی زمانہ ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جس کی خدا نے قسم اٹھائی ہے۔ سورہ العصر 30/103/1-3 میں مذکور دراصل وہ زمانہ ہے جسے ہم ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر کے وقت کے نام سے یاد نہیں کر سکتے بلکہ یہ وہ زمان ہے جو اللہ کے سامنے ہے اور اس لحاظ سے انسان کے ارتقائی تسلسل کا گواہ بھی ہے، یہ عنصر خود انسان کے اپنے ضمیر کے اندر ہے اور اس وجہ سے ہی انسان صاحب ارادہ و خود مختار بن جاتا ہے۔ اسی لئے انسان لائق تکریم بھی ہے۔ اس داخلی صفت کی وجہ سے اللہ رب العزت نے اس زمان کی قسم کھائی ہے۔ وہ لوگ جو وقت کی قیود میں گھرے ہوتے ہیں وہ صاحب اختیار نہیں رہتے۔ صاحب اختیار تو وہ ہوتا ہے جو زمان پر سواری کرے۔ ان کیلئے دہر یعنی گزرنے والا وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ شہادت کے اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں نہ ماضی ہے، نہ حال ہے اور نہ ہی مستقبل ہے۔ امام کی شہادت حقیقتوں کی اصل حقیقت کی گواہی ہے۔ یہ گواہی اجتماعی ہے اور یہ شہادت کسی ایک لمحے کی پابند نہیں ہے۔ یہ گواہی اس حقیقی زمان کا حصہ ہے جو زندگی عطا کرتی ہے۔ وقت موت کا مژدہ سناتا ہے جبکہ زمان زندہ ہے اور زندگی کی نوید دیتا ہے۔ حسینؑ کی شہادت بھی اسی زماں کا حصہ ہے بلکہ حسینؑ اسی زمان کا مالک بن جاتا ہے اور زماں کی تلوار اس کے قبضہ قدرت میں آجاتی ہے۔ کبھی اس تلوار کو پتھر پر مارنے سے چشمے پھوٹتے ہیں اور کبھی اس عصا کی ضرب سے سمندر خشک ہو کر سیدنا موسیٰ کو راستہ فراہم کر دیتے ہیں۔ یہ زماں خود شمشیر بن جاتا ہے جو ہر باطل کو کاٹ کر حقیقت کو زندگی عطا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسی تصور کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے۔

پنجہ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوت او از ہمیں شمشیر بود

یعنی علی کے جس پنجہ نے خیبر کا دروازہ اکھاڑا تھا اس میں اسی تلوار کی وجہ سے طاقت آئی تھی۔ یہ طاقت زمان کی تلوار سے آتی ہے یعنی الزماں سیف یعنی زماں سیف ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضورؐ نے ایک بار فرمایا تھا۔

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ نبیٌّ مرسل و لا ملکٌ مقرب۔

یعنی مجھ پر ایسے لمحات بھی آتے ہیں اور مجھے اس انداز میں قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے کہ (اس تخلیہ یا لمحے) وہاں پر نہ کوئی نبی اور مرسل باریابی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی فرشتہ بارگاہ خداوندی میں موجود ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس کی ایک تعبیر معراج شریف کے انداز میں بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کی دوسری تعبیر ہم حدیث ہی کے ذریعہ کرتے ہیں کہ الحسین منی وانا من الحسین یعنی حسین مجھ سے ہے اور میں حسین میں سے ہوں لہٰذا اگر ہم حدود بشری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ جس طرح حضورؐ کا پیغام وقت کی حدود سے ماوراء ہے حضورؐ کی ذات زمانے کی قیود سے آزاد ہے اسی طرح الحسین منی کا مطلب بھی وقت کی حدود و قیود سے آزاد بن جاتا ہے اور اس میں ماضی، حال اور مستقبل نہیں اسی طرح ان کے مشن کا تسلسل، جو قیام حسینؑ کی شکل میں اُبھرا، آج بھی زندہ ہے اور کل بھی زندہ رہے گا کیونکہ وہ خود زماں کا مالک ہے اور وہ شہادت عظمیٰ جس کیلئے قرآن نے ذبح عظیم کی اصطلاح استعمال کی تھی، زندہ و پائندہ رہتی ہوئی وقت کی حدود و قیود سے آزاد ہو چکی ہے۔

-19 امام حسینؑ کی زندگی، تعلیمات اور قیام میں سورہ الفتح 26/48/29 کی اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تراھم رُکَّعًا سُجَّدًا والی کیفیت نظر آتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافرو ں پر سخت ہیں (لیکن) آپس میں رحم دل ہیں تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع و سجدے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر کے نشان نظر آتے ہیں، ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ ان کی مثال اس کھیتی جیسی ہے جس نے اپنا شگوفہ نکالا پھر

اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑ آئے۔ ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

اِس آیت مبارکہ کا ایک ایک جز جس طرح اصحاب المنتجبین اور شہدائے بدر و اُحد پر پورا اُترتا ہے اسی طرح اصحاب حسینؑ اور شہدائے کربلا پور پورا اُترتا ہے۔ اس آیت میں مومنین کی فضیلت، عظمت، نجات واخروی، مغفرت اور اجر عظیم کا ذکر تو ہے ہی لیکن اس میں منبر اور دار کا جو تعلق قائم کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس آیت مبارک میں رحم دلی اور اپنے موقف پر سختی سے قائم رہنے کی دو بظاہر متضاد کیفیات کو دیکھ کر ربّ العزت کی ان صفات کی طرف دھیان جاتا ہے جہاں ایک طرف اللہ تبارک تعالیٰ کی صفت رحیمی و کریمی و مغفرت ہے تو وہاں پر وہ ذات پاک جبار، قہار اور حساب لینے والا بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی رحمت کی صفت سب پر حاوی ہے اور اگر یہ صفت حاوی نہ ہوتی تو ایک لحظہ بھی کاروبار حیات نہ چل سکتا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے مشن کا ایک مطلب متوازن معاشرہ کا قیام تھا۔

امام حسینؑ کے وقت میں حالات یہ ہو گئے تھے کہ دربار سے منسلک لوگ آرام میں تھے جبکہ عوام لاوارث قرار پا چکے تھے۔ امام حسینؑ نے منیٰ میں 58 ہجری کے حج کے موقع پر خصوصی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کر کے معاشرتی عدم توازن اور عوام کی محرومیوں کو اہل علم کے سامنے پیش کر کے امداد طلب کی تھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حکومت کو ان مسائل کی طرف متوجہ کر دیا جائے تا کہ اگر وہ چاہے تو بہتری کی حالت پیدا کی جا سکے۔

عاجزی، انکساری، ظلم کو برداشت کرنا، حاکم کے سامنے حق بات نہ کہنا، حقوق بشری کے عدم تحفظ کو خاموشی سے برداشت کرنا، سرکاری حکام کی باز پرسی نہ کرنا، وسائل پیداوار کی غیر مساوی تقسیم پر اعتراض نہ کرنا ایسی باتیں ہیں جو شر اور فساد کو بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہیں اور انسان اس کا خاموش بن کر خدا اور رسول کا مجرم قرار پاتا ہے۔ مومن یہ روش اختیار نہیں کر سکتا

کیونکہ جب تک جان قربان کرنے کا عزم موجود نہ ہو تو منبر پر کی گئی باتیں محض وعظ ہی ہوگا جیسا کہ آج کل مساجد میں زبانی کلامی جمع خرچ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو رہی کیونکہ ہر طرف الفاظ کے انبار لگے ہوئے ہیں اور عمل کا مکمل فقدان ہے۔

20- امام حسینؑ کی عدیم المثال قربانی کو دیکھ کر بعض اوقات مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں یہ قربانی قبل از وقت تو نہیں تھی لیکن پھر میں اس خیال کو جھٹک دیتا ہوں کیونکہ اس قربانی سے نصف صدی پہلے اسلام مکمل ہو چکا تھا اور اسلام کی حقانیت کیلئے مومنین نے حضورؐ کی قیادت میں جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے اور اگر اسلامی تحریک کی عظیم قربانیوں کے باوجود حالت دگردوں ہو گئے تو کربلا کی قربانی کے بعد حالات کا درست نہ ہونا قابل فہم ہو جاتا ہے۔ ہر انقلاب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ لیکن انقلاب آتے ہی اس لئے ہیں کہ پراگندہ زمین میں صالح تخم ریزی کر دی جائے۔ جمود میں حرکت پیدا ہو۔ انقلاب بے جان ذرات میں زندگی کا بیج بوتے ہیں۔ انقلاب ہی انسان کو زندہ رکھنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ انقلاب کے بغیر زندگی ساکت ہو جائے۔ انسان کی خواہش ہے کہ اسے دائمی زندگی ملے۔ سورہ طہ 16/20/120 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

لیکن شیطان نے اسے وسوسہ ڈالا، کہنے لگا کیا میں تجھے دائمی زندگی
کا درخت اور بادشاہت (کارازنہ) بتلاؤں جو کبھی پرانی نہ ہو۔

قرآن پاک کے الفاظ ہیں لا یبلی یعنی نہ بوسیدہ ہونے والی زندگی اور بادشاہی۔ اس آیت کے فوراً بعد قابل غور بات یہ بیان ہوئی ہے کہ جب آدم کی توبہ قبول ہوئی تو ارشاد ربانی ہوا کہ تمہارے پاس میری ہدایت آتی رہے گی تو جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو بھٹکے گا اور نہ تکلیف اُٹھائے گا۔ بنابراں یہ انقلابات آتے رہے تا کہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر سیدھے راستے پر لگا دیا جائے۔

بنابراں قیامِ امام حسینؑ تاریخی تسلسل کا جزو لاینفک ہے اور یہی تقدیر الٰہی ہے۔

21- ہم نے کربلا کے حوالے سے اطاعت قوانین الٰہی و اطاعت سنت رسولؐ کا ذکر کیا ہے کیونکہ قیام حسینی کا اساسی نقطہ ہی اطاعت احکام الٰہی و سنت رسول تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم ایک اور وصف بھی ان پاک روحوں میں دیکھتے ہیں جو حسینؑ کی قیادت میں کربلا کے میدان کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ یہ عنصر ضبط نفس کا ہے۔ ضبط نفس کے بغیر نہ تو نظریات سے وابستگی ہوتی ہے اور نہ ہی خواہشات کو اعلیٰ مقاصد کے تابع رکھا جا سکتا ہے۔ ضبط نفس اطاعت کا تسلسل ہوتا ہے۔ ضبط نفس کا مطلب واضح ہے کہ متعلقہ شخص ضابطہ کا پابند ہو کر اطاعت شعار بن چکا ہے۔ ضبط نفس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اصل ہدف کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ مفاد عاجلہ کو مفاد دائمی کیلئے قربان نہیں کرتا۔ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے کہ مومنین کا امتحان جان مال اور اولاد کے نقصان سے لیا جائے گا۔ سورہ البقرہ 02/02/155 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور جو لوگ کامیاب ہیں وہ پکار اُٹھیں کے انا اللہ وانا الیہ راجعون! یہ ہے ضبط نفس کا مقام جس کا بھرپور مظاہرہ کربلا کے میدان میں ہوا۔ کیا سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کے گلے پر خنجر نہیں رکھا؟ کیا سیدنا موسیٰ نے اپنے عصا کو سمندر پر نہیں مارا تھا؟ کیا رسول اللہؐ نے تین سال شعب ابی طالب میں محصوری کے دن بسر نہیں کئے تھے؟ حسینؑ نے اتنی بڑی قربانی اسی ضبط نفس ہی کے جذبہ کے تحت دی تھی۔ یہ ضبط نفس طویل تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ غور و فکر کا ثمرہ ہوتا ہے۔ یہ حق و باطل کے تقابل کا فکری نتیجہ ہوتا ہے۔

امام حسینؑ کے قیام کے سلسلہ میں اطاعت و ضبط نفس کے ساتھ مرکزی قیادت کے کردار کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے اقبال لکھتے ہیں:

طاعتے سرمایۂ جمعیتے

رابط اوراق کتاب ملتے

یعنی اطاعت ایک جوہر ہے جو جماعت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اسی کی وجہ سے مرکز کی اطاعت میسر آتی ہے۔ اسی وجہ سے مرکزی قیادت کا کردار اُبھرتا ہے جو ایک ایک جوہر کو اکٹھا کر لکڑی کا ایک ایسا مضبوط مُٹھا بنا دیتا ہے جسے توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کتاب کے

اوراق کی جب تک جلد بندی نہ ہو کارآمد نہیں ہوتی اوراق منتشر ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اس شعر کے ذریعہ قوم کوفرقہ بندی کے خلاف پیغام بھی دیا ہے۔

مشاورت قرآنی تعلیمات کی بنیادی ہدایت ہے۔ سورہ شوریٰ 25/42/38 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ (امور ریاست یا اجتماعی امور میں) یہ لوگ یعنی مومنین کی جماعت: 1) اپنے ربؒ کا حکم مانتے ہیں۔ 2) نماز قائم کرتے ہیں۔ 3) اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں۔ 4) ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورہ ال عمران 04/03/159 میں جناب رسالتمآبؐ کو ہدایت ملی کہ اپنے اصحاب سے مشورہ کرلیا کریں۔ بعض کے نزدیک یہ حکم مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ جو حاکم مشورہ نہ کرے اسے معزول کر دینا چاہیے۔ بہر حال یہ مشورہ ان امور تک محدود ہو گا جہاں شریعت خاموش ہے۔

امام حسینؑ کو جو ماحول ملا اس میں حکومتی سطح پر عوامی مشورہ کا تصور ہی غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تو یہ صورتحال تھی کہ بادشاہ نے جو کہ دیا اسے ہر صورت پورا ہونا چاہیے۔ سورہ شوریٰ کی نص کے مطابق مشاورت کا حکم قطعی ہے اور جو بھی اس حکم الٰہی کو معطل کرے وہ اپنے عمل کا عوام کے سامنے جوابدہ ہو گا کیونکہ معاملہ عوام سے مشورہ کا ہے یعنی مشورہ کا حق مومنین کو دیا گیا ہے اور کسی حاکم کو یہ حق چھیننے کا اختیار نہیں ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر قرآن کا اہم تصور ہے۔ اس کو قائم کرنا امام کی ذمہ داری ہے۔ اس موضوع پر ہم نے ایک علیحدہ باب تشکیل دیا ہے جسے قارئین کرام پڑھ کر خود نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قیام حسینؑ میں اس اسلامی رکن کی کیا حیثیت تھی۔

ہم اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہیں گے کہ امام حسین کو ان رجحانات اور اسباب کی بیخ کنی کرنا تھی جو ملوکیت کے استحکام کیلئے اتحاد کر رہے تھے اور اس طرح اسلام کی انقلابی تعبیر میں تحریف کر رہے تھے۔ امام ذرائع پیداوار پر قابض طبقات کو متنبہ کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے مخلوق خدا کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہوا ہے۔ امام تکریم آدم کے قرآنی اصول کو اجاگر کر رہے تھے۔ امام عدل واحسان کے قرآنی اصول کے نفاذ کیلئے کوشاں تھے۔ امامؑ ترویج علوم

کے خواہش مند تھے۔ امام تفقہ فی الدین کے ضابطہ کو موثر بنانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اجتہاد کا حق مجتہدین کے پاس رہے تا کہ اسلام کو غلط تعبیروں سے بچایا جا سکے۔ امامؑ سیاست کو سمت عطا کرنا چاہتے تھے۔

ہم ان باتوں کا صرف اس مقصد کیلئے احاطہ کر رہے ہیں تا کہ ہم کربلا یعنی قیام حسینی یا تحریک حسین کے اہداف سے روشناس ہو سکیں۔ ہم ان معلومات کی روشنی میں اپنی زندگی کے معمولات کو بہتر نہج پر لا سکیں اور اپنی تربیت خود کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ذاتی محاسبہ ضروری ہوتا ہے لیکن اس کیلئے اپنے سامنے کوئی نمونہ رکھنا ہوتا ہے۔

ہمیں اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ سورہ البقرہ 01/02/34 نے انسان کو مسجود ملائکہ قرار دیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب کہ انسان قابل ذکر نہ تھا۔ اس کے سامنے کوئی ہدایت تھی اور نہ ہی کوئی معیار۔ خون خرابہ اس کا معمول تھا۔ پھر وقت آیا جب اللہ تبارک تعالیٰ نے خود انسان کو علم الاسماء سے آگاہ کیا یعنی اللہ عزوجل خود انسان کے پہلے معلم بنے اور اس علم ہی کی وجہ سے انسان ایک قلعہ میں داخل ہوا کہ ہدایت پانے کے بعد وہ محفوظ ہو گیا۔ انسان کی اس صلاحیت کو فرشتوں نے تعظیمی سجدہ کیا کیونکہ آزاد خود مختار ہونے کے باوجود مومنین نے اللہ کی اطاعت قبول کی۔

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنی کتاب حماسہ حسینی کی جلد سوم (مطبوعہ دارالشفاۃ اسلامیہ پاکستان) کے صفحات 213 لغایت 234 تک ''ماہیت قیام حسینی کی یادداشت'' کے عنوان سے بعض سوال اُٹھائے ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ ان سوالات کا احاطہ کرتے ہیں۔ 1- عاشورا کے حادثہ کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ بے مقصد اقدام تھا؟ یا اپنے دور کی مناسبت سے ہوش مندانہ اقدام تھا؟ کیا یہ ایک مقدس قیام تھا، یا انقلاب تھا یا شرافت مندانہ دفاع تھا؟ آیا یہ حادثہ اثبات کی نوعیت کا حادثہ تھا یا مخالف فریق کا انکار اور اس کی نفی کرنے کی نوعیت کا حادثہ تھا۔

کربلا کے اس حادثہ میں گوناگوں عوامل دخل رکھتے تھے۔ درحقیقت اس قیام کا ہر زاویہ ایک خاص ماہیت کا حامل ہے۔ بعض عوامل جو اس قیام میں درپیش رہے ہیں مندرجہ

ذیل ہیں۔

1- امام حسین منصوص من اللہ تھے اور خلافت کے لائق تھے اور خلافت کے وارث بھی تھے۔ فقط خلافت کے لائق و وارث ہونا اور امامت کا معنوی مقام رکھنا امام کو اس سلسلے میں اقدام کرنے کا ذمہ دار نہیں بنا دیتا۔ حضرت علیؑ نے خلافت کے لائق ہونے کے باوجود صلح و آشتی کی راہ کو اختیار کیا تا کہ مسلمانوں کے امور درست رہیں اور ظلم صرف ان کی ذات تک محدود رہے۔

i- یزید امام سے ہر قیمت پر بیعت لینا چاہتا تھا۔

ii- بیعت سے انکار کے بعد اہل کوفہ نے آپ کو دعوت دی۔

iii- بعض حالات میں اسلام کا اصول امر بالمعروف و نہی عن المنکر مسلمان پر واجب ہو جاتا ہے۔

iv- امام شہید ہونے کیلئے آمادہ تھے لیکن بیعت کیلئے تیار نہ تھے۔ امام یہ فریضہ ملک کی حدود پر یا باہر بھی انجام دے سکتے تھے اگر ان کا وظیفہ انکار بیعت تھا۔

v- خلافت کو موروثی بنانے کا موضوع ابوسفیان کی دیرینہ آرزو تھی۔ امام نے امیر معاویہؓ کو ایک خط میں لکھا تھا: میں خدا سے ڈرتا ہوں اس بات پر کہ میں تمہارے خلاف قیام نہیں کر رہا ہوں اور اس سلسلے میں خدا کے حضور جوابدہ ہوں۔

راقم الحروف اس مقام پر کہنا چاہتا ہے کہ امام نے نہ صرف امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں مدینہ یا مسلم ریاست سے دور دراز علاقوں کی طرف نہ ہجرت فرمائی اور نہ ہی سرحدی علاقوں میں بیٹھ کر خاموشی سے تحریک شروع کی بلکہ آپ نے صلح امام حسنؑ کے معاہدہ کا انتظار کیا اور جب امیر معاویہؓ نے ولی عہدی کا اعلان کر دیا تو پھر 58 ہجری میں حج کے موقع پر منیٰ کے مقام پر ایک بین الاقوامی حج کانفرنس منعقد کر کے احتجاجی تحریک کی بنیاد رکھی اور ہم عصر دانشوروں کے سامنے حالات کا تجزیہ پیش کر کے ہر صاحب الرائے کو اس کی ذمہ داری اور اپنی ذمہ داری بطور وارث رسولؐ کی طرف متوجہ کیا۔ اس کانفرنس کے نتیجہ میں آپ کی نگرانی کڑی کر دی گئی ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ یزید نے اپنے والد کی وفات کے بعد

شدت سے بیعت کا مطالبہ کیا تھا تا کہ امام کوئی تحریک نہ چلا سکیں نہ ہی انہیں تحریک منظّم کرنے کیلئے وقت دیا جائے۔

v- امام نے ایک شخص کے سوال میں فرمایا کہ ان لوگوں نے مجھے وحشت زدہ کیا ہے اور یہ کوفہ والوں کے دعوت نامے ہیں جواب میرے قتل پر کمر بستہ ہیں۔ جب یہ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر لیں گے تو پھر کسی بھی حرمت کی ہتک سے باز نہ آئیں گے اور اس وقت خدا ایسے کو ان پر مسلط کر دے گا جو ان سب کو قتل کر دے گا یہاں تک کہ یہ لوگ حیض کے کپڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے۔

امام نے روزِ عاشور دشمن کی فوج کو آزمائشوں کے بارے میں متنبہ کیا اور عمر سعد سے فرمایا کہ خدا کی قسم رے کی حکومت تجھے نصیب نہ ہو گی۔

vii- اہل کوفہ کی دعوت کس لئے تھی؟ قطعی طور پر زمام حکومت پر قبضہ کرنے، صاحب قدرت ہونے اور کوفہ کو مرکز بنانے کی خاطر تھی؟ دراصل امام کو جتنے خطوط ملے تھے ان کی وجہ سے امام پر قیادت کی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی جس طرح حضرت علیؑ کو حضرت عثمان کی شہادت کے بعد لوگوں نے خلیفہ بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

viii- امام کی مکہ سے کوفہ کی طرف حرکت صرف اہل کوفہ کے دعوت ناموں کی وجہ سے نہ تھی بلکہ امام کا مکہ میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ امام نے مکہ سے نکلتے وقت سیدنا موسیؑ کی دُعا پڑھی تھی جس کا پس منظر یہ تھا کہ حکومت کے کارندوں نے سیدنا موسیٰ کے قتل کی سازش مکمل کر لی ہے۔ حاکم امام کو چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ پاگل کتوں کی طرح ان کے سروں میں کاٹنے، چیڑ پھاڑ کرنے کی دُھن سوار تھی۔ ان کیلئے واحد قطرہ ذاتِ حسینؑ تھی۔ انہیں کسی اور کسی پرواہ نہ تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف ریاست کی ساری مشینری ہے اور دوسری طرف نواسۂ رسولؐ کی اکیلی ذات۔

دوسری اہم وجہ امام نے ابو ہرۃ ازدی کے جواب میں فرمائی

''بنو امیہ نے میرا مال غضب کیا میں نے صبر کیا، میری عزت وآبرو پر حملہ کیا، میں نے صبر کیا۔ اب وہ میرا خون بہانا چاہتے ہیں اس لئے میں

(مکہ سے) نکل پڑا ہوں۔ اسی طرح کا جواب فرزدق کو دیا کہ اگر میں جلدی نہ کرتا تو پکڑ لیا جاتا۔ تاریخ میں رقم ہے کہ عمر بن سعید بن العاص کو تقریباً 30 شیاطین نفس انسانوں کے ساتھ امام کے مکہ کے قیام کے دوران قتل پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس نے یزید کو خط لکھ کر ملامت کی کہ تم نے حسینؑ کو مجبور کر کے حرم الٰہی سے خارج کیا۔ امامؑ کو جب راستے میں حضرت مسلم کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ نے قرآن پاک کی درج ذیل آیت کی تلاوت فرمائی:

"من المومنین رجال صدقوا ماعاھدو اللّٰہ علیہ"

"یعنی مومنین میں سے ایسے بھی مردمیدان ہیں جنہوں اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر دکھایا ہے۔" سورہ الاحزاب 21/33/23

اِس صورت حال کے پیش نظر امامؑ کا کوفہ جانے کا مطلب خلافت کا حصول نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوفہ کو اپنی تحریک کا مرکز بنانے کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ راقم الحروف سمجھتا ہے کہ عسکری دستوں کے ہمراہ حر کی جانب سے امامؑ کا راستہ کو روکنے کا مطلب یہی تھا کہ نہ صرف امامؑ کوفہ نہ پہنچنے پائیں بلکہ امامؑ اور ان کے اہل بیتؑ انصار و اصحاب کو ہر قسم کے وسائل سے محروم اور سخت جگہ پر اترنے پر مجبور کیا جائے جہاں اس مختصر سے قافلہ کو چند گھنٹوں کے اندر ختم کیا جا سکنا آسان ہو۔ بنابریں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ امام کو کوفہ والوں پر اعتماد نہ تھا اور اگر تھا تو وہ ختم ہو چکا تھا جیسا کہ آپ کے مختلف جوابات سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے اثنائے راہ فرمایا کہ جو کام ہونا ہے مجھ سے مخفی نہیں ...... موت فرزند آدم کیلئے حتمی ہے...... دُنیا کی پستی یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے مبارک سر کو بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کیلئے بطور ہدیہ بھیجا گیا۔

X- امام نے واپس جانے کا اعلان بھی کیا لیکن آپ کو دشمن کی فوج نے واپس نہ جانے دیا۔ واپسی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انکار بیعت کے اصولی موقف یا امر و نہی کے فریضہ سے انحراف تھا۔

اس کے بعد آیت اللہ شہید مطہری بعض سوالات پیش کرتے ہیں جنہیں ہم مکمل طور پر قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ یہ سوالات شہید مطہری کی کتاب حماسہ حسینی کی جلد سوم کے صفحات 235 سے 239 تک اور پھر قیام حسینی سے متعلق یادداشت صفحہ 240 سے 266 میں درج ہیں جو کہ اپنی جگہ غور طلب ہیں۔

بہر حال ان صفحات کو پڑھنے سے راقم اپنے قارئین کے سامنے یہ سوال پیش کرتا ہے کہ کیا قرآن وسنت کے معیار کے مطابق خلافت علی منہاج النبوۃ کے عہدے کیلئے یزید مناسب تھا۔ کیا اصحاب، تابعین اور اہم فقہا کی موجودگی میں حق حکومت یزید کو دیا جاسکتا تھا؟ اب آپ مطہری صاحب کا موقف بھی پڑھ لیں۔

نہضت حسینیؑ سے متعلق سوالات

1- ''آیا قیام حسینی ایک انفجار تھا یا ایک جانا بوجھا مصمم ارادہ کے تحت اٹھایا گیا اقدام؟ دوسری صورت میں آیا یہ حکومت کے خلاف ایک ابتدائی شورش اور انقلاب تھا یا حکومت کے مقابل ایک قسم کا دفاع اور مقاومت؟ اور یہاں دوسری صورت میں آیا یہ مقاومت اس لئے تھی کہ وہ لوگ آپؑ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر یہ مقاومت ان کے بیعت کے تقاضے سے مقابل میں تھی؟ اگر یہ انقلاب ابتدائی تھا تو انقلاب کی بنیاد کوفہ کے لوگوں کی دعوت تھی یا یہ کہ اگر کوفہ کے لوگ دعوت نہ بھی دیتے، تب بھی آپؑ قیام کرتے؟

2- ''آیا امام حسینؑ جانتے تھے کہ آپؑ شہید کردیئے جائیں گے (علم امام کے ذریعے یا قطعی قرائن کے ذریعے) یا نہیں جانتے تھے اور یقین نہیں تھا کہ شہید ہو جائیں گے؟ دوسری صورت میں اگر جان لیتے تو کسی اور طریقہ سے پیش آتے یا اسی طرح پیش آتے کہ جس طرح آپؑ پیش آئے؟ اور نتیجتاً آیا یہ جاننے کے بعد کہ شہید کردیئے جائیں گے جو کچھ انجام دیا اس پر پشیمان ہوئے یا نہیں؟

3- ''آیا امام حسینؑ نے کربلا کے قصد سے (اور قہراً اپنی مخصوص قربانگاہ کی قصد سے)

حرکت کی یا بالفرض شہید ہونے کے قصد سے حرکت تو کی، لیکن آپؑ کا مقصد خصوصی طور پر کربلا نہیں تھا؟ اگر آپؑ کا قصد کربلا کا نہیں تھا تو پھر کہاں کا قصد رکھتے تھے؟ آیا آپؑ کا قصد عراق کا تھا کہ جو مسلمانوں کی فوج چھاؤنی اور شیعوں کا مرکز تھا کہ اس جگہ کو مرکز قرار دیں یا پھر آپؑ کسی معیّن جگہ کا قصد نہیں رکھتے تھے، بس فقط حجاز میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ یا شاید شام جانے کی فکر میں تھے؟ پس اگر آپؑ کا قصد کربلا کا نہ تھا تو آیا آپؑ جانتے تھے کہ کسی بھی صورت میں اس سفر میں شہید ہونا ہے یا نہیں جانتے تھے؟

-4 ''آیا امام حسینؑ نے صلح کی پیشکش کی یا نہیں؟ دوسری صورت میں آیا مقابل کی طرف سے صلح کی پیشکش آئی اور آپ نے اس کو ردّ فرمایا یا کوئی پیش کش آئی ہی نہیں؟ اگر ہم فرض کریں کہ آپؑ نے صلح کی پیش کش کی تو اس صورت میں آپؑ کے اور امام حسنؑ کے درمیان کوئی بھی فرق نہیں، فرق آپؑ کے مقابل والوں میں ہے کہ معاویہؓ نے صلح کو قبول کیا لیکن یزید نے قبول نہ کیا اور اگر حسینؑ نے صلح کی پیشکش کی تو ابتداء ہی سے کیوں بیعت نہ کی؟ آقائے (صالحی) نجف آبادی اس بات کے معتقد ہیں کہ امام نے پانچ مرتبہ صلح کی پیشکش کی۔

-5 ''اگر امام حسینؑ نے صلح کی پیشکش نہیں کی اور نہ ہی دوسری طرف سے صلح کی پیشکش کو قبول کیا تو اس کی علت کیا تھی اور اگر ایسا تھا تو پھر امام حسنؑ نے کیوں صلح کو قبول کیا؟

-6 ''آیا جملہ ''ان اللّٰہ شاء ان یراک قتیلاً'' خدا آپ کو شہید دیکھنا چاہتا ہے'' صحیح ہوسکتا ہے یا نہیں۔''

-7 ''آخر کیوں امام حسینؑ نے تقاضائے بیعت کے مقابل اس حد تک مقاوت کی؟ امیر المومنینؑ اور دیگر آئمہ طاہرینؑ نے تو اس تقاضے کے مقابل اس قدر مقاوت نہیں کی تھی۔ آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی بیعت اکثریت کے تسلیم ہو جانے کی بناء پر تھی، اگر چہ مخلوط اکثریت ہی سہی لیکن امام حسینؑ سے جس بیعت کا

تقاضا کیا جارہا تھا، وہ ولی عہدی کی رسم کو تسلیم کرنا تھی؟

8- ''آیا بیعت اور صلح کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟ آیا یہ کہنا صحیح ہے کہ بیعت خاص شرائط کی موجودگی میں جائز نہیں ہوا کرتی کیونکہ بیعت تائید کرنے اور دستخط کرنے کے مترادف ہے؟ لیکن صلح اس لئے جائز ہے کہ یہ عام طور پر دو متخاصم کے درمیان واقع ہوتی ہے اور یہ کسی قسم کی تائید کا مفہوم نہیں رکھتی۔ بلکہ صلح ہوتی ہی وہیں ہے، جہاں دو اشخاص کے درمیان جھگڑا ہو پس آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام حسینؑ بیعت کیلئے راضی نہیں تھے لیکن ایک فرد متخاصم کی صورت صلح کیلئے حاضر تھے؟

9- ''آیا ہمارے پاس کوئی ایسے قرآئن ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ امام حسینؑ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہاں تھے؟ یا فقط بیعت سے انکار کر رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے داعی تھے؟ ہمارے عقیدہ کے مطابق اہل کوفہ کے خطوط پر آپؑ کا عکس العمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ حکومت اور زعامت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہاں تھے۔ ''حضرت مسلم'' بھی اسی قسم کے کام کیلئے کوفہ آئے تھے۔

اس سوال کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا آپؑ کا مکہ جانا صرف بیعت سے انکار کی وجہ سے تھا یا اسلئے تھا کہ وہاں پر جا کر حکومت بنانے کیلئے زیادہ فوج جمع کر سکیں اور زیادہ فعالیت پیدا کر سکیں؟

10- ''آیا امام سجادؑ نے واقعۂ ''حرہ'' میں مسلم بن عقبہ کے ذریعے یزید کی بیعت کی تھی؟

11- ''ایک سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوا کہ حر اور عمر سعد کی فوج کے مدمقابل ہونے کے بعد ہمیشہ امامؑ اپنی پیشکشوں کے ضمن میں، حجاز واپس جانے کا دلی ارادہ ظاہر کرتے ہیں؟

12- ''آیا حر اور عمر سعد کے مدمقابل ہونے کے بعد امامؑ کی مدینہ واپس جانے کی پیشکش اپنے انقلاب کے دامن کو توسیع دینے اور پھیلانے کیلئے تھی؟

13- ''اگر امامؑ حکومت کے خلاف انقلاب اور شورش کا قصد نہیں رکھتے تھے تو پھر بصرہ کے

لوگوں کو کیوں دعوت دی اور کیوں انہیں خط لکھے؟

''آیا حسینؑ بن علیؑ کا اقدام بیعت سے فرار کی بناء پر تھا یا اہل کوفہ کی دعوت کے جواب میں تھا یا پھر یہ قیام اور نہضت آج کل کے بقول ''انقلاب تھا''؟ آیا آپؑ جانتے تھے کہ شہید ہو جائیں گے، یا نہیں جانتے تھے؟ آیا کسی منصوبہ کے تحت کام کر رہے تھے یا جب مسائل کا سامنا ہوتا، تب ان کیلئے جداگانہ عزم کرتے تھے؟ کیوں آپ کبھی اپنے ساتھیوں کو چلے جانے کو کہتے اور کبھی ساتھیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی مدد و یاوری کیلئے طلب کرتے؟ حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سننے کے بعد آپؑ نے اپنے ساتھیوں سے چلے جانے کی بات کی اور خود کو تنہا چھوڑ دینے کے بارے میں کہا جبکہ عبیداللہ بن حر جعفی، زہیر بن القین اور ضحاک بن عبداللہ مشرقی کو اپنی یاوری اور مدد کیلئے طلب کیا حتیٰ کہ ضحاک بن عبداللہ کی پیشکش قبول کی کہ آخری وقت تک آپؑ کی یاری کریں اور بعد میں چلے جائیں۔

''شب عاشورہ ایک طرف آپؑ نے اپنے تمام خاندان اور ساتھیوں کو رخصت دے دی اور ان پر سے بیعت اٹھانے کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف اسی رات اپنی مدد کیلئے قبیلۂ بنو اسد کو بلانے کیلئے حبیب ابن مظاہر کو بھیجا جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ فوق العادت خطرہ والا کام کر بیٹھا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے گا، پھر کیوں وہ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر جاتا ہے؟ بعض لوگ اس اقدام کو بلا منصوبہ اور تدریجی گمان کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق امامؑ کے اقدام کا آغاز انکارِ بیعت سے ہوا اور مکہ جو امن و امان کی جگہ ہے امامؑ اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں پناہ گزین ہوئے۔ بعد میں دو باتیں مکہ سے خروج کا سبب بنیں۔ ایک کعبہ کی حرمت ختم ہونے کا خوف اور دوسرے اہل کوفہ کی دعوت۔ حضرت مسلمؓ کی شکست کی خبر جب امامؑ کو عراق کی سرحد پر پہنچتے ہی ملی تو امامؑ وہاں سے واپس جانا چاہتے تھے لیکن واپس نہیں جا سکے، کربلا میں گرفتار ہوئے اور شہید ہو گئے۔

''بعض نے کہا کہ امام نہیں جانتے تھے کہ شہید ہو جائیں گے، وگرنہ آپؑ ایسا اقدام نہ کرتے۔ امامؑ کو یقین نہ تھا کہ رسولِ خداؐ سے اس قدر نزدیک کی قرابت ہونے کے باوجود

شہید کر دیئے جائیں گے۔ اس کے برعکس بعض نے کہا ہے کہ امامؑ کو یقین تھا کہ کسی بھی صورت میں آپؑ شہید کر دیئے جائیں گے، لہٰذا عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ آقائے غفاری خود کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا یہ اقدام ایک قیام ونہضت اور ایک انقلاب تھا۔ معاویہؓ کے دور میں کچھ ایسے عوامل وقوع پذیر ہوئے تھے جن کے سبب امامؑ پر قیام اور نہضت واجب ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ہمارے پاس بہت سے قرائن اور شواہد ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ امامؑ اسی زمانے سے اپنے قیام کے مقدمات کو فراہم کر رہے تھے۔

ہم ان مقدمات کو نہضت حسینی کی یادداشت کے نمبر 38 میں بیان کریں گے۔

قیام حسینیؑ سے متعلق یادداشت

1- ''آقائے صالحی نجف آبادی اپنی کتاب ''شہید جاوید'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ''حادثۂ کربلا کے موضوع میں دو قسم کے اظہارِ نظر ہوئے ہیں، ایک میں افراط کا پہلو نمایاں ہے جبکہ دوسرا تفریط کا شکار ہوا ہے۔ ایک گروہ اس خیال کا حامل ہے کہ قیام حسینی ایک خام انقلاب، ایک بے سمجھی بوجھی شورش اور ایک اچانک انقلاب ہے جس کی عقوبت پر غور نہیں کیا گیا تھا اور جس نے تمام جامعہ کے نظم ونسق کو درہم برہم کر دیا تھا۔ حکومت عومی نظم ونسق کو برقرار رکھنے کیلئے اس قیام کو کچلنے پر مجبور تھی اور اس نے پیغمبر اکرمؐ کے دستور کے مطابق کہ جو بھی امت اسلام کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہے اس کی سرکوبی تلوار سے کرنا چاہیے، ان کو کچل دیا۔

دوسرے گروہ کا تجزیہ افراط کا شکار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ نے کسی خاص حکم کے تحت جو خود ان کیلئے مخصوص تھا، اپنے آپ کو شہادت کیلئے پیش کیا اور اس قضیہ کے راز کو کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

اگر ہم بالفرض پہلے گروہ کے قول کے مطابق انقلاب حسینی کو خام اور بے سمجھی بوجھی شورش قرار دیں، تب بھی کوئی دلیل نہیں بنتی کہ ہم اس کو عمومی نظم ونسق برباد کرنے والی شورش

وہنگامہ قرار دیں اوران کے مخالفین کے اعمال کو صحیح مان لیں کیونکہ جب حکومت فاسد ہواور اہل حق فقط امکانات کے نہ ہونے کی وجہ سے قیام نہ کرتے ہوں ،تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ قیام کرنے کی صورت میں ان کو شہید کرنا حاکم کی نظر سے جائز سمجھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی ہے۔وہ یہ کہ امام حسینؑ نے اسلام کے کلی دساتیر کے مطابق قیام کیا تھا۔اس طرح کے قیام کیلئے یہ شرط نہیں ہوتی کہ خاص ماحول فراہم ہواور اقدام قطعی بارآور ہوتو ہی قیام کیا جائے بلکہ ایسے مواقع پر بارآور ہونے کا احتمال ہی کافی ہے۔علاوہ برایں اگر بارآور نہ بھی ہوتو اس سے اسلام پر کوئی ضرر بھی نہیں پڑتا تھی بلکہ اس قیام نے تو جامعہ کو ثمر اور نتیجہ کی طرف ایک قدم نزدیک تر کیا ہے۔خود امامؑ کے کلمات سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔مکہ سے خروج کے وقت فرزدق شاعر کی بات کے جواب میں امامؑ نے جوفرمایا اس سے یہ بات آشکار ہے۔آپؑ نے فرمایا''وان حال القضاء دون الرجاء فلن یتعدمن کان الحق نیته و التقوی سریرته۔''اگر قضاوقدر الٰہی ہماری آرزوؤں تک پہنچنے میں حائل ہے، البتہ جس کی نیت حق ہواور جس کا باطن تقویٰ سے آراستہ ہو، وہ متجاوز شمار نہیں ہوتا۔''

چوتھی صورت یہ ہے کہ امامؑ نے شہید ہونے کا علم رکھنے کے باوجود قیام کیا۔البتہ شہادت کے علم ہونے کا قیام کے بے ثمر اور بلانتیجہ رہ جانے کے علم رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی تعلق نہیں۔اگر قیام کا مقصد فقط حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوتو شہید ہونے کے بعد نہضت بے ثمر رہ جاتی ہے لیکن اگر ہدف و مقصد بنوامیہ کی حکومت کو متزلزل کرنا ہو، ان کو اسلام سے جدا کرنا ہواور امر بہ معروف اور نہی از منکر کو زندہ کرنا ہوتو اس وقت شہادت بے فائدہ اور بلانتیجہ نہیں ہوا کرتی۔

اگر اس قیام کے نتیجہ میں بعد میں جو دوسرے بہت سے قیام ووقوع پذیر ہوئے ، یہ نہ ہوتے تو اسلام اور بنوامیہ آپس میں اس قدر محلول ہو جاتے کہ ان کا جدا کرنا پھر ممکن نہیں ہوتا اور بنوامیہ کے زوال کے ساتھ اسلام بھی ختم ہو جاتا۔

2- قیام حسینؑ بن علیؑ کی علتوں کے بارے میں جب بحث چھڑ جاتی ہے تو کبھی بحث کا

عنوان امامؑ ہوتے ہیں کہ آپؑ کی تحریک کے کیا محرکات تھے؟ اور کبھی بحث کا عنوان آپ کے دشمن ہوتے ہیں کہ ان کی طرف سے حسینؑ بن علیؑ پر دباؤ ڈالنے اور فشار پیدا کرنے والی کیا وجہ تھی؟ آقائے صالحی دباؤ ڈالنے کا سبب تین چیزیں بتاتے ہیں۔

الف: حسینؑ سے بیعت لے کر اپنی حکومت کو مستحکم کرنا: امامؑ کی بیعت یزید کیلئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور آپؑ کا بیعت نہ کرنا اس کیلئے بہت مضر رساں تھا۔ اس وقت کے حالات میں امامؑ کا بیعت نہ کرنا اور ایک استبدادی حکومت جو بیس سال سے حکومت کر رہی تھی، اس کا سقوط پذیر ہونا بہت زیادہ اضطراب کی بات تھی۔

ب: عقدۂ حقارت: امامؑ کا سر مبارک جب یزید کے سامنے لایا گیا، اس وقت یزید کا تحقیر آمیز رویہ اس کے سخن سے ظاہر ہے کہ اس نے اس آیت سے تمسک کیا: قل اللهم مالک الملک۔ (سورۂ آل عمران 26)

ج: وہ انتقامی جذبہ جو بنو ہاشم اور بنو امیہ کے گزشتہ واقعات سے مربوط ہے: ہند کی جگر خواری اور طول تاریخ میں ابوسفیان کے مختلف عکس العمل اس بات کے گواہ ہیں۔ جنگ بدر بنو امیہ کے دلوں میں ایک کینہ وجود میں لایا تھا۔ یزید کے یہ اشعار اس بات کے گواہ ہیں:

لیت اشیاخی بِبدرٍ شَہِدوا......: ''کاش ہمارے بدر میں مرنے والے بزرگ آج ہوتے اور یہ ماجرا دیکھتے۔''

3- معاویہؓ کے بعد امام حسینؑ کی وضع اور اہل کوفہ کی آپؑ کی بیعت کیلئے فریاد اور مدد طلبی اور قتل عثمانؓ کے بعد حضرت امیرؑ کے حالات اور لوگوں کا اُن کی بیعت کیلئے مطالبہ۔ ان دونوں بظاہر ایک جیسی صورتحال کا موازنہ اور دونوں ادوار کے لوگوں کا آپس میں موازنہ۔

4- آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے کسی قیام کی ابتداء کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں شکست کا احتمال کامیابی کے احتمال سے کم ہو، ورنہ ابتدائی قیام جائز نہیں۔ اس

کے برعکس دفاعی قیام، خواہ اس میں موافق ہونے کا احتمال کتنا ہی کم ہو، جائز ہے۔
انہوں نے قیام کے جواز کو احتمال کی جہت میں ذکر کیا ہے کہ اگر زیادہ گمان ہو تو جائز ہے وگرنہ جائز نہیں۔ لیکن اس صورت میں جب احتمال کا رُخ موافقت میں زیادہ ہو، فقط جب ہی محتمل کی جانب قیام زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں بعض گمان کرتے ہیں کہ اگر کامیابی کا احتمال نوے فیصد بھی ہو اور ناکامی کا احتمال دس فیصد ہو، پھر بھی اقدام جائز نہیں جبکہ بعض سمجھتے ہیں کہ اگرچہ کامیابی کا احتمال حد سے زیادہ ضعیف ہو، پھر بھی قیام جائز ہے۔

5- آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے امامؑ کا قیام دستگاہ حکومت پر ہجوم سے شروع ہوا اور اس کے چار مرحلے ہیں:

الف: مکہ کیلئے نکلنے کے مصمم ارادہ سے لیکر مکہ میں قیام تک۔

ب: کوفہ جانے کے ارادہ سے لیکر حر ریاحی کے مدمقابل ہونے تک۔

ج: حُر کے مدمقابل ہونے سے لے کر جنگ شروع ہونے تک۔

د: جنگ کا مرحلہ۔

ان چاروں مراحل میں سے پہلا، تیسرا اور چوتھا دفاعی مراحل تھے اور دوسرا مرحلہ نیم دفاعی اور نیم ابتدائی تھا۔

6- آقای صالحی اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 64 (خطی نسخہ) میں اس بات کے مدعی ہیں کہ امامؑ تقاضائے بیعت سے پہلے مخالفت کا قصد نہیں رکھتے تھے۔ گویا اگر آپؑ سے بیعت کا تقاضا نہ کیا جاتا تو آپ ہرگز قیام نہ کرتے۔ جیسا کہ معاویہؓ کے دور میں آپؑ نے قیام نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خط کہ جو کتاب ''رجال کشی'' طبع نجف کے صفحہ 49 پر اور کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' کے ج 1، ص 181 پر نقل ہے، جس کے آخر میں امامؑ نے تحریر کیا: ''وما اریدلک حرباً ولا علیک خلافاً سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے اور دونوں حکومتوں یعنی معاویہ اور یزید کی حکومت میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو قیام کے لحاظ سے دونوں حکومتوں کے درمیان فرق تھا۔ یزید کی حکومت ایک نو بنیاد حکومت تھی اور اس کے مقابل میں سکوت اور خاموشی سستی اور دوُر خا پن شمار ہوتی، جبکہ معاویہؓ کی حکومت اس کے برعکس تھی۔ اس کے علاوہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی دونوں حکومتوں کے مابین فرق تھا۔ یزید کی حکومت کے برخلاف معاویہؓ کی حکومت خلافِ اصول مگر عاقلانہ حکومت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یزید کی حکومت معاویہؓ کی حکومت کی نسبت زیادہ مسیحیوں کے زیر اثر تھی۔ یہ بات کہ اگر تقاضائے بیعت نہ ہوتا تو امامؑ قیام نہ کرتے، خود امام کے اس فرمان کے منافی ہے، جس میں آپؑ نے فرمایا۔ ''و علی السلام السلام اذقدبلیتِ الامة براعٍ مِثلِ یزید۔'' اگر امت یزید جیسے کی حکومت میں گرفتار ہو، اس وقت اسلام پر میرا اسلام ہو۔'' یہ قول خود آقای صالحی کی کتاب کے صفحہ 36 پر مقتل خوارزمی کی جلد 1 ص 184 سے نقل ہے۔

امامؑ کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ یزید کی حکومت کو معاویہؓ کی حکومت سے مختلف اور متفاوت جانتے ہیں۔

7- آقای صالحی اپنی کتاب کے ص 67 پر ''مقتل خوارزمی'' سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے محمد بن حنفیہ سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا ''لولم یکن فی الدنیا ملجأ ولاماٰ وی لما بایعت یزید بن معاویہ۔'' اگر دُنیا میں میرے لئے کوئی بھی پناہ گاہ نہ ہو، تب بھی میں یزید بن معاویہ کے ہاتھوں بیعت نہیں کروں گا۔'' آپؑ کا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ آپؑ بیعت نہ کرنے کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے۔ امامؑ کا یہ قول آخری ایام میں امامؑ کے بیعت کیلئے تیار ہو جانے والی آقائے صالحی کی بات سے صاف تضاد رکھتا ہے۔

8- آقای صالحی نے اپنی کتاب کے ص 70 پر امامؑ کے مدینہ سے مکہ کی طرف خروج کا، پیغمبر اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف خفیہ ہجرت سے موازنہ کا ہے۔

9- آقای صالحی کی کتاب میں دو مطالب بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک ممکن ہو خون نہیں بہانا چاہیے اور امن و امان کی حفاظت کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ ہے

کہ کامیابی کا انحصار حکومت کی تبدیلی اور عنان حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینے میں ہے۔

10- اپنی کتاب کے ص 76 پر ''مقتل خوارزمی'' کے صفحہ 76 سے آقائے صالحی نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے ابن عباس کے جواب میں فرمایا: ''**یا ابن عباس فما تقول فی قوم اخرجوا ابن بنت رسول اللہ من وطنہ و دارہ و موضع قرارہ و مولدہ و حرم رسولہ و مجاورۃ قبرہ و مسجدہ و موضع مھاجرتہ، و ترکوہ خائفاً مرعوباً لایستقرفی قرار و لا یأوی الی وطن بذلک قَتلَہُ و سفکَ دَمِہِ.**'' ''اے ابن عباس کیا کہتے ہو اس قوم کے متعلق جس نے اپنی نبیؐ کی بیٹی کے فرزند کو اس کے وطن، اس کے گھر، اس کی منزل، اس کی جائے پیدائش سے، حرم رسولؐ سے، اس کے نانا کی قبر کی مجاوری سے، پیغمبرؐ کی مسجد اور موضع ہجرت سے نکال باہر کیا اور اس کو مرعوب اور خائف کیا۔ اب نہ تو وہ کسی مقام پر ٹھہر سکتا ہے اور نہ کسی جگہ پناہ لے سکتا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس طرح سے اس کو قتل کریں اور اس کا خون بہائیں۔''

11- آقای صالحی اپنی کتاب کے 79 پر تاریخ یعقوبی کی جلد۲، ص ۲۳۵ سے نقل کرتے ہیں کہ یزید نے ابن عباس کو ابن زبیر کے ہاتھوں بیعت نہ کرنے پر جو تشکر آمیز خط لکھا تھا اس کے جواب میں ابن عباس نے لکھا ''**و ما انس من الاشیاء فلست بناس اطرادک الحسین بن علی من حرم رسول اللہ الی حرم اللہ و دمک الیہ الرجال تغتالہ فاشخصتہُ من حرم اللہ الیٰ الکوفہ۔**'' یعنی میں سب چیزوں کو اگر بھول بھی جاؤں تو اس چیز کو کبھی فراموش نہیں کروں گا کہ تم نے حسینؑ بن علیؑ کو حرم رسولؐ سے باہر کر کے حرم خدا کی طرف جانے پر مجبور کیا اور وہاں پر کچھ افراد کو اُبھارا کہ ان کو شہید کر دیں اور یوں ان کو حرم خدا سے کوفہ کی طرف جانے پر مجبور کیا۔''

یہ قول طریحی کے اس معروف نقل کی تائید کرتا ہے کہ یزید نے 30 افراد امامؑ کو شہید

کرنے پر مامور کئے تھے اور اس بات کی بھی تائید کرتا ہے کہ امامؑ کے پاس اہل کوفہ پر اعتماد نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کوفہ جائیں اور ان کی باتوں پر اعتماد کریں۔

شیخ مفیدؒ کہتے ہیں: "**ولم يتمكن من تمام الحج مخافة ان يقبض عليه بمكة فينفذ به الى يزيد بن معاويه**۔" "میں اس خوف سے حج کو اتمام تک نہیں پہنچا سکا کہ کہیں مجھے مکہ میں گرفتار نہ کریں اور یزید بن معاویہ کے پاس نہ لے جائیں۔"

مقتل خوارزمی جلد 1 ص 226 پر نقل ہے کہ امامؑ نے ابو ہرۂ ازدی کے جواب میں فرمایا: "**ان بنی امیه قداخذو مالی فصبرت وشتموا عرضی فصبرت و طلبوا دمی فهربت**۔" "یعنی بنی امیہ نے میرا مال غصب کیا میں نے صبر کیا، میری عزت وآبرو پر حملہ کیا میں نے صبر کیا۔ اب وہ میرے خون کے پیاسے ہیں، اس لئے میں (حرم خدا اور حرم رسول کو چھوڑ کر) نکل پڑا۔" آقای صالحی بتاتے ہیں کہ یہ سب باتیں اس بات سے مربوط ہے کہ امامؑ نے کوفہ کا قصد کیا تھا تا کہ وہاں حکومت تشکیل دیں۔ لیکن جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ باتیں بیعت کے شدت کے ساتھ انکار سے اور مکہ میں عدم امن سے مربوط ہیں۔

12- امامؑ زمامِ حکومت کو اپنے ہاتھ لینا چاہتے تھے۔ امامؑ نے حضرت مسلمؑ کے ساتھ اہلِ کوفہ کے نام جو خط بھیجا اس میں لکھا تھا: "**والعمری ماالامام الا العامل بالكتاب والقائم بالقسط والدائن بدين الحق**۔" یعنی "میری جان کی قسم امام صرف وہی ہے جو کتاب خدا پر عمل کرتا ہو، عدل کو رواج دیتا ہو اور دین حق پر قائم ہو۔"

حُر اور ان کے اصحاب کے سامنے خطبہ ایراد کرتے ہوئے فرمایا: "ونحن اہل البیت اولی بولایۃ ہذا الامر من ہؤلاء المدعین مالیس لہم والسائرین فیکم بالجور والعدوان۔" یعنی ہمارا خاندان اس حکومت کی سرپرستی کیلئے بہت زیادہ سزاوار ہے بہ نسبت ان جھوٹے مدعیوں اور ان لوگوں کے جو تمہارے درمیان ظلم و جور اور دشمنی سے پیش آتے ہیں۔

روز عاشور زہیر بن القینؓ نے بھی اپنے خطاب میں بنوامیہ کے ناشائستہ اور امام حسینؑ کے شائستہ ہونے کی باتیں کیں۔

13- آقائے صالحی کا خیال ہے کہ حُر کے مدمقابل ہونے کے بعد امامؑ کا وظیفہ بدل گیا تھا۔ اس مرحلہ میں امامؑ کی تمام تر کوشش اپنی جان بچانا اور صلح کرنا تھی۔ لہٰذا فرمایا **وان لم تفعلوا وكنتم لمقدمی کار هين ولقدومی علیکم باغضين انصرفت منكم الى المكان الذى جئتُ منه اِلیکم۔** ''اس فعل کو نہ انجام دو۔ اگر میرا آنا تمہیں ناپسند ہے اور میرے آنے پر تم لوگوں خشمگین ہو تو میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں واپس جاتا ہوں۔''

یہاں پر کچھ سوالات ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا امامؑ کیلئے مکہ میں بھی کوفہ کی طرح جان کا خطرہ تھا۔ ثانیاً اگر امامؑ بیعت کر لیتے اگر چہ حُر کے ذریعہ ابن زیاد سے ہی سہی، آیا پھر بھی وہ امامؑ سے متعارض ہوتے یا آپؑ کو آزاد چھوڑ دیتے، یا زیادہ سے زیادہ آپؑ کو یزید کے پاس لے جاتے؟ صالحی کے نے جو سوال اٹھایا ہے امامؑ کیوں صلح کے طرفدار تھے اور بالآخر کیوں صلح کی خاطر ان سخت شرائط میں بھی بیعت نہ کی؟

بالکل یہی مفہوم امامؑ کے اس جواب میں بھی جو آپؑ نے عمر بن سعد کو دیا تھا اور جو ''طبری''، ''ارشاد شیخ مفیدؒ'' اور ''الاخبار الطّوال'' میں نقل ہے۔ آپؑ نے فرمایا: ''**فامّا اِذ کَرِ هتُمونی فانا انصرف عنکم۔**'' ''اگر تم لوگ مجھے نہیں چاہتے ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔

اسی طرح کا جملہ امامؑ کے عاشورا کے خطبہ میں بھی ہے ''**ایها الناس اِذ کر هتمونی فدعونی انصرف الی مأمنی من الارض۔**'' یعنی ''اے لوگو! اب اگر مجھے نہیں چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو تا کہ میں زمین پر اپنی پناہ گاہ میں واپس چلا جاؤں۔'' ان جملوں میں امامؑ کے مخاطب ظاہر فقط کوفہ کے لوگ ہیں، نہ کہ حکومت یزید۔

آقای صالحی اپنی کتاب کے ص 88 پر ذخائر العقبیٰ کے ص 149 اور تاریخ ابن عساکر، جلد 4، ص 334 اور سیر النبلاء، ص 209 سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے ان سے

فرمایا''الاتقبلون منی ما کان رسول اللّٰہ یقبل من المشر کین؟ کان اذا جنح احدھم للسلم قبل منه قالو: "لا"۔یعنی'' آیا مجھ سے وہ چیز قبول نہیں کرو گے جو رسولِ خدا مشرکین سے بھی قبول کرتے؟ جب بھی ان میں سے کوئی صلح کیلئے تیار ہوتا تھا آنحضرتؐ قبول فرماتے۔انہوں نے جواب دیا''نہیں۔''

یہ جملہ بہت زیادہ بعید نظر آتا ہے۔مشکل ہے کہ کلمۂ ان جنحو للسلم کا مفہوم صلح ہو بلکہ ظاہراً اس کا مقصد تسلیم ہے،اور امامؑ کے اقوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ کبھی بھی تسلیم ہونے کیلئے تیار نہیں ہوئے ہیں۔

14- آقائے صالحی ص 93 پر طبری کے قول کو قبول کر لیتے ہیں کہ واقعاً امامؑ نے تین پیشنہاد کی تھیں:

الف) حجاز کی طرف واپس لوٹ جائیں (حجاز کے جائے امن نہ ہونے کے باوجود''لو تُرِک القطالنام''(اگر قطار (ایک پرندہ) کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سو جاتا ہے۔)

ب) یا کسی ایک سرحد کی طرف کوچ کر جائیں۔

ج) یا یزید سے ملاقات کیلئے شام جائیں۔

15- آقائے صالحی،سید مرتضٰی کی''تنزیہ الانبیاء''اور شیخ طوسی کی''تلخیص الشافی''میں جو نقل ہے،اس پر تکیہ کرتے ہوئے اس بات کے مدعی ہیں کہ:

ا) امامؑ کوفہ کے حالات کی اطلاع ملنے اور حجاز واپس جانے کے امکان کی نفی ہونے کے بعد یزید سے ملاقات کرنے پر مائل تھے۔

ب) یزید سے ملاقات کے ذریعہ آپؑ مسئلہ کو سلامتی سے حل کرنے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن آقائے صالحی اس بات کو توضیح نہیں کرتے کہ بیعت کے ساتھ یا بغیر بیعت کے۔پہلی صورت کو امامؑ قبول نہیں کرتے تھے اور دوسری صورت یزید کو قبول نہیں تھی۔

ج) امامؑ کے ساتھ ابن زیاد کی نسبت یزید کا رویہ زیادہ نرم تھا۔درحقیقت یزید امامؑ کو شہید

کرنے پر مائل نہیں تھا اور اس نے امامؑ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

د) امامؑ کو اس بات پر یقین تھا کہ اگر ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہوئے تو ذلت کے ساتھ مار دیئے جائیں گے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ امامؑ کے پاس فرار کا کوئی بھی راستہ نہیں تھا۔ کوفہ کے حالات معلوم ہونے سے پہلے کامیابی کی امید تھی اور یہ امید زیادہ ہی تھی۔ اس واقعہ کے بعد آپؑ حجاز کی طرف واپس جانے کیلئے تیار تھے مگر انہوں نے اجازت نہ دی، یزید کے پاس جانا چاہا، نہ جانے دیا۔ اس لحاظ سے شہید ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ بات صرف اسمیں تھی کہ ذلت کے ساتھ ابن زیادہ کے ہاتھوں شہید ہو جائیں یا عزت کے ساتھ جنگ کرتے جان دیدیں اور آپؑ نے عزت کی راہ کو اختیار کیا۔ اس کے برعکس حضرت مسلمؑ ابن زیاد کے امان سے فریب کھا گئے اور ذلت کے ساتھ شہید ہونا پڑا لہٰذا اس صورت میں امامؑ کیلئے کوئی بھی شان و مقام اور حماسہ باقی نہیں رہتا تھا۔

آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ اگر وہ امامؑ کو شام جانے کی اجازت دے دیتے تو آپؑ چلے جاتے اور بیعت بھی کر لیتے اور اس بیعت میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ امامؑ نے اس وقت تک بیعت سے انکار کیا جب تک آپ یہ خیال کرتے تھے کہ خلافت کو یزید سے چھین سکتے تھے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ یہ ممکن نہیں رہا، تب بیعت کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔ آقائے صالحی اس چیز کے بھی مدعی ہیں کہ امام سجادؑ نے مسلم بن عقبہ کے ذریعے یزید کی بیعت کر لی تھی (آقائے صالحی ہی کے وہ بیانات جو نمبر 5 اور 7 میں ذکر ہوئے ہیں یہ تمام باتیں ان کے منافی ہیں۔)

16- امام حسینؑ کے نام اکابران کوفہ کے خط کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد فالحمدللّٰه الذی قصم عدوک الجبار العنید الّذی انتزیٰ علی هذه الامته فابتزها امرها، وغصبها فئیها، و تأمر علیها بغیر رضیً منها، ثم قتل خیارها، واستبقیٰ شرارها، و جعل مال اللّٰه دولةً بین جبابرتها واغنیائها، فبعداً له کما

بعدت ثمود، انه لیس علینا امام فاقبل لعل اللّٰہ یجمعنا بک علی الحق۔"

"یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپؑ کے جبار سرکش دشمن کو ختم کر دیا جس نے امت کے معاملات کو درہم و برہم کیا، اموالِ امت غصب کر لئے اور امت کی رضا مندی کے بغیر اس پر زبردستی حکومت کی، جس نے نیک لوگوں کو قتل کیا اور بُروں کو باقی رکھا اور جس نے خدا کے مال کو اپنے سرکشوں اور مالداروں کی ملکیت قرار دے دیا۔ خدا اُس کا بُرا کرے جس طرح قوم ثمود کا بُرا ہوا۔ سوائے آپؑ کے ہمارا کوئی امام نہیں۔ تشریف لائیے۔ امید ہے خدا آپؑ کے ذریعہ ہم کو حق پر جمع کر دے گا۔"

اس خط کو طبری نے "الامامۃ والسیاسۃ" میں ابن اثیر نے کامل میں، شیخ مفیدؒ نے ارشاد میں اور خوارزمی نے مقتل میں نقل کیا ہے۔

خط کا یہ مضمون سلیمن بن صُرد خزاعی اور حبیب بن مظاہر وغیرہ جیسے محرک اور پر جوش و پر ولولہ لوگوں کا تھا۔ یہی امام حسینؑ کے محرک ہونے کا سبب شمار ہو سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ امامؑ نے منزل ذُوحسم پر اپنے اصحاب اور لشکر حُر سے جو خطاب فرمایا تھا وہ بھی انہی مطالب کی تائید ہے۔

17- آقائے صالحی "اخبار الطوال" کے ص 210 اور "ارشاد مفید" کے ص 182 سے نقل کرتے ہیں کہ اہل کوفہ کی طرف سے سب سے پہلا خط رمضان المبارک کو امامؑ کو ملا، یعنی امامؑ کے مکہ پہنچنے کے تقریباً ایک مہینہ بعد۔

18- آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ حضرت مسلمؑ 15 رمضان المبارک کو عازم کوفہ ہوئے اور 5 شوال کو کوفہ پہنچے (مروج الذہب، ج2، ص86)۔ ایک مہینہ سات دن تک حالات کا تجزیہ کرتے رہے اور 12 ذی القعدہ کو امامؑ کی خدمت میں گزارش ارسال کی (ارشاد مفید، ص 201)۔ ورقاعدتاً حضرت مسلمؑ کا خط چودہ (14) دنوں کے بعد یعنی 27 ذی القعدہ کو امامؑ کو ملا۔

19- آقائے صالحی ص 161 پر ''تذکرۂ سبط'' اور ''تاریخ ابن عساکر'' سے ابن عباس کے نام یزید کے ایک خط کو نقل کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید مکہ اور کوفہ کے روابط سے کلی طور پر آگاہ تھا اور اس نے ضمناً نصیحت اور پیش بینی بھی کی تھی۔

20- آقائے صالحی ص 176 پر کہتے ہیں کہ امامؑ کے اس جملہ سے: **فهلا لكم الويلات تركتمونا والسيف مشيم والجاش طامنّ والرأى لما يستحصف**۔ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امامؑ اہل کوفہ کی جانب سے مدد و یاوری کا اطمینان حاصل کرنے کے بعد کوفہ آئے تھے اور اگر وہ پہلے ہی اپنی آمادگی کا اعلان نہ کرتے تو امامؑ ایسا ارادہ نہ کرتے اور کوفہ کی طرف نہ آتے۔ پس اولاً تو امامؑ کربلا کے قصد سے اور شہید ہونے کے قصد سے نہیں آئے تھے۔

ثانیاً امامؑ کو کوفہ والوں کی یاوری کرنے کے وعدہ پر اطمینان تھا۔

اور ثالثاً اگر یہ اطمینان نہ ہوتا تو آپؑ کبھی بھی کوفہ کی طرف نہ آتے، کوئی دوسرا لائحہ عمل اختیار کرتے۔ مثلاً بیعت کر لیتے اور تسلیم ہو جاتے۔ (لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ امامؑ کو کوفہ آنا **اقل الخطرين يا الخطرات** کے لحاظ سے تھا۔ یہ جملے خود اہل کوفہ کی تکلیف کے لحاظ سے ہیں، نہ کہ امامؑ کے تصمیم کی نظر سے)

21- آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ یہ تصور کہ امامؑ پہلے سے ہی کربلا کے قصد سے اور شہید ہونے کیلئے نکلے تھے، اس کی وجہ درجِ ذیل پانچ چیزیں ہو سکتی ہیں۔

الف پیغمبر اکرمؐ کی قبر کے سرہانے آپؐ کا خواب۔

ب ان اللہ شاء ان یراک قتیلاً کی حدیث۔

ج خط الموت علی ولد آدم والا خطبہ

د وہ خطبہ جس میں یہ جملہ آیا ہے ''لا اری الموت الا سعادۃ''

ھ جناب ام سلمہ سے منسوب حدیث اور شیشی اور مٹی کا قصہ۔

خواب کی داستان ''خوارزمی'' نے ''ابن اعثم کوفی'' سے نقل کی ہے جو قابل اعتماد

نہیں ہے۔اس خواب کو دوسروں مثلاً شیخ صدوق نے ''امالی'' میں (بحار کی نقل کے مطابق جلد 10 میں) محمد بن عمر بغدادی سے نقل کیا ہے۔یہ بھی ابن اعثم کوفی کے زیر اثر تھے۔

اِسی طرح ''روضہ الصفا''، ''روضۃ الشہداء'' اور محمد بن ابی طالب حسینی کی ''تسلیۃ المجالس''، ''نفس المہموم''، ناسخ التواریخ'' ان سب نے بغیر واسطہ کے یا واسطہ کے ساتھ ابن اعثم پر اعتماد کیا ہے۔

22- آقائے صالحی مدعی ہیں کہ امامؑ نے خطبۂ خط الموت...... **فمن کان بازلاً فینا مهجتهُ** کو اس ترتیب کے ساتھ اور مکہ سے نکلتے وقت ارشاد فرمایا ہے۔اس خطبہ کو فقط ''لہوف'' نے نقل کیا ہے، البتہ مقتل خوارزمی میں بھی یہ الفاظ میں کچھ اختلاف کے ساتھ نقل ہوا ہے مگر لکھا ہے کہ یہ خطبہ امامؑ نے روزِ عاشورہ ارشاد فرمایا تھا اور جملہ **فمن کان بازلاً فینا مهجته** اصلاً وہاں پر موجود نہیں ہے۔خوارزمی نے جو نقل کیا ہے،وہ یہ ہے:

"ایها الناس خُطّ الموت علی بنی آدم کمخط القلادة علی جید الفتاة و ما الوهی الی اسلافی اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف، و انّ لی مصرعاً انا لاقیه، کانی انظر الیٰ اوصالی تقطّعها و حوش الفلوات غُبراً وعفراً قدملأت منّی اکراشها، رضا اللّٰه رضانا اهل البیت، نصبر علی بلائه لیوفینا اجور الصابرین، لن تشذ عن رسول اللّٰه لحمتُه و عترته و لن تفارقة اعضاوه وهی مجموعة له فی حظیرة القدس تقربها عینه وتنجزفیهم عدتُهُ۔"

یعنی ''اے لوگو! موت کا قلادہ اولادِ آدمؑ کے گلے میں اس طرح ہے، جس طرح جوان عورت کے گلے میں ہار۔مجھے اپنے اسلاف سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا شوق تھا۔میری قتل گاہ معین ہو چکی ہے جہاں میں پہنچنے والا ہوں۔میں گویا نواویس اور کربلا کے درمیان اپنے جسم کے جوڑ و بند دیکھ رہا ہوں کہ جنگل کے بھیڑیئے

(لشکر یزید) ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں اور میرے جسم سے اپنے بھوکے پیٹ اور خالی توشہ دانوں کو بھر رہے ہیں۔ قلم قدرت نے موت کا جو دن لکھ دیا ہے اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ خدا کی مرضی ہم اہل بیتؑ کی مرضی ہے، ہم اس کی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہم کو صابروں کے اجر سے سرفراز فرمائے گا۔ رسولؐ اللہ سے ان کے اہل بیتؑ جدا نہ کئے جائیں گے بلکہ بہشت میں سب کے سب آپ کی خدمت میں موجود رہیں گے۔ ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں روشن ہوں گی اور آپ اُن کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کریں گے۔"

23- کتاب "اثبات الوصیۃ" میں مسعودی صفحہ 139 پر جناب اُم سلمہ اور شیشی کی معروف روایت اور ابا عبداللہ کا جناب اُم سلمہ کو میدان کربلا کے کا منظر دکھانے کی بات نقل کرتے ہیں۔ آقائے صالحی اس واقعہ کو امامؑ کی عادی زندگی کے منافی بتاتے ہیں اور اس روایت کو رد کرتے ہیں۔

24- آقائے صالحی اپنی کتاب کے ص 196 پر "اثبات الوصیۃ" کی روایت کو ردّ کرنے کے بعد بہت ساری روایات نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے تھوڑی سی تربت اُم سلمہ کو دے دی اور کہا کہ اس کی امام حسینؑ کی شہادت کی علامت کے طور پر نگہداری کریں۔ آقائے صالحی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد قبول بھی کر لیتے ہیں۔

25- اہم سوالوں میں سے ایک یہ ہے کہ امامؑ نے حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملنے اور کوفہ پر ابن زیاد کے تسلط سے واقف ہونے کے باوجود کوفہ کی طرف اپنے سفر کو کیوں جاری رکھا؟ بلکہ حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی "من المومنین رجال صدقوا ماعا ھدوا اللّٰہ علیه فمنھم من قضی نحبه و منھم من ینتظر و مابدلوا تبدیلا۔" یعنی "مومنین میں ایسے بھی مرد میدان ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو سچ کر دکھایا ہے، ان

میں بعض اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنی بات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی ہے۔" (سورۂ احزاب-23)

26- ایک اور سوال یہ ہے کہ اگر آقائے صالحی کی یہ بات صحیح ہے کہ امامؑ حتی الامکان خون بہانے سے پرہیز کرتے تھے اور تسلیم نہ ہونے کی علت یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں ابن زیاد کے ہاتھوں قتل ہونا ہے، تو پھر اپنے اصحاب اور فرزندوں کو قتل ہونے سے کیوں نہیں بچایا؟ حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کیلئے امان نامہ آیا تھا۔ خود امامؑ کے فرمان کے مطابق کسی کو ان لوگوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیوں امامؑ ان سب کے قتل پر راضی تھے؟ اس کے علاوہ اگر امام ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہو جاتے تو لشکر ابن زیاد میں موجود کوفہ کے سینکڑوں افراد بھی مارے نہ جاتے۔ ان کا مارا جانا بھی ایک قسم کی خونریزی ہی تو تھی۔

27- امامؑ کے پاس کوفہ سے جب قاصد مخصوص خط لیکر پہنچ جاتا ہے (محمد اشعث کی طرف سے حضرت مسلم کی وصیت پر) تو امامؑ لوگوں کے درمیان خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جس کے بعد کچھ لوگ جو طمع و لالچ میں وسط راہ میں ساتھ ہو لئے تھے، واپس لوٹ جاتے ہیں، مگر امامؑ خود اُسی طرح کوفہ کی طرف جاری رکھتے ہیں۔ کیوں؟

28- آقائے صالحی امامؑ کا حُر سے سامنا ہونے کو اس لحاظ سے تازہ مرحلہ بتاتے ہیں کہ حُر امامؑ کو ابن زیاد کے سامنے تسلیم کرنے پر مامور تھا اور اس صورت میں کوفہ جانے سے لوگوں کی طرف سے کسی بھی قسم کی مدد کا احتمال نہیں تھا۔

29- آقائے صالحی "اخبار الطّوال" کے ص 227 سے نقل کرتے ہیں کہ جب امامؑ کو ابن زیاد کے عمر سعد کے نام لکھے گئے خط (جس میں امامؑ کیلئے دو راستے دکھائے تھے، تسلیم ہونا یا شہادت) کا علم ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

"فهل هو الا الموت؟ فمرحباً به"

"کیا موت کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے؟ مرحبا! اے موت"

30- آقائے صالحی لکھتے ہیں محرم کی پانچ تاریخ کے تقریباً آخری اوقات میں عمر سعد کو

ابن زیاد کا حکم ملا کہ حسینؑ سے کہہ دو کہ ابھی بیعت کریں، بعد میں ان کے بارے میں سختی کروں گا۔ چھٹی محرم کی شام امامؑ کا جواب کہ ''کبھی بھی تسلیم نہیں ہوں گا۔'' اس تک پہنچ گیا۔ ساتویں محرم کے آخری اوقات میں حکم آیا کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو۔

-31 آیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امامؑ کی کوفہ سے انصراف کی پیشنہاد (خود اپنے پاؤں سے چل کر آنے کے بعد) اس لئے تھی کہ اس کے ذریعہ آپؑ انقلاب کو شدت اور وسعت بخشنا چاہتے تھے؟ جیسا کہ ابن زیاد نے جب عمر سعد کی پیشکش کو قبول کرنا چاہا تو شمر نے کہا: ''اگر حسینؑ تمہارے ہاتھ سے نکل گئے تو پھر وہ قوی تر اور تم ضعیف تر ہو جاؤ گے۔''

-32 ایک سوال یہ ہے کہ امامؑ نے کیوں بصرہ کے لوگوں کے نام خط لکھا اور کیوں ان کو دعوت دی؟ آیا یہ دعوت حکومت کے خلاف قیام کے علاوہ کسی اور چیز کیلئے تھی؟ آیا شورش اور انقلاب برپا کرنے کے علاوہ یہ کسی اور قسم کی دعوت تھی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ کیوں شب عاشور حبیب بن مظاہرؓ کو بنو اسد کو دعوت دینے کیلئے بھیجا؟ کیوں شب عاشور اپنے بھائیوں، فرزندوں اور خاص اصحاب سے چلے جانے پر اصرار نہیں کیا تاکہ انکا خون نہ بہے؟

-33 عجیب بات ہے کہ آقائے صالحی نے اپنی کتاب میں تمام تر کوشش یہ کی ہے کہ قیام حسینی کے ابتدائی قیام ہونے کی نفی کریں۔ اس کے باوجود چوتھے باب کے ص299 پر حکومت یزید کے حالات، حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے، اس کے ظلم وستم اور استحصال وغیرہ کو بیان کرنے اور ان چیزوں کو امامؑ کے منزلِ بیضہ پر دیئے گئے خطبہ سے تطبیق کرنے کے بعد کہتے ہیں ''اگر ان حالات میں کسی بھی حلقوم سے کوئی ندا نہ اُٹھتی اور اگر بالفرض محال امام حسینؑ کسی شرط وقید کے بغیر یزید کو تسلیم کر لیتے، تو اس صورت میں دوسری مملکتیں اسلام کی شناخت یزید بن معاویہ کے قالب میں کرتیں۔ اگر رئیس مملکت اسلامی کے خلاف کوئی نہ اُٹھتا اور معترض نہ ہوا

ہوتا تو یزید تو باہر کی دُنیا کی نظر میں روح اسلام کا نمائندہ تھا۔ اُس وقت بیگانے کہتے کہ اسلامی مملکت گویا ظلم و بے داد کی مملکت ہے۔

حسینؑ بن علیؑ جن کی افق نظر عام لوگوں کی نظر سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جب آپؑ خارجی اور دُنیاوی نظروں میں اسلام کی ایسی وضع دیکھتے ہیں اور اس صورتحال میں آپؑ سے یزید کی بیعت کرنے کیلئے کہا جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں ''وعلی الاسلام السلام اذ قد بلیت الامۃ براع مثل یزید۔'' جب امت یزید جیسے کی حکومت میں گرفتار ہو، اس وقت اسلام پر میر اسلام ہو۔'' (مقتل خوارزمی، جلد 1، ص 184)

اس مفہوم تک خود ہی رسائی ہوتی ہے۔ کبھی ایک اعتراض اور اظہار وجود کی اس قدر اہم ہوتی ہے کہ اس کی خاطر سینکڑوں آدمی اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ پس امام حسینؑ کے اس قدر معترض ہونے کے باوجود کیوں آقائے صالحی اس بات کے منکر ہیں؟

اس کے بعد کہتے ہیں ''اسی وجہ سے حسینؑ بن علیؑ مقاومت کا مصمم عزم کرتے ہیں تاکہ بیرونی دنیا جان لے کہ اسلام کو حسینؑ بن علیؑ کے افکار کے دریچہ میں اور فرزند پیغمبرؐ کے قالب میں شناخت کرنا ہے، نہ کہ یزید کے قالب میں تاکہ بیرونی دنیا جان لے کہ اسلام نے حسینؑ جیسے ہونہار فرزند کو تربیت دی ہے جو انسانیت اور عدالت کا دفاع کرتے ہوئے آزادی، حریت، تقویٰ اور فضیلت کی راہ میں والہانہ طور پر جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

اس لئے اسلام کی جہانی اور بین الاقوامی موقعیت کے دفاع کو حسینؑ کے وسیع اور ہمہ زاویہ ہدف کا ایک جز جاننا چاہیے۔

34- آقائے صالحی کہتے ہیں: ''بعض لوگ جیسے ''موسیو ماربین جرمن'' کتاب ''السیاسۃ الحسینیہ'' میں لکھتا ہے کہ امام حسینؑ عمداً مظلومیت کا منظر پیش کرنا چاہتے تھے اور شہادت کیلئے جتنا بھی ہو سکے، سخت مصیبت کے مقدمات فراہم کرنا چاہتے تھے تاکہ بہتر طور پر زیادہ تر لوگوں کے احساسات کو بنو ہاشم کی موافقت اور بنو امیہ کے خلاف متحرک کر سکیں۔

''ماربین'' کہتا ہیں ''امام حسینؑ کئی سالوں سے متواتر اپنے شہید ہونے کے آثار دیکھ چکے تھے اور ایک اعلیٰ مقصد ان کے مد نظر تھا۔ (ص 33)

اس نے یہ بھی کہا ہے ''حسینؑ ابن علیؑ کے مدنظر چونکہ قتل ہونے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا کیونکہ یہی آپ کے اس مقدس اور عالی (انقلاب) خیالات کا مقدمہ تھا، اس لئے اپنے لئے بے کسی اور مظلومیت کو سب سے بڑا وسیلہ جانا اور اسی کو اختیار کیا تاکہ آپ کے مصائب دوسروں کے دلوں پر موثر واقع ہوں۔'' (ص25)

یہ بھی کہا ''حسینؑ نے بنوامیہ کے ظلم وستم کو ظاہر کرنے اور بنوہاشم اور اولاد محمدؐ کے ساتھ ان کی عداوت کو فاش کرنے میں کوئی فرصت ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ (ص26)

طفل شیر خوار کے بارے میں اس نے کہا ہے ''ان تمام جانکاہ مصائب، پیاس اور اتنے سارے زخموں کے باوجود حسینؑ اپنے عالی مقصد (احساسات کو حرکت میں لانا) سے صرف نظر نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنوامیہ آپ کے چھوٹے سے بچہ پر رحم نہیں کریں گے، محض مصائب کو عظیم بنانے کیلئے خود اپنے ہاتھوں میں بچہ کو لیکر میدان میں گئے، ظاہری طور پر اس کیلئے پانی کی التجا کی اور تیر سے جواب سنا۔''

35- آقائے صالحی اپنی کتاب کے آخری حصہ میں ص309 پر مغالطہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ''اس جملہ کی تعبیر کے طور پر کہ ''امام حسینؑ کے شہید ہونے سے اسلام زندہ ہوا۔'' ہم کوئی صحیح اور قابل قبول معنی تصور نہیں کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس میں کوئی فرق نہیں کہ اسلام کے زندہ ہونے سے مراد احکام اسلام پر عمل کرنا ہو یا اسلامی فتوحات ہو یا بنوامیہ کی حکومت کو کمزور ہونا ہو یا شیعوں کو وجود میں لانا ہو یا بنوامیہ کو رسوا ہونا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کے صدر و رئیس اور حافظ قرآن کے مرنے سے اسلام زندہ ہو جائے؟''

36- آقائے صالحی لکھتے ہیں۔ ''عبیداللہ نے عمر سعد سے فرمان کا مطالبہ کیا تو عمر سعد نے نہیں دیا اور مسئولیت کو عبیداللہ کے گلے میں ڈالدیا۔''

عثمان بن زیاد نے کہا: ''میری خوشی اس میں ہے کہ زیاد کے تمام فرزند قیامت تک ذلیل رہتے اور حسینؑ بن علی شہید نہ ہوتے۔''

(طبری، جلد4، ص375)

ابن زیاد کی ماں ''مرجانہ'' کہتی ہے ''یا خبیثُ !قتلت ابن رسول اللہ، واللہ لاتری الجنۃ ابداً'' اے خبیث! رسولؐ اللہ کے فرزند کو قتل کیا؟ خدا کی قسم کبھی بھی بہشت کی صورت نہ دیکھ سکے گا۔'' (تذکرۂ سبط،ص259)

یحییٰ بن الحکم (مروان بن الحکم کا بھائی) کہتا ہے: ''تمہارے اور پیغمبرؐ خدا کے درمیان قیامت کے دن جدائی ہوگی۔ میں اس کے بعد تمہارے کسی بھی کام میں شریک نہیں ہوں گا۔'' (طبری، ج4،ص356)

یزید کی بیوی ہند پر جب یہ ماجرا کھلا تو اس نے اپنے مخصوص لباس سے حجاب کیا اور اندرون خانہ سے مردوں کی مجلس میں آ کر بولی ''آیا یہ حسینؑ فرزند فاطمہؑ کا سر مقدس ہے؟'' یزید نے کہا ''ہاں، یہ حسینؑ فرزند فاطمہؑ کا سر ہے۔ تو ان کیلئے گریہ اور عزاداری کر، خدا ابن زیاد کو موت دے کہ اس نے ان کو مارنے میں عجلت کی۔''

(طبری، ج4،ص356)

میری نظر میں ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ یزید کے بیٹے معاویہ نے خود کو خلافت سے الگ کیا، یزید و معاویہ پر لعنت بھیجی اور حق کو حسینؑ اور علیؑ کی طرف واپس کر دیا۔ اس لئے حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا اثر یہ تھا کہ اس نے نفاق کے پردہ کو چاک کیا اور سلطنت کا حساب عملی طور پر دین سے جدا کر دیا۔ اگر حادثۂ کربلا نہ ہوتا تو بنو امیہ دین کے نام سے لوگوں پر حکومت کرتے۔ البتہ ان کے یوں دین سے چپک جانے کو چند لوگوں کی نظریں انہیں بری الذمہ ٹھہراتیں مگر زیادہ تر لوگوں کی نظروں میں یہ عمل دین کو آلودہ کر دیتا۔

قیام حسینی کا کم از کم اثر یہ تھا کہ خلفاء اور دین ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے۔

اس قیام کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ امام حسینؑ کی محبوبیت کا درجہ حدِ معمول سے زیادہ بلند ہو گیا۔ واقعاً امامؑ جہانِ اسلام میں ''شہید اُمت'' اور ''فداکاری کے قہرمان'' کے طور پہچانے جانے لگے۔ آپؑ ایک مقدس قوت کی صورت میں سامنے آئے اور اس آیت کا مصداق بن گئے۔ ''انَّ الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن وداً'' بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے، عنقریب رحمان اُن کیلئے

لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔'' (سورۂ مریم 96)

طبری، ج 4، ص 346 اور مقتل خوارزمی، ج 2، ص 34 پر درج ہے کہ خود امامؑ نے روزِ عاشورہ فرمایا ''وأیم اللّٰہ انی لأرجو ان یکرمنی اللّٰہ بھوانکم۔''

37- آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے جہاں جہاں امامؑ نے اپنے اقوال میں تسلیم ہونے سے منع فرمایا ہے، اس سے آپ کی مراد ابن زیاد کے حضور تسلیم ہے اور یہ یزید کی بیعت سے جدا ہے۔ ان کے خیال میں امامؑ یزید کی بیعت کرنے کیلئے آمادہ تھے لیکن بغیر کسی شرط و مقدمہ کے ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہونے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ یقین رکھتے تھے کہ آپؑ کو ہر صورت میں ذلت کے ساتھ شہید کر دیا جائے گا۔

38- آقائے غفاری نے کتاب ''بررسی تاریخ عاشورہ'' کے مقدمہ میں قیام حسینی سے متعلق سوالات اس طرح سے اُٹھائے ہیں کہ آیا امامؑ کا یہ کام بیعت سے فرار کی وجہ سے تھا؟ یا کوفہ والوں کی دعوت اس کا سبب تھی؟ یا پھر اس کا مقصد قیام، انقلاب اور شورش برپا کرنا تھا؟ اس قسم کے سوالات مطرح کرنے کے بعد خود تیسری صورت کو انتخاب کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہو جاتے ہیں کہ کچھ ایسے اسباب اور مقدمات پیدا ہو گئے تھے کہ امامؑ پر قیام اور اقدام کرنا وجوب کی صورت اختیار کر گیا تھا اور کچھ ایسے آثار اور قرائن ہیں کہ امامؑ پہلے سے ہی کسی نہضت اور انقلاب کی فکر میں تھے۔ لیکن معاویہ کے دور میں بھی کچھ واقعات پیش آئے تھے۔

الف: سب سے اہم ترین بات خلافت کو موروثی قرار دینا تھا کہ یہ سب سے بڑی بدعت شمار ہوئی اور اس کا مقصد در حقیقت ابوسفیان کی دیرینہ آرزو کو جامع عمل پہنانا تھا۔ ''تلقفوھا تلقف الکرۃ اما والّذی یحلف بہ ابوسفیان لا جنّہ و لانار۔'' ایسی بدعت کے سامنے سکوت اختیار کرنا جائز نہیں تھا۔

ب: شیعوں کے ساتھ رویہ صلح امام حسنؑ کی قرارداد کے برخلاف حد سے زیادہ سخت اور ناقابل تحمل تھا۔ بنوامیہ کی سیاست تشیع کے اساس کی ریشہ دوانی کرنا تھی۔ معاویہ ایک حکم نامہ میں لکھتا ہے ''من اتھموہ بموالاۃ ھؤلاء القوم فنکلوا بہ

واھدموا دارہ۔'' جہاں بھی یہ گمان ہو کہ اس قوم کا طرفدار ہے، اس کو عبرتناک سزا دو اور اس کے گھر کو ویران کر دو۔'' اپنے ایک اور حکم میں لکھتا ہے ''انظروا الی من قامت علیہ البینۃ انہ یحبّ علیاً واہل بیتہ فامحوہ من الدیوان واسقطوا اعطاءہٗ ورزقہ۔'' نگرانی رکھو، جہاں بھی یہ ثابت ہو جائے کہ وہ علی اور ان کے خاندان کا دوست اور محبّ ہے، اس کا نام رجسٹر سے مٹا دو، اس کے حقوق اور روزانہ کی خوارک کو بند کر دو۔'' (ابن ابی الحدید، ج 3، ص 15 چھاپ مصر)

ج: رسمی طور پر نماز جمعہ کے خطوں میں حضرت علیؑ پر سب ولعن کو رواج دینا۔

د: شیعوں کی شہادت اور گواہی قبول نہ کرنا اور ان کو اجتماعی حقوق سے محروم رکھنا۔

ھ: شیعہ اکابرین جیسے حجر بن عدی اور رشید ہجری کو شیعہ ہونے کے جرم میں قتل کرنا۔

و: بنوامیہ کی اپنے حق میں تبلیغات اور معاویہ کو اس طرح سے صحابہ کبار کی صف میں قرار دینا۔ اگر یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہتا تو ایک دن ایسا بھی آجاتا کہ لوگ معاویہ کے بتائے ہوئے اسلام کے علاوہ اسلام کو نہ پہچانتے۔ لیکن امام حسینؑ کے پہلے سے ہی قیام کرنے کا قصد رکھنے نے بنوامیہ کے مکروفریب کی قلعی کھول دی اور اسلام کو اس ناقابل تلافی نقصان سے بچالیا۔

''مقدمتاً یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت امیرؑ، حضرت حسن مجتبیٰؑ اور حضرت سیدالشہداءؑ کی روش، درحقیقت ایک کلی اصول کی تابع تھی۔ یہ حضرت اپنے آپ کو مستحق خلافت سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود خلافت کے غصب ہونے پر قیام نہ کرنا، دراصل اس اصول کی پیروی تھی جو حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کی خلافت کے موقع پر بیان فرمایا تھا: ''واللہ لاسلِمن مَا سلمت امور المسلمین ولم یکن فیھا جور الا علی خاصۃ۔'' خدا گواہ ہے کہ میں اس وقت تک حالات کا ساتھ دیتا رہوں گا جب تک مسلمانوں کے مسائل ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ 74)

امام حسینؑ پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ کہا گیا اور ہر برس لوگ اپنے اپنے انداز میں امامؑ کو خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے اور امام کے ذکر سے محافل و مجالس مزین ہوتی

رہیں گی۔ یہ رسم تا قیامت جاری رہے گی۔ حسینی تحریک کے نت نئے گوشے بے نقاب ہوتے رہیں گے ان سارے تجزیوں میں قرآن وسنت کے ساتھ والہانہ وابستگی امام کا طرۂ امتیاز ہو گا۔ امام کی زندگی کا پیغام ہی اطیعواللہ واطیعو الرسول ہے۔ یہی عنصر انسان کو اعلیٰ کردار کا حامل بناتا ہے اور خوف وحزن وتکبر سے نجات دلاتا ہے۔ اسی کی بدولت انسان باوقار زندگی گزارتا ہے۔ سورہ نوح 29/71/13 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

مالکم لا ترجون للہ وقار

یعنی اللہ کیلئے بزرگی کا عقیدہ کیوں نہیں رکھتے یا تم اللہ سے وقار کے امیدوار نہیں ہو (اور زندگی کے عاملات میں گھبرا جاتے ہو)

امام نے اللہ کی برتری اور بزرگی کا نہ صرف عقیدہ رکھا بلکہ اس کا برملا اظہار کیا اور اللہ تبارک تعالیٰ سے سنجیدگی اور وقار بھی امید بھی رکھی کیونکہ آپ زندگی میں کسی شے سے نہیں گھبرائے۔ اگر ہم عاشورہ کے چند گھنٹوں کی قیمت کا اندازہ لگائیں تو امام کی زندگی کے یہ چند لمحات صدیوں پر بھاری نظر آتے ہیں۔

امام نے اپنی تحریک کے دوران بالعموم اور کربلا کے سفر میں بالخصوص مندرجہ ذیل باتیں کہہ کر اپنے موقف کو واضح کیا۔

1- کہ مجھ جیسا شخص ہرگز یزید جیسے شراب خور کی بیعت نہیں کرسکتا۔

2- میں نہ تو ذلت قبول کرتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دوں گا اور نہ ہی غلاموں کی طرح راہ فرار اختیار کروں گا۔

3- خدا کی قسم، میں ہرگز اس ذلت اور حقارت کو قبول نہیں کروں گا۔

4- ذلت ہم سے کوسوں دور ہے۔

5- اللہ کی راہ میں مارا جانا انسان کیلئے باعث افتخار ہے۔

6- میں موت کی طرف بڑھ رہا ہوں اور موت جواں مرد کیلئے ذلت نہیں۔

7- اے بہن! جو خدا نے مقدر کیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

8- مجھے اپنے قتل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کئی کتے

مجھے کاٹ رہے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ شدید ایک سیاہ اور سفید (خاکستری) رنگ کا کتا ہے۔

9- یہ لوگ میرا خون بہائے بغیر مجھے نہیں چھوڑیں گے اور جب یہ لوگ کام کر گزریں گے تو خدا ان پر ایک ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو انہیں انتہائی ذلیل وخوار کرے گا یہاں تک کہ انہیں تمام قوموں سے زیادہ ذلیل ترین بنا دے گا۔

10- انہوں نے (بنوامیہ نے) ظلم وستم اور اللہ کی دشمنی کا راستہ اپنایا ہوا ہے۔

11- اے لوگو! جان لو کہ بنی امیہ نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے اور رحمان کی اطاعت ترک کر دی ہے۔ فتنہ وفساد کو رواج دیا ہے اور اللہ کی حدود کو معطل کر دیا ہے۔ مال کو اپنے لئے مختص کر لیا ہے۔ اللہ کی طرف سے کئے گئے حلال کو حرام میں تبدیل کر دیا ہے اور میں ان مفسدوں کے مقابلہ پر زیادہ حقدار ہوں۔

12- میں جانبازی اور شجاعت کی موت کو ایک سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا میرے نزدیک ذلت اور حقارت ہے۔

13- گویا دُنیا تھی ہی نہیں اور آخرت ہی سب کچھ ہے۔

14- وہ قوم کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو خالق کی ناراضگی کی قیمت پر مخلوق کی خوشنودی اور رضا حاصل کرے۔

ان اقوال کی روشنی میں امام سے کسی اور ردعمل کی توقع ممکن ہی نہ تھی۔ آپ نے آخری وقت اپنے فرزند علی زین العابدینؑ کو دو وصیتیں کیں:

1- اے فرزند! اس شخص پر ظلم کرنے سے خوف کھانا جس کا خدا کے سوا اور کوئی مددگار نہ ہو۔

آپ اندازہ لگائیں کہ امام کے سارے عزیز واقربا اور اصحاب شہید ہو چکے ہیں اور امام خود نہایت اطمینان، یقین اور وقار کے ساتھ اپنی موت کی طرف بڑھ رہے ہیں اور خود اتنے تنہا ہیں کہ لفظ تنہائی ان کی حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہے لیکن پھر بھی توحید کا یہ پرستار وقت کے اگلے امام کو وصیت کرتے ہیں کہ کسی پر ظلم نہ کرنا یعنی یہ بھی برداشت نہ کرنا

کہ محرومین پر ظلم ہوتا رہے۔

2- امام دوسری وصیت میں علی زین العابدینؑ کو اپنی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کی دُعا تعلیم فرماتے ہیں:

اے وہ جو مانگنے والوں کی حاجتوں سے باخبر ہے
اے وہ جو باطن میں چھپے اُمور سے مطلع ہے
اے غم واندوہ میں مبتلا لوگوں کو دینے والے
اے پریشانیوں سے دوچار لوگوں کو نجات دلانے والے
اے جو عمر رسیدہ اور ضعیف افراد پر رحم کرتا ہے
اور چھوٹے بچوں کو رزق دیتا ہے
اے وہ جسے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں
محمد وال محمد پر درود بھیج اور میری مشکل کو آسان فرما۔

یعنی امام کا بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ آئندہ ہمیشہ اسلام کی شناخت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناطے سے دُنیا میں قائم ودائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ کچھ عرصہ بعد اپنے اور اغیار اسلام کو یزید کے عمل سے پہچانتے ہوئے اسلام کے بارے میں ایسی باتیں کریں جو حقیقت سے کوسوں دور ہوں۔ امام اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور آج اسلام کی پہچان اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی نسبت سے ہے اور رہے گی۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے
اس جان کی کوئی بات نہیں

میں اس موقع پر ایک ذاتی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ہر کتاب مکمل کرنے کے بعد حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالتا ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ میری فکری کاوش کو روحانی دُنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ نہیں۔ اس کتاب کی تکمیل پر حسب

معمول جب میں نے فال نکالی تو مندرجہ ذیل غزل برآمد ہوئی:

خیز تا از درِ میخانہ کشادے طلبیم
بردر دوست نشینم و مرا دے طلبیم

یعنی اُٹھ (کتاب ختم کرنے کے بعد اشارہ ہے کہ اُٹھ) تا کہ میخانہ یعنی مرشد و ہادی کی فیض گاہ سے کشادگی طلب کریں۔ آجا اور دوست کے دروازے پر بیٹھ جا تا کہ مراد حاصل ہو۔

غزل کے حسن کی نسبت سے میں ساری غزل معہ ترجمہ قارئین کرام کی نذر کرتا ہوں:

خیز تا از در میخانہ کشادے طلبیم — بر در دوست نشینم و مرا دے طلبیم
زادِ راہِ حرمِ دوست نداریم مگر — بگدای زور میکدہ زادے طلبیم
اشک آلودہ ما گرچہ روانست ولے — برسالت سوئے آن پاک نہاد طلبیم
لذت داغ غمت بر دل ما باد حرام — اگر از جود غم عشق تو دادے طلبیم
نقطہ خال تو بر لوح بصر نتوان زد — مگر از مردمک دیدہ مدادے طلبیم
تا بود نسخۂ عطری دل سودا زدہ را — از خط غالیہ سائے تو سودائے طلبیم
چون غمت را نتوان یافت مگر در دل شاد — ما بامید غمت خاطر شادے طلبیم

بر در مدرسہ تا چند نشینی حافظ
خیز تا از در میخانہ کشادے طلبیم

اُٹھ ...... تا کہ مرشد کے دروازہ پر فارغ البالی یا کشادی طلب کریں۔ آ، دوست کے دورازہ پر بیٹھیں اور مراد حاصل کریں۔

اگرچہ میرے پاس دوست تک پہنچنے کیلئے یا دوست کے مقدس مقام تک پہنچنے کیلئے زادراہ موجود نہیں لیکن آ کہ میخانہ کے دروازہ پر گداگری کر کے زادراہ حاصل کریں۔

اگرچہ میری اشک آلود آنکھوں سے آنسو رواں ہیں لیکن اس پاکیزہ ذات کی طرف اپنا پیغام بھیج کر حال بیان کریں۔

تیری محبت کے داغ کی لذت مجھ پر یا میرے دل پر حرام ہو اگر میں تیرے غم عشق کے ظلم سے انصاف طلب کروں۔ایک محبت زدہ دل کبھی زبان شکوہ دراز نہیں کرتا۔

تیرے خال کا نقطہ بصارت کی لوح پر نہیں ڈالا جا سکتا لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ آنکھ کی تپلی سے مدد طلب کی جائے یا کام لیا جائے۔(صوفیانہ اصطلاح میں خال سے مراد نقطہ وحدت ہے) چونکہ کثرت میں وحدت پوشیدہ ہے۔اس لئے خال کا نقطہ بصارت کی لوح پر نہیں ڈالا جا سکتا۔

دل نے اپنی جان کے عوض تیرے شیریں لبوں کے بوسہ کی آرزو کی تو تیرے شکر خندہ لب سے یہ نکلا کہ مراد حاصل کریں۔(یعنی تو نے میری آرزو کو قبول کیا لیکن پہلے مجھے جان فدا کرنے پر مجبور کیا۔گویا وصال محبوب دراصل بعد از فنائے ذات خود ہی ہوتا ہے۔

ہم اپنے شوریدہ دل کیلئے عطر کا نسخہ تیرے معطر خط کی سیاہی سے طلب کر سکتے ہیں (یعنی عاشق دل سوختہ محبوب کی معطر زلفوں کی خوشبو سے ہی تسکین پا سکتا ہے۔)

اے حافظ مدرسہ کے دروازہ پر تو کب تک بیٹھا رہے گا۔اُٹھ اور مرشد کے دروازہ پر کشائش طلب کریں۔

میں نے امامؑ کی تعلیمات کو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔یہ طرز فکر میرے ذہن کی اختراع نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ میں نے قرآن وسنت اور امام کی تعلیمات ہی سے اخذ کیا ہے۔تاریخ طبری کے مطابق عمر ابن سعد نے نویں محرم بروز جمعرات اپنے لشکر کے ساتھ امام کی طرف پیش قدمی شروع کی تھی۔اس شور پر بی بی زینبؑ متوجہ ہوئیں جنہوں نے امام کو دشمن فوج کی حرکت کی اطلاع دی۔امام نے اپنے بھائی عباس علمبردار کو دشمن کی طرف بھیجا تاکہ ان کا ارادہ معلوم کریں۔عمر ابن سعد نے کہا کہ ابن زیاد کا تازہ ترین حکم اطاعت فوری جنگ ہے۔اس کے جواب میں امام نے کہا کہ ہمیں آج رات کی مہلت دے دی جائے تاکہ ہم یہ رات اپنے ربّ کی عبادت میں گزاریں۔کافی بحث کے بعد عمر ابن سعد اس بات پر راضی ہوا کہ اگر صبح تک آپ نے بیعت نہ کی تو یہ لشکر آپ پر حملہ کرے گا۔امام اور آپ کے اصحاب نے ساری رات یعنی شب عاشور نہایت اطمینان قلب کے

ساتھ تلاوت کلام پاک، دُعاؤں اور سجدوں میں گزاری۔ اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام کو اپنی زندگی سے زیادہ قرآن سے لگاؤ تھا۔ آپ نے اپنی زندگی کی آخری رات حکم الٰہی اور سنت رسول زندہ کرنے میں گزاری۔ اس سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اور کی اطاعت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام کی زیارت پڑھی جاتی ہے تو ہر مومن گواہی دے کر اعلان کرتا ہے:

واشهدانک قداقمت الصلوة واتيت الزكوٰة و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر واطعت اللّٰه و رسول حتى اتاک اليقين۔

یعنی: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز کو قائم کیا زکوٰۃ ادا کی، نیکیوں کا حکم دیا، بُری باتوں سے منع فرمایا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی یہاں تک کہ آپ موت سے ہم کنار ہوئے۔

اللهم صلى على محمد وال محمد

سید افضل حیدر
سینئر ایڈووکیٹ

58-جی گلبرگ 3، لاہور
5-مئی 2004ء

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امام حسینؑ کی تحریک کا مرکزی نقطہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرآن پاک کی خصوصی اصطلاح ہے جو انبیاء کی تعلیمات کا نچوڑ تصور کیا جا سکتا ہے۔اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ نیک کاموں کی دعوت دینا اور برے کاموں سے منع کرنا ہے۔اس شعار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سورہ المائدہ 6/5/78-79 میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

> کہہ دیجئے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو اور زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو خود بھی گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے (جو وہ کرتے تھے) منع نہ کرتے تھے۔جو کچھ بھی یہ کرتے تھے یقیناً وہ بہت برا تھا۔

اس حکم سے یہ اصول برآمد ہوا کہ اقوام کی تباہی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ معاشرہ میں برے کاموں سے روکنے والا باقی نہیں رہتا جس کے نتیجہ میں احکام الٰہی اور حقوق بشری پامال ہو جاتے ہیں۔ایسے لوگوں پر انبیاء کے ذریعہ اللہ کی لعنت بھیجی گئی۔قرآن کا یہ اصول نہ تو کسی ایک امت کے لئے مخصوص تھا اور نہ ہی یہ کسی ایک زمانے کیلئے تھا۔یہ حکم قرآن پاک کا حصہ ہے اور تا قیامت اقوامِ عالم کی یاد دہانی کیلئے محفوظ کر لیا

گیا ہے۔ یہ حکم نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے احکام کی طرح زندہ و جاوید ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقوام کی زندگی کا راز اس اصول میں پنہاں ہے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ وحی کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنی معاشرتی زندگی میں اس اصول کو اپنا لے کیونکہ قرآن پاک نے اسے ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اس اصطلاح میں ایک غور طلب بات یہ ہے کہ اس اصطلاح میں لفظ حکم استعمال نہیں ہوا بلکہ لفظ امر استعمال ہوا ہے۔ لغات القرآن کے مطابق جب مطلب حکم صادر کرنا ہو تو امر کی جمع اوامر ہوتی ہے اور جب اس کے معنی معاملہ، حادثہ، واقعہ یا حالت کے ہوں تو امر کی جمع امور آتی ہے۔ لیکن قرآن پاک میں لفظ اوامر نہیں آتا جبکہ سورہ لقمان میں عزم الامور کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا مطلب انسانی زندگی سے متعلق اہم کام یا معاملات ہیں۔

آیئے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ قرآن پاک نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جامع اصطلاح کو کس کس مقام پر ذکر کیا ہے۔ اس تجزیہ کے بعد ہی ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

1- تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیک کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔ سورہ ال عمران، 03/03/104

2- تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ سورہ ال عمران 03/03/110

3- بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ نیک بخت لوگوں میں سے ہیں۔ سورہ ال عمران 03/03/114

4- جو لوگ ایسے رسولؐ، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر

حرام فرماتے ہیں۔سورہ ال عمران 03/03/157

5- یہ منافق مرد اور عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں۔ یہ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں لوگوں کی بہبود کیلئے خرچ نہیں کرتے۔سورہ توبہ 10/09/68

6- مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار معاون اور دوست ہیں۔وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسوؐل کی بات مانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غلبے والا حکمت والا ہے۔سورہ توبہ 10/09/71

7- بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔ان پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔تم لوگ اس معاہدے (بیع) پر خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے' عبادت کرنے والے' حمد کرنے والے' روزہ رکھنے والے (راہ حق میں) سفر کرنے والے' رکوع و سجود کرنے والے' نیک باتوں کی تعلیم دینے والے اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیں۔سورہ توبہ آیات 10/09/111-112

8- یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں اور زکات دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ تبارک تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ سورہ الحج 17/22/41

9- اے بیٹے! تو نماز قائم رکھنا' اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا' برے کاموں سے

منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آجائے صبر کرنا۔ یہ بڑے تاکیدی کام ہیں۔ (عزم الامور) سورہ لقمان 21/31/17

ان آیات کو پڑھنے کے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

1- کہ ادیان عالم میں پہلی بار اسلامی تعلیمات کے ذریعہ اس بات کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ صاحب ایمان کو معاشرہ کی بہتری کیلئے امر و نہی کا فریضہ سر انجام دینا ہے۔ یہ اصول ایک انقلابی تصور کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ہر زندہ، عاقل، بالغ، راشد، نظریاتی انسانی یعنی مومن مسلم کو معاشرہ کے سامنے جوابدہ قرار دیدیا گیا ہے۔

2- اس ذمہ داری کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ امت مسلمہ کو بہترین امت ہی اس لئے کہا گیا ہے کہ اس امت کے افراد لوگوں کو نیک کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں۔

3- قرآنی تعلیمات کے مطابق لفظ معروف کے مقابلہ پر لفظ منکر آتا ہے۔ ان الفاظ پر لغات القرآن میں بحث موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معروف و منکر کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں اور اس تقسیم و تفریق کا معیار قرآن کریم کے غیر متبدل ضابطے ہوتے ہیں۔

4- اس حوالے سے سورہ الممتحنہ کی آیت قابل غور ہے۔ اس کا مفہوم درج ذیل ہے۔

اے نبیؐ! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیا کریں اور ان کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف

کرنے والا ہے۔

یعنی ہر وہ بات جو احکام قرآن کے مطابق ہو یا اس کی تعلیمات سے متصادم نہ ہو وہ معروف ہوگی اور جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا وہ منکر کی تعریف میں آئے گا۔

6- کسی تحریک کی قدر و قیمت میں اضافہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول پر کاربند ہونے سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس اصول پر کاربند ہونے کا بنیادی فائدہ ہوگا کہ انسان معاملات کے حسن و قبح سے آگاہ ہو جائے گا۔ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا ادراک اس شے کو جاننے سے ہی ہوسکتا ہے۔

7- یہ کہ دین اسلام کا مزاج انفرادی فلاح کی بجائے اجتماعی نجات' اجتماعی فلاح پر ہے۔ ہر فرد بہتر ہو اور جماعت بھی مضبوط ہو۔ امر و نہی کا اصول اتحاد کا موجب بنے گا کیونکہ صاحبان علم اپنی کوتاہیوں سے آگاہ ہو کر ہی ترقی کی منازل طے کرسکیں گے۔

8- امام کو اِس حدیث کی معرفت حاصل تھی جس کے الفاظ کچھ یوں ہے: **مجاری الامور و الاحکام علی ایدی العلماءِ باللہ الامناء علی حلالہ و حرامہ** یعنی تمام امور اور احکام ان صاحبانِ علم کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں جو خدا کے حلال و حرام کے امین ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ امام کا مکہ میں 58 ہجری والا خطبہ بھی بغور پڑھ لیں تاکہ انہیں امر و نہی کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے۔ امام نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

> "اے خداوند! آپ کو معلوم ہے کہ جو کچھ ہم نے کیا ہے نہ یہ حکومت طلبی کیلئے تھا اور نہ ہی مال و جاہ کی زیادتی کیلئے تھا مگر ہم صرف تیرے دین کی علامت اور نشانیوں کو دیکھنے کیلئے اور تیرے شہروں میں اصلاح کو ظاہر کرنے کیلئے اور مظلوموں کو تیرے بندوں (کے ظلم) سے بچانے کیلئے اور تیرے فرائض تیری سنتیں اور تیرے احکام پر عمل کرنے کیلئے اقدام کرتے ہیں۔
>
> "پس اے لوگو! اگر تم نے ہماری مدد نہ کی اور ہمارے ساتھ انصاف

نہ کیا تو ظالم اور جابر حکمران تم پر غالب آ جائیں گے اور تمہارے نبیؐ کے نور کو بجھانے کے در پے ہوں گے۔ پس ہمارے لئے خدا کافی ہے۔ ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی کی طرف پلٹیں گے اور تمام لوگوں کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔'' (تحف العقول، ص239 از طبع حروفی)

علی بن حسین اربلی نے امام حسینؑ کے حوالے سے کتاب کشف الغمہ میں اچھے کاموں کی ترغیب کے سلسلہ میں ایک خطبہ نقل کیا ہے جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''اے لوگو! اچھی صفات میں ایک دوسرے پر فخر کرو اور نیکیوں کی طرف جلدی کرو اور جس نیکی کو بروقت انجام نہ دو اسے شمار نہ کرو اور کامیابی کے ساتھ تعریف کو اپنے لئے حاصل کرو یعنی محنت سے کام لو اور سستی کے سبب سے مذمت حاصل نہ کرو جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے پر احسان کرے اور یہ تصور کرے کہ اس نے شکر خدا کا حق ادا نہیں کیا تو خداوند عالم اس کو اجر عظیم عنایت فرماتا ہے۔

آگاہ رہو! کہ لوگوں کے معاملات خواہشیں تمہارے بس میں ہوں تو انہیں اللہ کی نعمت تصور کرو پس ان کاموں سے تم پر خستگی، تھکن اور ناراحتی اثر انداز نہیں ہونی چاہیے۔

''اور جان لو نیکی انسان کیلئے باعث عزت اور اس کا نتیجہ اجر عظیم ہوتا ہے اگر تم نیکی کو کسی خوبصورت انسان کی شکل میں دیکھتے تو وہ انتہائی خوبصورت، جاذب نظر دلکش اور مسرور کن ہوتی۔ اگر تم بُرائی کو انسانی شکل میں دیکھتے تو وہ انتہائی کریہہ منظر اور بدصورت اور بھیانک شکل میں ہوتی، جس سے دل نفرت کرتے اور آنکھیں رُخ پھیر لیتیں۔

''اے لوگو! جو سخاوت کرتا ہے وہ عزت مند ہوتا ہے اور جو بخل کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔ لوگوں میں سے بہترین سخی وہ ہے جو واپسی کی اُمید رکھے بغیر لوگوں کو کچھ دیتا ہے اور لوگوں میں بہترین معاف کرنے والا وہ

ہے جو قدرت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دے۔ سب سے زیادہ متمسک اور تعلقدار وہ شخص ہے جو اپنے سے جدا شدہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لے۔

''یاد رکھو! درختوں کے تنے اپنی جڑوں کے سبب سے بلندیوں میں جاتے اور پرورش پاتے ہیں پس جو شخص اپنے بھائی کے حق میں نیکی کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ تو وہ قیامت کے دن اس کا اجر پائے گا اور جس شخص نے خدا کی رضا کی خاطر اپنے مسلمان بھائی سے نیکی کی تو خداوند عالم بھی اس کا اجر اس کی مقدار سے زیادہ اس کو دیتا ہے اور مصائب کا رُخ اس سے موڑ دیتا ہے اور جو شخص اپنے مومن بھائی کی پریشانی دور کرتا ہے تو خداوند عالم اس سے دُنیا و آخرت کی پریشانیاں دور کرتا ہے اور جو شخص نیکی کرتا ہے خدا اس کے ساتھ نیکی کرتا ہے اور خداوند کریم نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔''

(کشف الغمہ طبع سنگی، ص184)

امر بالمعروف کا تصور ایک بار ذہن کو سورہ لقمان کی طرف منعطف کرتا ہے۔ لقمان حکیم نبی تو نہ تھے لیکن ان کی تعلیمات کو قرآن پاک نے 21ویں پارہ کی سورہ لقمان میں محفوظ کرلیا ہے۔ لقمان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپ نیک دل حکمران تھے اور شاید سیدنا ہودؑ کی شریعت کے پیروکار تھے۔ رسولوں کی تعلیمات کے علاوہ حضرت لقمان کی تعلیمات کا قرآن میں ذکر معنی خیز ہے۔ یعنی وحی کی روشنی میں انسان جب اجتہادی عمل سے گزرتا ہے تو اس کے فیصلے محکم اور قابل اتباع ہو کر وحی جیسی مقدس اور معتبر دستاویز میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ آیئے ہم سورہ لقمان کی آیت 11 سے 34 کے ترجمہ کو ایک بار پڑھ لیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ معاشرتی توازن کیلئے ایک غیر نبی شخص لیکن بندۂ خدا کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا تو اپنے ہی لئے رہے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز وستودہ صفات ہے۔ اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے

شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دُکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانیو اور دُنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔ اور ان کے طریقہ کی پیروی کرنا جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں، جو کچھ تم کرتے رہے ہو، اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔ اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بیں اور باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ اور لوگوں سے بے رُخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ اور تم نے غور ہی نہیں کیا اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تمہارے اوپر ہر قسم کی ظاہر و باطنی نعمتیں پوری کی ہیں! پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے باب میں بغیر کسی دلیل، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں! اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کریں گے، بلکہ اسی طریقہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ شیطان ان کو

عذاب دوزخ کی طرف بلا رہا ہو۔

اور جو اپنا رُخ فرمانبردار نہ اللہ کی طرف کرے گا اور وہ خوف کار بھی ہے تو اس نے بیشک مضبوط رسی تھامی۔ اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں اور جس نے کفر کیا اس کا کفر تمہارے لئے باعثِ غم نہ ہو۔ ہماری ہی طرف ان سب کی واپسی ہے تو جو کچھ انہوں نے کیا ہوگا ہم اس سے ان کو آگاہ کریں گے۔ اللہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ ہم ان کو کچھ دن برومند کریں گے پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف دھکیلیں گے۔

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے۔ اللہ نے! کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے بلکہ ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ ہی بے نیاز وستودہ صفات ہے۔

اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب وحکیم ہے۔

اور تم کو پیدا کر دینا اور تم کو زندہ کر دینا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا پیدا کر دینا اور زندہ کر دینا، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے جو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک گردش کرتا ہے۔ ایک مقررہ وقت تک اور یہ کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہیں۔ اور بے شک برتر اور عظیم اللہ ہی ہے۔

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے

تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ بیشک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کیلئے اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی طرف کر دیتا ہے تو ان میں کچھ راہ پر رہتے ہیں اور باقی بے راہ ہو جاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کرتے ہیں جو بالکل بدعہد اور ناشکرے ہوتے ہیں۔

اے لوگو، اپنے رب کی پکڑ سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی۔ بیشک اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور نہ اللہ کے باب میں فریب کار تمہیں دھوکے میں رکھے۔ قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے، اور کسی کو بھی پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائے کرے گا اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

ذبح عظیم اور فلسفہ شہادت

رموز بے خودی علامہ اقبال کی معروف کتاب ہے جس میں حادثہ کربلا کے فلسفہ پر فارسی زبان میں 39 خوبصورت اشعار درج ہیں۔ یہ اشعار بہت مقبول ہوئے۔ ان میں سے دو شعر ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ جنہیں قارئین کرام کی نذر کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر
سرِّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود

ترجمہ: اللہ اللہ کیا شان ہے کہ (امام حسینؑ کا) باپ بسم اللہ کی ''ب'' ہے اور بیٹا ذبح عظیم کی تعبیر ہے۔ (امام حسینؑ کی شہادت) سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا راز تھا۔ یعنی امام حسین کی قربانی اس اجمال کی تفصیل تھی۔

علامہ اقبال نے ان اشعار میں سورہ الصّٰفّٰت 107/27/23 میں درج ذبح عظیم والی تلمیح کو منضبط کیا ہے۔ ذبح عظیم کا تعلق ابوالانبیاء سیدنا ابراہیمؑ اور ان کے فرزند ارجمند پیغمبرِ خدا سیدنا اسمٰعیلؑ سے ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ رب العالمین سے اپنے لئے اولاد کی دعا کرتے ہیں...... رب ھب لی من الصلحین...... اور دعا قبول ہوتی ہے آپ کو ایک حلیم بچے کی بشارت ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کا نام اسمٰعیل رکھا جاتا ہے۔ آپ اپنی زوجہ

اور نومولود کو مکہ کے چٹیل میدانوں میں اللہ کے بھروسے پر چھوڑ جاتے ہیں۔ صفا و مروہ کے متعلق تو سب کو معلوم ہی ہے کہ کس طرح کم سن اسماعیلؑ کی حفاظت اور خوراک کیلئے ماں نے دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگائے تھے جو عمل اب حج کا رکن بن چکا ہے اور کس طرح معصوم نبی زادے کے پاؤں کی ٹھوکر سے زمزم کا چشمہ جاری ہوا جو آج بھی ایک دنیا کو سیراب کر رہا ہے۔

جب بچہ بڑا ہوا تو سیدنا ابراہیمؑ تشریف لائے اور انہوں نے اپنے لختِ جگر سے کہا کہ اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتا تیری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے جواب دیا۔ ابا جان! جو حکم ملا ہے اسے بجا لایئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ قرآن میں یہ بھی درج ہے کہ دونوں جب مطیع ہو گئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل گرا دیا تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ یقیناً تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا ہے۔ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ کھلا امتحان تھا...... سورہ الصّٰفّٰت کی آیت نمبر 107 میں پھر وارد ہوتا ہے کہ **فدینہ بذبح عظیم** یعنی (اور پھر) ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے بدلے میں اسمٰعیل کو بچا لیا اور اس بات کا ذکرِ خیر آنے والی نسلوں میں باقی رکھا۔ ذکر کو آنے والی نسلوں میں باقی رکھنے کا حوالہ مزید دو بار اسی سورہ مبارک میں آیت نمبر 119 و آیت نمبر 129 میں بھی درج ہے اور اسی جگہ سیدنا ابراہیمؑ اور آلِ یاسینؑ پر سلام بھی درج ہے۔

آیئے ہم سورہ مبارک کی آیات 74 لغایت 111 کا عام فہم ترجمہ پڑھ لیں:

ہم کو (اس سے پہلے) نوحؑ نے پکارا تھا' تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے بچا لیا' اور اُسی کی نسل کو باقی رکھا' اور بعد کی نسلوں میں اُس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔

اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم

لے کر آیا۔ جب اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا ''یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟''

پھر اُس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا ''آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہو گیا' آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟'' اس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آکر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اُس کے پاس آئے۔ اُس نے کہا ''کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالاں کہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔'' اُنہوں نے آپس میں کہا کہ ''اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔'' انہوں نے اس کے خلاف ایک کاروائی کرنی چاہی تھی' مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھا دیا۔

ابراہیمؑ نے کہا ''میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں' وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے پروردگار' مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔'' (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اُس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اُس سے کہا، ''بیٹا' میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تو بتا' تیرا کیا خیال ہے؟'' اُس نے کہا ''ابا جان' جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے' آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔'' آخر کو جب اُن دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ ''اے ابراہیمؑ، تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اُس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اُس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن

بندوں میں سے تھا۔

اور ہم نے اُسے اسحاقؑ کی بشارت دی' ایک نبی صالحین میں سے۔اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی۔اب اُن دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ کے متعلق قرآن پاک میں بہت سی باتیں درج ہیں جن میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

1- آپ امتحان میں پورے اترے۔

2- آپ اور آپ کی اولاد کو امامت عطا کر دی گئی۔ان کی اولاد میں سے ایک جماعت اطاعت گزار بنی۔02/02/124

3- مقام ابراہیم کو مصلےٰ بنا دیا گیا۔02/02/125

4- خانہ کعبہ کی تعمیر باپ بیٹے نے کی۔23/37/124-129

5- مسلمانوں کیلئے سیدنا ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے۔ 28/60/04

6- آپ کیلئے آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔28/60/04

7- آپ نے مکہ کی آبادی اور وہاں خوراک مہیا ہونے کی دعا کی اور اس شہر کو امن والا بنانے کی بھی دعا کی تھی۔12/14/35

ان مقامات کے پیش نظر قارئین کرام سیدنا ابراہیمؑ اور آپ کی اولاد کے مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔ ذبح عظیم سیدنا ابراہیمؑ کی اولاد ہی کے حوالے سے ہے اور جناب رسالتمآب ﷺ دعائے ابراہیمؑ کا ثمرہ ہیں جبکہ سیدنا امام حسینؑ حضورؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔اور امام حسینؑ بھی سیدنا ابراہیمؑ و سیدنا اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے تھے۔آپ کی راہ حق میں قربانی سیدنا ابراہیمؑ کے بہت بعد پیش کی گئی جس کا ذکر آنے والی نسلوں میں زندہ و پائندہ ہے لہٰذا علامہ نے قرآن کی اس پیشینگوئی کو اپنے اشعار میں محفوظ کر کے کہا ہے کہ کربلا کی داستان جسے آنے والے زمانے میں زندہ رہنا ہے دراصل اس واقعہ کی تعبیر ہے جس کا

قرآن پاک نے چند آیات میں سیدنا ابراہیم کے حوالے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔سیدنا اسماعیلؑ کی مجوزہ قربانی خانہ کعبہ سے باہر ہوئی تھی اور امام حسینؑ کی قربانی بھی خانہ کعبہ چھوڑنے کے بعد ہی واقع ہوئی تھی۔

ذبح عظیم کے حوالے سے غور طلب بات یہ ہے کہ ابوالانبیاء سیدنا ابراہیمؑ کو خواب آیا کہ وہ اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہے ہیں اور بیٹے نے کہا کہ آپ کر گزریئے جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔اس کا مطلب واضح ہے کہ قربانی کا حکم منجانب اللہ تھا اور باپ نے خواب میں اس حکم کا عملی اظہار بھی دیکھ لیا لیکن ذبح کا عمل جسمانی طور پر مکمل نہیں ہوا تھا۔ اگر ذبح کا عمل ہو جاتا تو پھر فدیہ کی ضرورت نہ تھی۔اس خواب کی تعبیر اس وقت ہونا تھی جبکہ اس قربانی کو پیش کرنے کا ماحول بھی تیار ہوتا۔سیدنا اسمٰعیلؑ کے وقت جبکہ خانہ کعبہ تعمیر ہو رہا تھا وہاں نہ تو کوئی نظام حکومت قائم تھا اور نہ ہی نظام الٰہی سے کسی قسم کا انحراف ہو رہا تھا۔ فدیہ اس وقت ہی دیا جاتا جب کہ حالات اس خواب کی عملی تعبیر کا تقاضا کرتے ہوں۔

یہ بحث ہمیں قربانی کے حوالے سے فلسفہ شہادت کی طرف لے آتی ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم اس مقام پر لفظ شہادت کے معانی اور قرآنی تصور سے بھی آگاہی حاصل کرلیں۔

لفظ شہید یا شہادت کا مادہ ش۔ہ۔د ہے۔مصباح اللغات کے مطابق شہید کا مطلب حاضر، گواہی میں امانت دار، اللہ کی راہ میں مقتول ہے۔لغات القرآن کے مطابق شَهِدَ يَشْهَدُ کے معانی حاضر ہونا، موجود ہونا اور شہادت کا مطلب جو کچھ کسی کو معلوم ہو (بصیرت یا بصارت کی بنا پر) اسے ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا۔ایسا کرنے والے کو شاہد اور شہید کہتے ہیں۔شہید کے معنے گواہی دینے یا تصدیق کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور قسم کھانے کے بھی۔ شہد کے معنی فیصلہ کرنے کے بھی آتے ہیں (ملاحظہ ہو سورہ یوسف آیت نمبر 26) اس اعتبار سے اللہ فیصلہ کرنے والا ہے۔نیز اس کے معنی نگہبان بھی ہیں (سورہ بقرہ آیت 143) اس لفظ کے استعمال کی صورتیں کتنی ہی متنوع کیوں نہ ہوں ان میں سے ہر ایک میں موجود ہونا اور حاضر رہنا، نظروں کے سامنے رہنا یا رکھنا کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔

ان معانی کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہادت میں نظریہ کے اظہار کو

بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انسان اپنے عقاید، سوچ، فکر اور لائحہ عمل کا صحیح صحیح اعلان کرتا ہے اور اس طرح اپنی وابستگی کا واشگاف الفاظ میں اظہار کر دیتا ہے تا کہ سند رہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ شہادت کا تصور زندگی سے منسلک کر دیا گیا ہے کیونکہ مردہ کوئی گواہی نہیں دیتا۔ ملت اسلامیہ کو سورہ البقرہ آیت 01/02/143 میں شہداء علی الناس یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی قوم قرار دیا گیا ہے۔ شہداء علی الناس کی اصطلاح بھی زندہ قوم کیلئے استعمال ہوئی ہے۔ قرآن نے کہیں بھی شہادت کو موت کے ساتھ منسلک نہیں کیا۔

اس پس منظر میں ہم فلسفہ شہادت اور مقام شہادت کی بات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارا حوالہ قرآن وسنت ہے اور ہمارا موضوع ذات حسینؑ ہے۔ مندرجہ بالا معانی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سننے، سمجھنے اور دیکھنے والا شخص ہی گواہ کی اہلیت حاصل کر سکتا ہے اور گواہ بننا انسان کی ذات میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ گواہ کیلئے حکم ہے کہ وہ سچی بات کہے۔ گواہی کے متعلق قرآنی احکام ملاحظہ ہوں۔

1- سورہ بقرہ آیت 42: اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ۔ تمہیں تو خود اس کا علم ہے۔

2- سورہ بقرہ آیات 283-282: اور گواہوں کو چاہیے کہ جب انہیں بلایا جائے تو انکار نہ کریں اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔

3- سورہ النساء آیت 135: اے ایمان والو! عدل وانصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور اللہ کی خوشنودی کیلئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ اگرچہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ یا عزیز واقرباء کے خلاف ہو۔

4- سورہ المائدہ آیت 8: اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ۔ راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔ کسی قوم کی عداوت تمہیں انصاف کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ عدل کیا کرو جو پرہیزگاری سے زیادہ نزدیک ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

-5 سورہ فرقان آیت 71: (عبادالرحمٰن کی نشانی) اور یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور۔

-6 سورہ المعارج آیت 33: (مومنین کی صفات کی نشاندہی کرتے ہوئے) اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

اب آپ دیکھیں کہ سورہ الانفعال کی آیت 22-21 میں قرآن تنبیہ کر رہا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہا مانو اور روگردانی نہ کرو سنتے جانتے ہوئے اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں۔ یہ بدترین لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سب کچھ جان کر، سن کر اور سمجھ کر یہ لوگ ان باتوں کو بیان کرنے میں سستی یا کوتاہی برتتے ہیں۔

امام حسینؑ کو شدید احساس تھا کہ زندگی اور عمر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ زندگی اللہ تبارک تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو موت کے بعد بھی انسان کو مل سکتا ہے اور یہ ہی وہ انمول تحفہ ہے جو ہر اس بندے کا مقدر بن سکتا ہے جو اللہ عزوجل کی راہ میں جان قربان کر سکتا ہو۔ جان انسان کا نہایت قیمتی اور انمول تحفہ ہے اگر چہ اس عارضی دنیا میں یہی چیز عارضی نوعیت کی بن جاتی ہے لیکن وہ رحیم و کریم اسی عارضی تحفے کو یعنی شہید کی زندگی کو مستقل حیثیت عطا کر دیتا ہے۔ دوسرے انداز سے دیکھیں تو ہماری عمر میں زندگی کتنے عرصہ کیلئے آتی ہے۔ موت کے بعد عمر کا دورانیہ ختم ہو جاتا ہے لیکن زندگی باقی رہتی ہے۔ رواں دواں۔ یہ زندگی ہر انسان کے ساتھ آگے جائے گی اور ہمارے مرنے کے بعد دوسری مخلوق کے اندر اس زمین پر باقی بھی رہے گی۔ یہ زندگی نسل انسانی کا مشترکہ اور جاری سرمایہ ہے۔ جو فرق موت و حیات میں ہے وہی عمر اور زندگی میں ہے۔

امام کی شہادت نے تقدیر کا مسئلہ حل کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ جو بھی اقتدار پر قابض ہو جائے وہی اولوالامر ہے جس کی اطاعت واجب ہو جائے گی یعنی کیا اسلام میں تسلط بالجبروت یعنی قہر و جبر سے مسلط ہونے والا جائز اور قانونی حاکم ہے یا یہ کہ اہل ایمان میں خلافت شوریٰ کے بعد ہی قائم ہو سکتی ہے۔ حسینؑ نے اپنی جان کی قربانی دے کر تسلط بالجبروت کو اسلام کی سیاسی زندگی کا رکن نہیں بننے دیا۔

قرآن نے سورہ الرعد آیت 13/13/11 میں اصول بیان کیا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود بدلنے کا بندوبست نہ کریں۔ یہی کیفیت سورہ الانفعال 10/08/53 میں اس طرح بیان ہوتی ہے: اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم پر کوئی نعمت انعام فرما کر پھر بدل دے جب تک کہ خود وہ اپنی اس حالت کو نہ بدل دیں جو کہ ان کی اپنی تھی۔ یہ سب کچھ اس اصول کے مطابق ہی ہے جسے سورہ حم السجدہ 24/41/46 میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نتیجہ دراصل عمل کے اندر ہی پنہاں ہوتا ہے کیونکہ انسان جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ کیونکہ ثمر بیج کی تہوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ انسان کو عمل کرنے کی آزادی ہے لیکن نتیجہ مرتب کرنا فطرت کے قانون کا کام ہے۔ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور نتیجہ بعد میں برآمد ہوتا ہے۔ جو لوگ زندگی پر جمود طاری کر دیتے ہیں وہ محکوم ہو جاتے ہیں۔ عدم رواداری ان کا مقدر بنتی ہے۔ دہشت گردی اور ظلم اور فساد ان کا وطیرہ بنتا ہے اور پھر وہ لوگ خوف وحزن کا شکار ہو کر سخت عذاب میں جکڑے جاتے ہیں۔ اس عذاب کو قرآن کبھی عذاب مہین کا نام دیتا ہے کبھی یہ عذاب الیم بنتا ہے اور بسا اوقات یہ عذاب عظیم بن جاتا ہے۔

قرآن ایک اور اصول پیش کرتا ہے جسے سورہ بنی اسرائیل 15/17/72 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: جو کوئی اس جہان میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا اور راستے سے بہت بھٹکا ہوا رہے گا۔ اسی کے ساتھ سورہ الانفعال 10/08/42 میں درج اصول بھی ملاحظہ کر لیں: جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل و برہان پر زندہ رہے اور جسے مرنا ہے وہ بھی دلیل پر ہلاک ہو۔

قرآن پیشگی اطلاع کے بغیر ہلاکت کی خبر نہیں دیتا۔ سورہ بنی اسرائیل اور سورہ الشعراء کی آیات 209-208 میں یہ اصول درج ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کرنے سے پہلے نتائج سے آگاہ کرنے والا بھیجا جاتا ہے کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ظلم کرنے والے نہیں ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم امام حسینؑ کی حیات طیبہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پہلے دور

رسالت نظر آتا ہے۔ حسین اپنے ناناؐ کے زیر سایہ پرورش پا رہے ہیں اور آپؐ کی آنکھوں کا نور ہیں دوسرا دور خلافت راشدہ کا وقت ہے اور ازاں بعد تنزل کا دور دیکھتے ہیں۔ ضد انقلاب دور یعنی حسینؑ تین ادوار کے گواہ ہیں۔ حسین ذبح عظیم کی تعبیر ہے۔ حسینؑ وارث رسول وعلی و بتول ہے۔ حسین اہل بیت نبوۃ ہے۔ حسین صحابی ہے۔ حسین عظیم ذمہ داری کا وارث ہے۔ تنزیل وحی کا گواہ اور نفاذ شریعت کا گواہ بھی ہے۔ حسین ایک نئے نظام کی تشکیل کا گواہ اور کارکن بھی ہے۔ حسین کی ذمہ داری کی نوعیت کیا ہے؟

حسینؑ غور کرتے ہیں کہ نبی کی آمد کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ قرآن ہر قاری کے سامنے مقاصد بعثت کے سوال کو پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ترجمہ سورہ الاعراف 09/07/157

☆ جو لوگ ایسے رسولؐ اور نبیؐ امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

☆ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دیتے ہیں اور

☆ پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور

☆ ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔

☆ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور

☆ اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے' ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔ اس کے علاوہ امام حسین دیکھتے ہیں کہ:

☆ رسولؐ لوگوں کے معاملات اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ (سورہ البقرہ آیت 213)

☆ رسولؐ اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ (سورہ ال عمران آیت 193)

☆ رسول خدا کی عبدیت کی تعلیم دیتا ہے (سورہ یوسف آیت 40)

☆ رسولؐ کسی انسان سے اپنی عبادت نہیں کراتا۔ (سورہ ال عمران آیت 79)

☆ رسولؑ لوگوں کے سامنے وحی اور وحی کا پیغام پیش کرتا ہے۔(سورہ طلاق آیت 11)

☆ رسولؑ لوگوں سے اجر نہیں مانگتا سوائے مودت القربیٰ کے۔(سورہ الشعوریٰ آیت 23)

☆ رسولؑ پیروکاروں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔(سورہ جمعہ آیت 2)

☆ رسولؑ لوگوں کو تزکیہ نفس کے عمل سے گذارتا ہے۔(سورہ جمعہ آیت 2)

☆ رسولؑ قائم الیل ہو کر غور وفکر کرتا ہے۔(سورہ مزمل آیات 9-1)

☆ رسولؑ کا کام ابلاغ ہے' جبر نہیں ہے۔(سورہ البقرہ آیت 256)

☆ رسولؑ اقامت صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرتا ہے۔(سورہ النساء آیت 104)

☆ رسولؑ مومنین کے اعمال کا نگران ہوتا ہے۔(سورہ البقرہ آیت 142)

☆ رسولؑ بشارت دیتا ہے یعنی تبشیر کرتا ہے۔اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ احکام الٰہی کی پیروی کا نتیجہ خوش گواریاں ہوتی ہیں اور اس کے احکام سے انکار (تنذیر) تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

☆ رسولؑ دعائیں کرتا ہے۔(سورہ طٰہٰ آیت 114)

☆ رسولؑ قانون الٰہی کی اطاعت کرتا ہے اور کراتا ہے۔(سورہ النساء آیت 64)

☆ رسولؑ کو غلبہ دین کیلئے بھیجا گیا۔(سورہ الصف آیت 9)

☆ رسولؑ ان مراحل سے گذرنے کیلئے مشکلات کا سامنا بھی کرتا ہے۔(سورہ البقرہ آیت 214 وسورہ الم نشرح آیت 2)

مقاصد بعثت پر غور کرنے کیلئے قصص القرآن کا جائزہ بھی ضروری ہے۔دراصل قرآن پاک میں درج انبیاء کے واقعات جنہیں عرف العام میں قصص القرآن کہا جاتا ہے اقوام کے عروج وزوال کے محرکات' اسباب اور نتائج سے بحث کرتے ہیں۔ان واقعات میں سیدنا موسیٰؑ کا قصہ کم از کم ان تین اساسی عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جو بنی نوع آدمؑ کی اجتماعی ترقی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ان تینوں عوامل کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ فرعون ملوکیت کی علامت ہے جو لوگوں کو سیاسی سطح پر غلام بنائے رکھتا ہے۔قارون اس جماعت کا نمائندہ ہے جو ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے مخلوق خدا کو رزق سے محروم رکھتا ہے اور

ہامان اس برہمنیت کا آئینہ دار ہے جو فرعون اور قارون کے ناجائز قبضہ کو جائز قرار دیتا ہے اور لوگوں کو صبر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور انہیں باور کراتا ہے کہ انہیں اگلے جہاں جنت ملے گی اور اسطرح فرعون اور قارون کے اختیارات کو مذہبی سطح پر جواز مہیا کر دیتا ہے۔

انسان کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ غلامی ہے۔ فکری غلامی' اقتصادی اور سیاسی غلامی۔ قرآن حریت فکر اور تدبیر منزل کا درس دیتا ہے۔ قرآن نے دنیا کو تکریم آدم کا اصول عطا کیا۔

لقد کرمنا بنی ادھم وحملنھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبت وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا

(ترجمہ) یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو بڑی عزت دی۔

(یہ شرف وفضل بہ حیثیت ابن آدم کے ہر انسان کو حاصل ہے یعنی یہ شرف متعدد اعتبار سے ہے چاہے بندہ مومن ہے یا کافر' عورت ہے یا مرد کیونکہ یہ شرف دوسری مخلوقات یعنی حیوانات' نباتات اور جمادات کے مقابلہ پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو جو جسم دیا ' جو عقل دی اور تمیز کا مادہ دیا اور صاحب ارادہ بنایا وہ اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے) اور انسان کو خشکی اور پانی میں چلنے کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی۔

اس آیت مبارک سے کم از کم یہ ثابت ہوا کہ:

1- انسان کو بعض صلاحیتوں کے باعث قابل عزت بنایا اور عزت کا یہ جامہ انسان کا مقدر ہے تاوقتیکہ وہ اس جامہ کو از خود تار تار نہ کرے۔

2- انسان کو زمینوں اور پانیوں پر چلنے پھرنے کی آزادی دی۔

3- انسان کو معاشی آزادی عطا کر دی۔

آیئے اب ہم آزادی کے قرآنی تصور کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ:

☆ اعلیٰ اقدار کی بالادستی ہو۔

☆ خوش گوار چیزیں حلال ہوں (یعنی میسر ہوں اور انسانی دسترس سے باہر نہ ہوں) اور

خبائث حرام ہوں (یعنی ان کی بیخ کنی کی جائے)

☆ تقلید واوہام کی زنجیریں ٹوٹ جائیں۔02/02/170

☆ غور وفکر اور تفقہ کی صلاحیت پیدا ہو۔07/06/98

☆ حریت فکر اور تدبیر منزل کی آزادی ہو۔30/90/10

☆ رزق لوگوں کیلئے کھلا رہے۔30/90/10

☆ احبار و رہبان کی فریب کاریوں دلوں سے نجات ہو۔ یعنی سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سے نجات حاصل ہو۔(سورہ توبہ 10/09/34)

☆ انسان محکم قانون کے مطابق فیصلے کرنے کا اہل ہو جائے۔سورہ المائدہ 07/05/42, 44-47

☆ انسان کو اس کی محنت کا پھل بھی ملے گا اور اس کی ضروریات کے مطابق بھی ملے گا۔

☆ خوف وحزن سے نجات حاصل ہوگی۔

☆ کوئی انسان یا طبقہ استحقاق کے بغیر اقتدار پر قابض ہو کر احکام خداوندی کو معطل کر دیتے ہیں۔09/07/145-147

حسینؑ کو معلوم تھا کہ قرآن نے اسلام کی اس طرح تعریف کی ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ الانفعال 10/08/161-165۔ترجمہ حسب ذیل ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین مستحکم ہے جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جو اللہ کی طرف یکسو تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔(161)

آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔(162)

اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔(163)

آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں

حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے رب کی پاس جانا ہوگا۔ پھر وہ تم کو جتلائے گا جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔(164)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔ بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔(165)

محولہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اس نظام کا پروگرام ہے جو اللہ تبارک تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔ اس نظام کے قیام کیلئے اپنی تمام تر کوششوں کو وقف کرنا وقت کے امام کی ذمہ داری ہے۔ ساری زندگی جس میں نماز روزہ مرنا جینا سب کچھ شامل ہے اللہ تبارک تعالیٰ ہی کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق ہو۔ اسے ہم استخلاف فی الارض ہی کا نام دیں گے۔ ختم نبوت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ امت آگے بڑھ کر کارِ رسالت کے فرائض سر انجام دے۔ حضورؐ کے وصال سے بلاشبہ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوا ہے۔ نفاذ احکام الٰہی کا کام تو جاری رہنا ہے۔ نماز بار بار کیوں پڑھی جاتی ہے۔ روزے اور حج ہر سال کیوں لوٹ کر آتے ہیں۔ خمس و زکوٰۃ ہر سال ادا کرنا ہوتا ہے۔ معاشرتی توازن برقرار رکھنا ہر گھڑی ضروری ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا:

انی لرسول للّٰہ الیکم خاصۃ و الی الناس کافۃ

یعنی میں یقیناً تمہاری طرف (اپنے ہم عصر احباب سے مخاطب ہو کر) اور بالعموم بنی نوع انسان کی طرف (جو بھی نسلیں آتی رہیں گی) بھیجا گیا ہوں۔

یہاں سورہ البقرہ کی آیت 143 **لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا**۔ یعنی تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم سب پر گواہ ہے) سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اسی حکم کے تحت حضورؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرام پر اقامت دین کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جو نسل در نسل مسلمانوں کو ورثہ میں منتقل ہوتی جا رہی

ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی پر ہمارے رسولؐ مقبول گواہ ہیں یعنی انہوں نے روز قیامت یہ حقیقت بیان کرنی ہے کہ کون کون سی پوڑی نے اس فرض کی ادائیگی میں کیا کچھ کیا۔

قرآن کا منشا یہ ہے کہ دین کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جائے۔ دین سارے کا سارا ہماری زندگی پر لاگو ہو اور یہ دین خالص اللہ ہی کے لئے ہو۔ سورہ الانفعال کی 10/08/39 کا یہی مطلب ہے۔ اس آیت کی وضاحت میں مطالب الفرقان جلد سوم میں لکھا ہے کہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم سب کے سب بلا استثناء' اجتماعی طور پر' اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور اپنے اندر فرقے یا پارٹیاں مت پیدا ہونے دو کہ فرقہ پرستی شرک ہے اور پارٹی بازی خدا کا عذاب ہے۔ تم ذرا اپنی قبل از اسلام کی حالت کو سامنے لاؤ جب تم ایک امت کی بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے تمہاری اس حالت میں ایسا نظام زندگی عطا کیا جس سے تم میں' ظاہر داری کا میکانکی طور پر اتحاد ہی نہیں ہوا' بلکہ تمہارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح ایک نظام کے تابع ایک برادری بن جانا کتنا بڑا انعام خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظام خداوندی نے تمہیں اس سے گرنے سے بچالیا۔

مومن کی خواہش ہوتی ہے کہ جس طرح قرآن نے اپنے مخاطبین کو جہالت سے روشنی کی طرف آنے میں مدد دی اور جاہلیت کو عرفان کی کیفیت میں بدلنے کی صورت کی، اس کو بحال رکھا جائے اور اگر کسی وقت رہنما یہ محسوس کرے کہ پیمانے بدل گئے ہیں یا اللہ تبارک تعالیٰ کے احکام میں تبدیلی آ گئی ہے، سنت رسول اللہؐ سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے، حلال کو حرام اور حرام کو مندوب قرار دیا جارہا ہے تو پھر امام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو حاضر و موجود کی طرف متوجہ کرے اور ان کے احساس کو جھنجھوڑے۔ اسی لئے علامہ اقبال کہتے ہیں:

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

امام حسینؑ کے قیام و شہادت کا بنیادی مقصد خلافت الٰہیہ کی بازیابی تھی۔ یہ وہی خلافت تھی جس نے عربوں کو حضورؐ کے توسط سے خدمت انسانی کے اعلیٰ ترین ادارے یعنی انداز حکمرانی کے طور طریقے سکھائے تھے لیکن بقول اقبال بنوامیہ کی راہ گم کردہ خلافت اصل راستے سے ہی بھٹک گئی:

عرب خود را بہ نور مصطفیؐ سوخت
چراغ مردۂ مشرق برا فروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کردہ
کہ اوّل مومناں را شاہی آموخت

حسینؑ ہی کے قیام کا اثر تھا کہ علام اقبال پر خلافت کے راز افشا ہوئے۔ دراصل حسینؑ ہی خلافت راشدہ کا تسلسل تھا۔ حسینؑ ہی نے سبق دیا تھا کہ خلافت مومن پر حلال ہے جبکہ ملوکیت مومن پر حرام ہے۔

حسینؑ ہی سیدنا موسیؑ کی زبان بن کر ملوکیت سے الجھا تھا۔ اسی لئے ارمغان حجاز میں اقبالؒ لکھتے ہیں:

در افتد باملوکیت کلیمے
فقیر بے کلاہے بے گلیمے
گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر
بگیرد کار صرصر از نسیمے

یعنی ایک کلیم، جوحق بات بول سکے اور بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے حق کی بات کہہ سکے، کبھی کبھار ملوکیت کے ساتھ ٹکر لے لیتا ہے۔ وہ کلیم فقیر و بے نوا ہوتا ہے جسکے پاس نہ تاج ہوتا ہے نہ دُنیا کا کوئی مرتبہ اور وہ ہوتا بھی بے سروسامان ہے لیکن یہ قدرت کا کھیل ہے کہ ایک مردِ بے نوا کسی طاقتور بادشاہ کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔

اقبال اس سے آگے لکھتے ہیں...... آج کے حالات کے پیش نظر جبکہ بقول ان کے قافلہ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں...... اقبال کہتے ہیں کہ انسان آج بھی دُنیا میں غلام ہے۔

اس کا نظام ناپختہ اس کا کام نامکمل ہے۔ میں اس گیتی پناہ کے فقر کا غلام ہوں جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے:

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کاوش ناتمام امت
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

امام حسینؑ کی شہادت کی بہت سی جہتیں قابل غور ہیں۔ پہلے ہم قرآن پاک کی روشنی میں جنگ کے پہلو کا جائزہ لیتے ہیں۔ چار مہینوں میں جنگ نہ کرنے کے حکم موجود ہے۔ چار محترم مہینوں میں ماہ محرم الحرام بھی شامل ہے۔ قرآن نے خانہ کعبہ میں جنگ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے اور اسی جگہ سورہ بقرہ 194-2/2/190 میں یہ بھی درج ہے کہ اگر فریق مخالف نہ لڑے تو تم بھی نہ لڑو۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے حد سے تجاوز کرنے والوں کو سخت تنبیہ بھی دی ہے۔ اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف امام نے خانہ کعبہ کی حرمت کے پیش نظر حج کو عمرے میں تبدیل کر کے خانہ کعبہ کو چھوڑا آپ کے پر امن قافلہ پر متبرک مہینہ میں جنگ مسلط کر کے قرآنی احکام کی خلاف ورزی بھی کی گئی۔ انہی آیات میں یہ اصول بھی بیاں ہوا ہے کہ جنگ اس وقت ہی ہو گی جبکہ یہ فی سبیل اللہ ہو۔ طاغوت یا شیطان کی خاطر یعنی ظلم و عدوان کو پروان چڑھانے والی جنگ کو قرآن فی سبیل الطاغوت قرار دیتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ رسولؐ مقبول کی رحلت کے تیس برس بعد ہی آپ کے نواسے کے ساتھ قرآنی احکام کے منافی کارروائی کی گئی۔

انہی آیات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر ایسی صورتحال پیدا ہو جائے کہ امن اور حقوق بشری کا تحفظ ممکن نظر آتا ہو تو جنگ کو روک دینا چاہیے۔ کربلا کے واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف امام حسینؑ کے پاس جنگ کرنے کا نہ تو سامان تھا اور نہ ہی ان کے اہل خانہ کی موجودگی کسی جنگ کا پیش خیمہ قرار دی جاسکتی تھی۔ آپ نے نہ تو جنگ میں پہل کی نہ کسی کو گھر سے بیدخل کیا بلکہ آپ مدینہ منورہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے حالانکہ لا اکراہ فی

الدین کا حکم اس وقت بھی نافذ تھا۔ مکہ سے روانگی کے بعد عشرہ محرم تک آپ نے مختلف تجاویز بھی دیں لیکن آپ کو گھیر گھار کر میدان کربلا میں محصور کر دیا گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ امام کا عزم واستقلال ہر گذرنے والے لمحے کے ساتھ مضبوط تر ہوتا گیا۔ آپ کے اہل وعیال بھی امتحان سے گذر رہے تھے اور دیئے بجھ جانے کے باوجود جان نثاروں نے فیصلہ کیا کہ سچائی کے راستے کو وفا کے خون کے چراغوں سے منور کیا جائے گا اور شہیدوں کا خون دین ابراہیم کے خوبصورت شجر کو کھاد کا کام دے گا۔

اس قربانی کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ قربانی اکیلے امام عالی مقام کی نہ تھی۔ یہ اجتماعی قربانی تھی' بوڑھے' نوجوانوں اور بچوں کی ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کی اسیری بھی شامل تھی۔ عابد بیمار کی بیڑیاں بھی اسی قربانی کا حصہ تھی۔ خیموں کا جلنا' مال ومتاع کا لٹنا' دربدر پھرایا جانا۔ یہ سب کیا تھا۔ قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو لوگ اپنی اغراض اور ذاتی خاندانی فوائد کیلئے جنگ کرتے ہیں وہ شیطان کی خاطر' طاغوت کی خاطر' ظلم وعدوان کی خاطر جنگ کرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ امام حسین کسی خاندان یا قبیلہ کی برتری کی جنگ لڑنے نہیں جا رہے تھے۔ وہ تو خانوادہ رسولؐ کے فرزند تھے اور بار بار آپ نے مخالفین کو اس امر کی طرف متوجہ کیا تھا تا کہ اسی بہانے دشمن عقل کے ناخن لے سکے۔ کیا رسولؐ نے اپنے خاندان کیلئے بادشاہت کا حکم دیا تھا؟ کیا رسولؐ نے حکم دیا تھا کہ ان کی زندگی میں ان کے کسی وارث کے حق میں بیعت کر لی جائے اور وہ نامزد شخص ولی عہد کے عہد پر براجمان ہو۔ سوال یہ ہے کہ بدعت کون کر رہا تھا۔ دین حنیف میں رخنے کون ڈال رہا تھا۔ جواب ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بنوامیہ کیلئے سیاسی اختیار محفوظ کرنے کا کھیل تھا۔ ایک طرف اس معرکہ میں مادی آلائشیں اور ذاتی مقاصد تھے جبکہ دوسری طرف روحانی تقاضے تھے اور دین اللہ کے مقاصد کی سربلندی تھی۔

امام حسینؑ کی کوئی ذاتی منفعت نہ تھی۔ آپ تو ہندوستان جانے کو تیار تھے۔ آپ موت سے ڈر کر ہندوستان نہیں جانا چاہتے تھے۔ اگر موت ہی کا خوف ہوتا تو مدینہ بیٹھ کر اپنی شرائط پر بیعت کر لیتے۔ لیکن یزید کو آپ کی ذات سے خوف تھا۔ ملوکیت درویشی سے

خائف تھی۔ کفر ایمان سے خوفزدہ تھا۔ تاریکی روشنی سے گھبرا رہی تھی اور باطل حق کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یزید کو بیعت چاہیے تھی یا امام کا سر۔ کوئی درمیانی راستہ اسے قابل قبول نہ تھا۔ بنو امیہ نے حدود کے تمام ضابطے توڑ دیئے۔ معاملہ حسینؑ کی شہادت پر ختم نہیں ہوتا۔ شام غریباں کا بوجھ ہی کچھ کم نہ تھا۔ اس مقام پر آل رسولؐ کی خواتین کا کردار شروع ہوتا ہے۔ سعیدہ زینب اب تمام تر کمزوریوں کے ساتھ دشمنان رسولؐ کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ان کے امتحان کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ علیؑ کی بیٹی اس امتحان میں بھی پوری اتری اور انہوں نے اپنے کردار اور تقاریر سے امام حسینؑ کے فلسفہ اور مشن کو عوامی سطح پر پہنچایا۔

دوسوال

سورہ ہود 12/11/78,81 میں قرآن پاک نے اپنے قاری کی توجہ کیلئے دوسوال محفوظ کر لئے ہیں پہلا سوال آیت نمبر 78 میں پیش ہوتا ہے:

الیس منکم رجل رشید

کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی موجود نہیں؟

دوسرا سوال آیت نمبر 81 میں اس طرح درج ہے۔

الیس الصبح بقریب

کیا صبح بالکل قریب نہیں؟

اس سورہ مبارکہ میں بھی اقوام کے عروج وزوال کے متعلق بات کی گئی ہے۔قصہ حضرت ہودؑ کا شروع ہوتا ہے جن کو قوم عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔آپ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اللہ تبارک ہی عبادت کے لائق ہے (۲) اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے (۳) باطل عقائد چھوڑ کر سچائی کی طرف لوٹنا چاہیے کیونکہ اس ذات پاک نے ہی اس کائنات کو پیدا کیا اور اس میں نظام ربوبیت کو جاری کیا اور ربّ صراط مستقیم پر ہے۔یعنی اس کائنات میں قوانین الٰہی ہی کی بالادستی ہے (۴) اگر کوئی قوم رسول کے پیغام اور ہدایت کی پرواہ نہیں کرتی تو اللہ اس قوم کی جگہ کسی اور قوم کو لانے پر قادر ہے اور (۵) یہ کہ اللہ کے منعفت بخش پروگرام کی پیروی کرنے کی بجائے جابر،ظالم حاکموں کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔

جناب ہودؑ کے علاوہ حضرت صالح اور حضرت ابراہیمؑ کا بھی ذکر آتا ہے لیکن ہمارے سامنے جو دو سوال ہیں وہ کربلا کے حوالے سے بھی توجہ طلب ہیں۔

ایک قوم جس میں ایک نبی مبعوث ہوتا ہے وہاں یہ سوال کہ ان تعلیمات کے نتیجہ میں تم میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اللہ تبارک تعالیٰ کے قوانین مکافات عمل پر غور کرے، سابقہ اقوام کی تباہیوں کے احوال پر فکر کرے، کائنات میں پھیلے ہوئے ذرائع پیداوار و انعامات سے مخلوق خدا کیلئے استفادہ حاصل کرے، زمینی حقائق کا ادراک حاصل کرے، بعثت کے مقاصد سے آگہی، اعلیٰ اقدار کا علم حاصل کر کے خدا کے بلا معاوضہ بھیجے ہوئے پیغام کی پیروی کرتے ہوئے انسانی ترقی کو یقینی بنا سکے۔ اس سوال کو محفوظ کرنے کے عمل کے پیچھے حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان اپنے زمینی سفر میں کئی بار ٹھوکریں کھائے گا اور اسے ان اسباب کی طرف متوجہ کرنا جو اس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کو اس پروگرام کے خدوخال سے متعارف کرانا ضروری ہے جو انسان کی اجتماعی نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس سورہ پاک میں بھی اس اصول کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے بھیجا ہوا حکم ٹل نہیں سکتا۔ عاد کی قوم پر صبح کے وقت تباہی آنا تھی جو آ کر رہی لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ قرآنی نصوص کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ عام فہم زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ متن ایک ظاہری معنی ادا کرتا ہے جبکہ اس کا ایک باطنی پہلو بھی ہوتا ہے۔

لٰہذا یہ سوال کہ کیا صبح بالکل قریب نہیں؟ کا باطنی پہلو ہمیں کچھ عوامل کی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے۔ یہ سوال کئی سوالوں کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال نہ صرف ہماری سمت متعین کرتا ہے بلکہ ہمیں تاریخی شواہد، تاریخی فلسفہ اور حالات کی تغیّر پذیری سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اس سوال کے اندر جواب بھی پوشیدہ ہے اور سوال یہ کہہ رہا ہے کہ آؤ مجھے ٹٹولو اور فلاح پا جاؤ۔

ایک صبح تو وہ ہوتی ہے جو آسمان کے تاروں کے بجھنے اور تاریکیوں کے ختم ہونے کے بعد نرم اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ، پرندوں کی چرچراہٹ، شبنم کی تازگی اور کلیوں کی چٹک لئے نمودار ہوتی ہے۔ یہ ہر روز کی صبح ہے جو صبح کاذب کے بعد اپنی گردش

پوری کر کے انسان کو نئے عزم کے ساتھ دن شروع کرنے کی نوید دیتی ہے۔ لیکن ایک صبح اور بھی ہوتی ہے جس کے انتظار میں زندگی کے مہ وسال گزر جاتے ہیں اور اس کی انتظار میں ایک ایک لمحہ بیداری کے عالم میں گزارنا پڑتا ہے کیونکہ ایک بڑی ذمہ داری کی ادائیگی کا وقت آنے والا ہوتا ہے جس کی طرف سورہ مزمل 2-29/73/1 اشارہ کر چکی ہے۔ یہ وہ صبح ہوتی ہے جس کیلئے سالک اور مجاہد کو فریضہ سحری ادا کرنے کا پیغام مل چکا ہوتا ہے۔

یہ وہی صبح ہے جس کیلئے سورہ الاحزاب 22/33/72 میں درج ہے کہ ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر زمینوں پر اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اس امانت کے بوجھ کو اٹھا لیا (یعنی احکام شرعیہ اور فرائض و واجبات کا بوجھ جس کی ادائیگی پر اجر اور ان سے اعراض و انکار پر عذاب ہوگا) انسان بڑا ہی ظالم جاہل ہے (یعنی اس امانت کو قبول کر لینے کے بعد انسان نے اپنے نفس پر ظلم کا ارتکاب کیا اور امانت کے تقاضے پورے نہ کئے اور ان کی قدر و قیمت سے غفلت برت کر جہالت اور ظلم کا مظاہرہ کیا۔

حافظ شیرازی نے اسی تصور کو اس انداز میں رقم کیا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسر شتندو بہ پیمانہ زدند

جنگ ہفتاد و ملت ہمہ راعذ بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

مابصد خرمن پندار زرہ چوں نہ رویم
چوں رہ آدم خاکی بیکے دانہ زوند

آتش آں نیست کہ برشعلۂ آو خندد شمع

آتش آنست کہ درخرمن پروانہ زوند

اب ان اشعار کا ترتیب وار ملاحظہ فرمائیں۔

1- کل میں نے دیکھا کہ فرشتے بھاگم بھاگ میخانے کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے آدم کی مٹی کو گوندھا اور اس کے پیمانے بنانے لگے۔

2- مسلمانوں نے ان 72 فرقوں کی جنگ کو معذور خیال کرلیا کیونکہ جب ان کو کوئی حقیقت نظر نہ آئی تو محض افسانوی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

3- اس امانت الٰہی کو آسمان بھی برداشت نہ کرسکا۔ آخرکار اس بوجھ کو اٹھانے کا قرعہ فال مجھ دیوانے ہی کے نام نکلا۔

4- ہم سینکڑوں عقل وفہم کے خرمن کی وجہ سے راہ گم کیوں نہ کریں کیونکہ آدم خاکی محض ایک دانہ کی وجہ سے راستہ بھول گیا تھا۔

5- عشق کی اگ ایسی آگ نہیں جس کے شعلے پر شمع ہنستی ہے۔ دراصل یہ ایسی آگ ہے جو پروانہ کے خرمن کو لگائی جائے۔

سورہ الاحزاب کی محولہ بالا آیت کی تشریح کرتے ہوئے امین احمد اصلاحی تدبر قرآن کی جلد ہفتم کے صفحہ 278 لغایت 280 پر جو کچھ لکھ رہے ہیں ہم اسے قارئین کرام کی نذر کر رہے ہیں۔

فرمایا کہ جو لوگ سمع واطاعت کا اقرار کرنے کے بعد زندگی کے ہر مرحلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ بہت بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ ابدی بادشاہی کی کلید ہے تو جس کو بازی جیتنی ہو وہ جیتے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ...... لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ

وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔(۲۔۷۲۔۷۳)

''اب یہ انسان کا اصلی شرف واضح فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدِ اطاعت کا امین ہے۔ یہ عہد، اختیار وارادہ کی آزادی پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے وہی اس کا سزاوار ٹھہرا۔ اس لئے کہ عہد کا اہل وہی ہوتا ہے جس کو اختیار و ارادہ کی آزادی حاصل ہو۔ جو مخلوقات مجبور ومقہور ہیں ان سے کسی عہد و میثاق کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام ذریتِ آدم سے لیا ہے اور یہی عہد اس خلافت کی بنیاد ہے جو اس زمین میں آدمؑ اور ذریتِ آدم کو حاصل ہوئی اور اسی خلافت کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی ہدایت اور کتاب وشریعت نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی وعدے کو پورا کرنے کیلئے اپنے نبی ورسول بھیجے جنہوں نے اپنی اپنی امتوں سے اس عہد اطاعت و بندگی کی تجدید کرائی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اس عہد کی بنیاد چونکہ انسان کے ارادہ کی آزادی پر ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت شمشیر دودَم کی ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ اپنے ربّ کی بندگی کے عہد کو پورا کرے تو اللہ کے نزدیک اس سے کوئی اونچا نہیں، اور اگر وہ اس عہد کو پورا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی عزت کو اپنے لئے سب سے بڑی ذلت بنالیا۔

ہر عہد ایک امانت ہے اور ہر امانت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کی بابت امانت رکھنے والا ایک دن پرسش کرے کہ اس کی امانت کا حق ادا کیا گیا ہے یا اس میں خیانت کی گئی ہے۔ یہ چیز ایک روز جزاء وسزا کو مستلزم ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا اور ان کے اعمال کے ریکارڈ ان کے سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائے گا کہ کون کا فر ومنافق ہیں جو

دوزخ کے سزاوار ہیں اور کون مومن و مخلص ہیں جو جنت کے حق دار ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت بالاختیار کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بھی پیش کی تھی لیکن وہ اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے سے ڈرے اور اپنی معذرت پیش کر دی کہ ان کو اِس بارِ گراں سے معاف رکھا جائے۔ آسمانوں و زمین اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ حال سے بھی ہوسکتی ہے اور زبانِ قال سے بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی زبانِ حال و قال دونوں سمجھتا ہے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سمجھتا ہے، دوسرے اس کو نہیں سمجھتے۔

''اسی طرح ہر ذمہ داری کے تحمل کیلئے ایک خاص صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اگر وہ صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کا تحمل ممکن نہیں ہے۔ آپ ہر زمین میں ہر چیز کی کاشت نہیں کر سکتے۔ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا آپ کے ایک تخم کا امین بن جاتا ہے اور وہ آپ کی امانت کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو نشو و نما اور فروغ دیتا ہے لیکن وہی تخم اگر آپ ایک وسیع سمندر، ایک عظیم پہاڑ یا ایک لق و دق صحرا میں ڈال دیں تو وہ اس کو نشو و نما نہیں دے سکتے بلکہ وہ تخم ضائع جائے گا۔

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ایک چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ اس سے لازماً اباء کرے گی۔ مثلاً ہماری آنکھ ایک خاص درجے کی روشنی کا تحمل کر سکتی ہے، اگر روشنی کی مقدار اس سے بڑھ جائے تو نگاہ خیرہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ہمارا جسم ایک خاص درجے کی حرارت یا برودت برداشت کرسکتا ہے۔ اگر حرارت یا برودت اس سے زیادہ ہو جائے تو ہمارا جسم اس کو قبول کرنے سے اباء بھی کرے گا اور اس سے ڈرے گا بھی۔ ہمارے معدے میں خاص طرح کی چیزوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ہم ان کے سوا کوئی دوسری چیز اس میں ڈالنے کی کوشش کریں تو خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی

چیز ہو، معدہ اس کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا، اس امانت کے معاملے میں ہوا۔ ان کے اندر اس کے اٹھانے کا ظرف نہیں تھا۔ اس وجہ سے انہو ں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔

"وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ یہ انسان کا شرف بیان ہوا ہے کہ جس بارِ امانت کو آسمان و زمین، دریا اور پہاڑ نہ اُٹھا سکے اس کو انسان نے اُٹھالیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے وجود مادی کے اعتبار سے اس کائنات کی ایک نہایت حقیر ہستی ہے لیکن اپنی معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے آسمانوں سے اونچا، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و سربلند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دُنیا کی ہر چیز اس کیلئے مسخر کی گئی لیکن وہ کسی کیلئے بھی مسخر نہیں کیا گیا بلکہ ربّ کائنات کے سوا کسی کے آگے اس کا جھکنا اس کیلئے باعث ننگ قرار پایا۔

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یہ انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بناء پر وہ اس امانت کا اہل قرار پایا۔ وہ یہ ہے کہ یہ امانت متقضی تھی کہ انسان کے اندر متضاد داعیے موجود ہوں تا کہ اس کی آزمائش ہو سکے کہ وہ ان متضاد داعیوں کی کشاکش کے اندر اپنے ربّ کی اطاعت بالاختیار کے عہد کو کس طرح نباہتا اور اس کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ظلوم وجہول بنایا گیا۔

ظلم، عدل وحق کا ضد ہے اور جہل، علم، اور حلم کا ضد ہے۔ ظلوم اس کو کہیں گے جو عدل وحق کا شعور رکھتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہونے والا ہو۔ اسی طرح جہول اس کو کہیں گے جو علم وحلم کی صلاحیت کے باوصف جہل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہو۔ یہی کشاکش انسان کی آزمائش ہے اور یہی اس کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے ربّ کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود، محض اپنے ربّ کے خوف سے، اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو لاریب اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوا اس لئے کہ ان کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل

ہموار اور ان کا مزاج ظلم و جہل کے دواعی سے بالکل نا آشنا ہے لیکن انسان اگر بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس اور شیطان سے لڑ کر کرتا ہے اسی وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے اونچی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان اپنے اس اختیار کے سبب سے جس طرح سب سے زیادہ اونچا ہے اسی طرح وہ سب سے زیادہ نیچا بھی ہو جائے گا اگر وہ اپنے اس اختیار کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے۔ یہی حقیقت سورۂ تین میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ز ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ لا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (۴-۶)

اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو اسفل سافلین میں گرا دیا البتہ وہ لوگ اس سے محفوظ رہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے۔

لِیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِکِیْنَ وَالْمُشْرِکٰتِ وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔

یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس امانت کا کہ اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں انسان اس امانت سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس کا حق ادا کیا یا نہیں۔ تا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس کے معاملے میں منافقت کی روش اختیار کی ہو یا شرک کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اپنی اس خیانت و بدعہدی کی سزا بھگتیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور وہ لوگ جنہوں نے رسوخِ ایمان کے ساتھ اس کا حق ادا کیا ہو وہ اپنے ربّ کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں، عام اس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔"

سورہ الاحزاب میں لفظ امانت کے حوالے سے ابو ہریرہؓ اور حذیفہؓ سے صحیح بخاری میں روایت درج ہے کہ امانت ضائع بھی ہو جائے گی جب معاملات میں قابل اعتماد افراد کا فقدان ہو گا اور قبائل میں شاذ شاذ لوگوں کی اس وجہ سے تعریف ہو گی کہ وہ دیانت دار ہیں۔

اچھے اخلاق اور مضبوط کردار کے مالک ہیں اگر چہ ان کے دل میں دال کے برابر ایمان بھی نہ ہو گا۔ اسی حدیث میں راوی نے حالات اور پیمانے بدل جانے پر افسوس بھی کیا۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ابن عمرؓ کے حوالے سے حدیث درج ہے کہ لوگ اونٹوں جیسے ہیں اور ایک سو اونٹوں میں سے ایک اس قابل ہوتا ہے کہ اس پر سواری کی جا سکے۔ یہ تینوں احادیث صحیح بخاری کی جلد ہشتم میں نمبر 503 لغایت 503 درج ہیں۔

اس پس منظر میں ہی امام کی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے کیونکہ قرآن کے یہ سوال تو سب کے سامنے کھلے ہیں اور قرآن ہر قاری سے ان سوالوں کے جواب پوچھ رہا ہے۔ یہ سوال ہر دور کیلئے ہیں اور ہر مومن کو ان سوالوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ آج بھی ابھی تلک اللہ کی مخلوق ظلم و جبر و استیصال کا شکار ہے۔ بقول شخصے!

کل ارضِ کربلا...... یعنی ساری زمین کربلا ہے۔

کل شہر محرم...... ہر مہینہ محرم الحرام ہے۔

کل یوم عاشور ......اور ہر دن یومِ عاشور ہے۔

سیاسی نظام

فکرو تحقیق و تجربہ کے سفر کے دوران جب انسانی ذہن اس قابل ہوا کہ شعوب و قبائل، رنگ، نسل، رواج، توہمات اور زبان کی تقسیم سے بلند ہو کر عالمگیری سوچ کا متحمل ہو سکے تو سب سے پہلے سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی بنیاد ڈال کر عالمی امن اور عالمگیری اخوت کا بیج بویا گیا اور پھر ابوالانبیاء سیدنا ابراہیمؑ ہی کی ذریت سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا گیا جن کی الہامی تعلیمات نے دُنیا کو پہلی بار کئی حیرت انگیز تصورات اور مستقل اقدار سے متعارف کرایا تا کہ انسان انفرادی، گروہی، علاقائی سوچ سے باہر نکل کر بین الاقوامی سطح پر ساری انسانیت کی فلاح کیلئے ادارہ سازی کر سکے۔ اس عمل میں قرآن وسنت نے انسان کو اجتماعی زندگی کے خدوخال سے روشناس کرانے کے بعد اس کیلئے اہداف بھی مقرر کر دیئے اور اس کی ہدایت کیلئے سمت بھی متعین کر دی۔

اس سارے عمل کی اساس انسان کی انفرادی اور اجتماعی آزادی پر تھی۔ انسان کو صاحب ارادہ وصاحب اختیار بنایا گیا، انسان کو باعث تکریم کیا گیا، انسان کو اچھے اور بُرے کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت اور پیمانہ دیا گیا تا کہ اجتماعی ادارہ سازی کر کے تخلیق کے مقاصد کو حاصل کرنے کا سفر شروع کیا جا سکے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کیلئے انسان کو مختلف قسم کی رکاوٹوں کا سامنا رہا ہے۔ یہ رکاوٹیں نظریاتی قسم کی تھیں اور مادی قسم کی بھی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم رکاوٹ سیاسی اقتدار رہی ہے۔ انسانوں کے بعض طبقات کی یہ خواہش رہی کہ اللہ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرنے کی بجائے انہیں مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا جائے تا کہ مخلوق خدا پر

حکمرانی کا حق انہی کیلئے مخصوص ہو جائے۔ اس خواہش نے تاریخ میں کئی کروٹیں لیں بالآخر قرآن پاک نے انسان کی فکری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف محرکات، اسباب، رجحانات اور نتائج کو قصص الانبیاء کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے انبیاء کے آنے کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور انسان کو اس سمت کی نشاندہی کی جس طرف سفر کرتے ہوئے اس نے اعلیٰ اہداف کو حاصل کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک نے جن اُمور کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے اِن میں سے بعض کو ہم قارئین کرام کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

1- حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تبارک تعالیٰ ہے۔

2- توحید کے تصور کا اساسی نقطہ اللہ تبارک تعالیٰ کی حاکمیت ہے۔

3- اس حاکمیت کے تصور کا عملی ظہور اطاعت رسولؐ کی شکل میں ممکن ہے۔

4- دراصل قوانین الٰہی کی پیروی ہی اطاعت ہے یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کے قوانین کی بالادستی کو فکری اور عملی شکل میں تسلیم کرنا۔

5- محولہ بالا مقدمات کا مقصد ایک متوازن معاشرہ کا قیام ہے۔

6- جہاں عدل واحسان تاکہ

7- مخلوق خدا خوف وحزن سے نجات حاصل کر سکے اور

8- اللہ کے بندوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آسانی ہو۔

9- اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر کسی ایک گروہ، نسل، قوم یا طبقہ کا قبضہ نہ ہو بلکہ انعامات الٰہی مخلوق خدا کیلئے کھلے ہوں تاکہ

10- انسانی مساوات کا اصول تسلیم ہو اور

11- حقوق بشری محفوظ ہوں یعنی ہر انسان کو نظریہ اپنانے کی آزادی ہو، اس کی جان، مال، عزت، آبرو محفوظ ہو اور اسے رزق کمانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں، اسے محنت کا پھل یقینی طور پر ملے اور اگر وہ کسی طرح اپنی کفالت کرنے سے معذور ہے تو اس کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو گی، اور ہر انسان کو اس دُنیا میں چلنے پھرنے اور

علم حاصل کرنے کی بھی آزادی ہوگی۔

12- معاشرہ میں ایک ذمہ دار حکومت ہوگی جو اُمورِ مملکت کو عوامی مشورے کے مطابق چلائے گی اور دیگر اُمور کے علاوہ محولہ بالا اُمور کی نگہداشت بھی اس ریاست کے ذمہ ہوگی۔

اس کام کیلئے قرآن نے امانتوں کو حقداروں تک پہنچانے، تفرقہ بازی سے پرہیز کرنے اور عقل وخرد کو استعمال کرنے کی تعلیم دی۔ قرآن نے انفرادی تعلیم وتربیت کے علاوہ اجتماعی تنظیم کی طرف انسان کی رہنمائی کی ہے۔ آپ دیکھیں کہ قرآن نے

1- امامت
2- خلافت
3- اُمت
4- ملت
5- عدل کے قیام
6- نفاذ قانون
7- مشاورت
8- وحدت انسانی
9- مساوات
10- تکریم آدم
11- حکومت
12- امن عالم
13- بین الاقوامی معاہدات (جن میں جنگ وصلح اور اقتصادیات بھی شامل ہیں۔)
14- امر بالمعروف ونہی عن المنکر

جیسے اہم سیاسی تصورات پیش کر کے انسانیت کے سامنے ایک نہایت ہی حیرت انگیز منشور پیش کیا ہے تا کہ اس پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی سطح پر انسان فلاح کی نئی جہتیں تلاش کر کے

اس دُنیا کو جنت ارضی میں تبدیل کر سکے۔

اِس دوران انسان نے بہت کچھ سوچا۔ اپنی عقل اور تجربات کی روشنی میں اور وحی کی ہدایات کے مطابق انسان اپنے اپنے دور میں ان تصورات کو آگے بڑھاتا رہا۔ اس بحث میں جائے بغیر کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست ہے ہم ان چار عوامل کا ذکر کرتے ہیں جن سے امت مسلمہ کو اجتماعی معاملات سے متعلق بالخصوص واسطہ پڑا۔ یہ عوامل اور ان کے ادوار درج ذیل ہیں۔

1- نبوت اور نفاذ احکام الٰہی

2- خلافت علی منہاج النبوۃ

3- امامت

4- ملوکیت

5- جمہوریت

جہاں تک نبوت اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں حکومت کا تعلق ہے وہ مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جس تک پہنچنے کیلئے ہم نے اجتماعی طور پر کوشش کرتے رہنا ہے کیونکہ ایک مثالی معاشرہ کے خط وخال اسی دور میں متشکل ہوئے۔ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ حکومت سازی ہو یا جماعت سازی یا انسانوں کی رہنمائی کا کوئی اور ذریعہ معرض وجود میں آئے اس کیلئے دورِ نبویؐ کے اصول وضوابط بنیادی مآخذ کا کردار ادا کرتے رہیں گے۔

دوسرا عنصر خلافت علی منہاج النبوت ہے۔ جس کو ہم اس بحث کے مقدمہ کے طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد نازک حالات میں خلافت کا طریقہ انتخاب ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ اس دوران بالخصوص حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؑ کے ادوار میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان حضرات کی شہادت کے بعد خلافت بتدریج ملوکیت میں تبدیل ہوتی گئی اور ہم نے ایک ایسی عظیم اور مقدس منزل کھو دی جو آج تک اُمتِ مسلمہ کو میسر نہیں آئی۔

اگر چہ خلافت سے ملوکیت کی طرف حالات کا رُخ بدل رہا تھا لیکن اس وقت ایک اور نقطہ نظر بھی موجود تھا جسے ہم امامت کے تصور کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ یہ نظریہ آج بھی اہل تشیع کے نزدیک مسلّم ہے اگر چہ اہل سنت نے خلافت کے تصور کے بعد ملوکیت کے عنصر کو بھی تسلیم کیا اور اب ساری امت جمہوری نظام پر متفق ہوتی نظر آتی ہے۔لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم اس مقام پر خلافت اور امامت کے نقطہ نظر سے آگاہی حاصل کرلیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے علامہ محقق سید مرتضٰی عسکری کی کتاب نقش آئمہ دراحیاء دین کے اُردو ترجمہ بعنوان احیائے دین میں آئمہ اہل بیتؑ کا کردار کے صفحات 115 سے 128 تک کا اقتباس پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جہاں ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر پڑھنے کے بعد یہی تاثر ملتا ہے کہ امام حسینؑ دونوں معیاروں پر پورا اترتے ہیں اور یزید کی ولی عہدی کے وقت بھی خلافت کے حقدار تھے اور اگر زمام اختیار انہیں مل جاتا تو یقیناً امت محمدیہ کا مستقبل مختلف ہوتا۔

''خلفاء کے مکتب میں امامت یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت تین شکلوں میں قائم ہوتی ہے:-

ایک خلیفہ اپنے جانشین یعنی آئندہ خلیفہ کا تعین کرتا ہے اور وہ ان معنوں میں کہ اگر ہارون الرشید کہے کہ میرے بعد امین اور مامون خلیفہ ہوں گے تو مسلمان انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں اور یہ خلیفہ شرعی اور اسلامی ہوگا اور اس کا قبول کرنا دینی لحاظ سے واجب ہوگا۔ یہ دو عالم کہتے ہیں:

وَ اَمَّا انعِقَادُ الْاِمَامَةِ بِعَهْدِمَنْ قَبْلَهٗ فَهُوَ مِمَّا انْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلٰى جَوَازِهٖ وَوَقَعَ الْاتِّفَاقُ عَلٰى صِحَّتِهٖ لِاَمْرَيْنِ عَمِلَ الْمُسْلِمُوْنَ بِهِمَا وَلَمْ يَتَنَاكَرُوْهَا اَحَدُهُمَا: اَنَّ اَبَابَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَهِدَبِهَا اِلٰى عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَاَثْبَتَ الْمُسْلِمُوْنَ اِمَامَتَهٗ بِعَهْدِهٖ۔

''اس معاملے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس شکل میں خلیفہ کے قبول

کرنے پر اجماع اور اتفاق ہے۔ اس قسم کی خلافت اور اس کی اصالت اور صحت کے بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے اپنے بعد لوگوں پر حکومت کیلئے عمرؓ کو نامزد کیا اور کسی نے اس رائے کی مخالفت نہیں کی۔ عام طور پر لوگوں کی قبولیت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے اس طریقے اور روش کو صحیح سمجھا لٰہذا خلیفہ کا اس قسم کا انتخاب جو سابقہ خلیفہ کے ہاتھوں انجام پائے ابوبکرؓ کے عمل اور لوگوں کے اعتراض نہ کرنے کی بناء پر صحیح ہے اور اس روش کی اصالت اور صحت کے بارے میں خلفاء کے مکتب میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔(1)

خلیفہ لوگوں کے انتخاب کے ذریعے متعین ہوتا ہے۔ اس طرح خلیفہ کے تعین کے بارے میں خلفاء کے مکتب کے علماء میں اختلاف ہے۔ ماوردی کا نظریہ ہے:

اَقَلُّ مَنْ تَنْعَقِدُ بِهٖ مِنْهُمُ الْاِمَامَةُ خَمْسَةٌ يَجْتَمِعُوْنَ عَلٰى عَقْدِهَا اَوْ يَعْقِدُهَآ اَحَدُهُمْ بِرِضَا الْاَرْبَعَةِ۔"

"خلیفہ کا انتخاب پانچ ایسے اشخاص کے ذریعے ہوتا ہے جو اربابِ حل وعقد یعنی قوم کے بزرگ اور عقلمند لوگ ہوں یا یہ کہ ایک شخص انتخاب کرے اور چار دوسرے آدمی اس کی تائید کریں۔"(2)

اس نظریے کی تائید میں جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ ابوبکرؓ کے انتخاب کے معاملے میں پانچ اشخاص نے ان کی بیعت کی اور یہ پانچ اشخاص عمرؓ بن خطاب، ابوعبیدہ جراح، ابوحذیفہ کا آزاد کردہ غلام سالم، نعمان بن بشیر اور آسید بن حضیر تھے۔(3) اس انداز میں سقیفہ میں بیعت ہوئی اور ابوبکرؓ خلافت پر فائز ہو گئے۔ پھر سقیفہ میں منتخب شدہ خلیفہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا اور انہوں نے بھی خواہی نخواہی اسے قبول کر لیا۔

پس اس دلیل کے مطابق یعنی چند اشخاص کے عمل کی رو سے...... خلیفہ کا انتخاب پانچ ایسے اشخاص کی بیعت اور مرضی سے مکمل ہو جاتا ہے جو اہل حل وعقد ہوں۔ دوسری دلیل اس نظریے کی یہ ہے کہ خلیفہ عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ متعین کرنے کیلئے جو مجلس شوریٰ تشکیل دی اس کے سلسلے میں کہا گیا کہ اگر چھ اشخاص میں سے پانچ کسی ایک شخص کو بطور خلیفہ قبول کر لیں تو وہ خلیفہ ہوگا۔ اس مکتب کے بیشتر علماء اس عقیدے پر متفق ہیں۔

مکتبِ خلافت کے علماء کے ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ خلافت عقد ازدواج کی مانند ہے جس طرح عقد نکاح میں ایک عاقد اور دو شاہد ضروری ہیں اسی طرح خلافت میں بھی ایک شخص بیعت کرتا ہے اور دو اشخاص اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہیں اور اہل حل وعقد میں سے لوگوں کی اتنی تعداد ہی خلیفہ اور حاکم مقرر کرنے کیلئے کافی ہے۔

تیسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص خلیفہ کی بیعت کر لے تو کافی ہے۔ ایک شخص کے انتخاب اور اسی کی بیعت سے عظیم امت اسلامی کے خلیفہ کا تقرر ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ عباس بن عبدالمطلب نے امام علیؑ سے کہا ''اپنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کرلوں۔ لوگ کہیں گے کہ رسول اللہ کے چچا نے رسولؐ کے ابن عم کی بیعت کر لی اور پھر کوئی بھی اس امر کی مخالفت نہیں کرے گا۔'' (4)

دوسری دلیل یہ ہے کہ بیعت حاکم شرع کے حاکم اور فرمان کی مانند ہے اور انسان ایک حاکم شرع کے حکم اور فرمان کا پابند ہوتا ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں۔ ان دو دلائل کی بناء پر اگر ایک شخص بھی دوسرے کو خلیفہ مانتے ہوئے اس کی بیعت کر لے تو اس کی خلافت قائم ہو جاتی ہے اور رسمیت اور سرعیت حاصل کر لیتی ہے۔'' (5)

خلیفہ بزورِ شمشیر اور جنگی فتوحات کی بدولت خلافت حاصل کرتا ہے۔ اس نظریے کی بناء پر اگر مسلمانوں پر فوجی قوت اور غلبے کی بدولت حکومت حاصل کر لی جائے تو حاکم خلیفہ برحق ہوگا اور اس کی خلافت رسمی اور اسلامی ہوگی۔ قاضی ابویعلیٰ کے مطابق ''اگر کوئی شخص تلوار یا قوت کے بل بوتے پر اسلامی معاشرے پر غلبہ پالے اور خلیفہ بن جائے اور امیر المومنین کہلوانے لگے تو پھر جو شخص اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کیلئے جائز اور روا نہیں ہے کہ رات کو اس حالت میں دن تک لے جائے کہ اسے امام نہ سمجھتا ہو خواہ خلیفہ ایک بدکردار شخص ہو یا پاکدامن شخص۔'' (6)

خلافت کے یوں تشکیل پانے کے بارے میں خلفاء کے مکتب کے معتبر فقیہہ فضل اللہ بن روزبہان اپنی کتاب سلوک الملوک میں رقمطراز ہیں کہ ''بادشاہت اور امامت کے قیام کا چوتھا طریقہ غلبہ اور طاقت ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ جب ایک امام فوت ہو جائے اور کوئی

اور شخص بغیر اس کے کہ کوئی اور اس کی بیعت کرے یا اسے خلیفہ بنائے امامت کا کاروبار سنبھال لے اور قوت اور لشکر کے ذریعے لوگوں پر قابو پالے تو بغیر بیعت کے اس کی امامت قائم ہو جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ وہ قریشی ہو یا نہ ہو، عرب ہو، عجمی ہو یا ترک اور خواہ وہ (امامت کی) شرائط پوری کرتا ہو یا فاسق اور جاہل ہو......اس پر امام اور خلیفہ کے نام کا اطلاق ہوسکتا ہے۔'' (7)

خلیفہ اور مسلمان

''اگر کوئی شخص مذکورہ بالا طریقوں سے یعنی طاقت سے یا ایک شخص یا تین اشخاص یا پانچ اشخاص کی بیعت سے یا سابقہ خلیفہ کے نامزد کرنے سے خلافت حاصل کر لے تو عام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسے اس کے نام اور ذات سے پہنچانیں جیسے کہ واجب ہے کہ اللہ اور رسولؐ کو پہچانیں۔ یہ ایک نظریہ تھا لیکن اکثریت کا اعتقاد یہ ہے کہ لوگوں کیلئے اتنا جاننا کافی ہے کہ خلیفہ کون ہے۔ المختصر کہ تفصیلی شناخت کی ضرورت نہیں اور اجمالی شناخت ہی کافی ہے۔(8)

یہ علماء اپنی معتبر ترین کتابوں میں ممتاز ترین راویوں سے کچھ روایات نقل کرتے ہیں اور ان کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا امام اور خلیفہ خواہ کوئی بھی کام کرے اور کسی بھی ظلم و ستم اور فسق و فجور کا مرتکب ہو اس کے خلاف تلوار اُٹھانا، اس کی مخالفت کرنا اور اس پر خروج کرنا جائز نہیں۔

حذیفہ ناقل ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ''میرے بعد ایسے پیشوا ہوں گے جو میرے راستے پر نہیں چلیں گے اور میری روش پر عمل نہیں کریں گے اگر چہ بظاہر انسان ہوں گے لیکن ان کے دل شیطان کے دل کی طرح ہوں گے۔''

حذیفہ نے کہا ''یارسول اللہ اگر میں اس زمانے میں ہوں تو میرا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے؟''

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ''سو فیصد سننا اور پوری اطاعت کرنا، اگر وہ تیری پیٹھ پر ضرب لگائے اور تیرا مال چھین لے، تب بھی تجھے چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری کرے اور کے احکام

پر کان دھرے۔''

ابن عباس رسول اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں 'اگر کوئی شخص اپنے پیشوا اور حاکم میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ اگر کوئی شخص خلافت کے نظام اور اس کی پیروی کرنے والی مسلمانوں کی جمعیت سے ایک بالشت بھی دور ہو جائے اور اسی حالت میں مرجائے تو وہ ایام جاہلیت میں مرنے والوں کی موت مرے گا۔'' (9)

ایک اور روایت میں ابن عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں نقل کرتے ہیں: ''کوئی شخص ایک حکومت سے دوری اختیار نہیں کرتا حتی کہ ایک بالشت بھی کیونکہ اگر وہ اس حالت میں مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی اور وہ دُنیا سے شرک کی حالت میں جائے گا۔'' (10)

اہل سنت کے ایک بہت بڑے عالم ان احادیث کے ذیل میں ''لزوم طاعۃ الامراء'' کے عنوان کے تحت ایک باب میں کہتے ہیں۔

''عام طور پر اہل سنت یعنی فقہاء محدثین اور متکلمین کہتے ہیں کہ حاکم فسق، ظلم اور لوگوں کے حقوق پامال کرنے کی بناء پر معزول نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اسے ہٹایا جا سکتا ہے اور اصولاً یہ جائز اور روا نہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کی جائے بلکہ واجب ہے کہ اس کو پند و نصیحت کی جائے اور اللہ اور قیامت سے ڈرایا جائے کیونکہ اس موضوع پر رسول اکرمؐ کی احادیث ہم تک پہنچی ہیں جو ہمیں حاکم کے خلاف خروج سے منع کرتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ پیشوا خواہ فاسق اور ستم گر ہی کیوں نہ ہو اس کے خلاف قیام تمام مسلمانوں کے اجماع کے مطابق حرام ہے۔''

اس نظریے کی بناء پر یزید بن معاویہ جیسے شرابی، کتے پالنے والے اور قاتل و مجرم کے خلاف خروج اور عبدالملک (جس کے فوجیوں نے منجنیقوں کے ذریعے خانۂ کعبہ کو منہدم کر دیا تھا) کے خلاف بغاوت اور ولید (جس نے قرآن مجید پر تیر چلائے تھے) کے خلاف جنگ جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔

صحیح مسلم کا فاضل شارح نودی مندرجہ بالا اقوال کے سلسلے میں رقم طراز ہے کہ:

''بہت سی متواتر روایات مذکورہ بالا اقوال (کی صحت) کو ثابت کرتی ہیں اور اس کے علاوہ اہل سنت نے اجماع کیا ہے کہ فسق و فجور کی بناء پر حاکم امامت سے معزول نہیں ہوتا۔'' (11)

یہ عالم یہاں اس آیۂ شریفہ ''اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' (سورۂ نساء، آیت 59) کو بطور سند پیش کرتا ہے اور کہتا ہے، حکام چونکہ اولیائے امور ہیں اس لئے ان کی اطاعت کرنا لازم ہے۔

یہ تھا خلاصہ ان اقوال کا جو خلفاء کے مکتب کی علمی کتابوں اور حدیث کی معتبر شرحوں میں تحریر ہیں۔

اہل بیتؑ کے مکتب میں

جہاں تک اہل بیتؑ کے مکتب کا تعلق ہے مسئلے کی صورت مختلف ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہاں امامت کی بنیاد انتصابِ الٰہی پر ہے۔ اس مکتب کے پیشوا اور علماء قرآن مجید کی یہ آیت بطور سند پیش کرتے ہیں۔

''خدا نے کلمات کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ وہ تائید الٰہی سے اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ خدا نے جواب میں فرمایا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام قرار دیا۔'' (سورۂ بقرہ-124)

جن کلمات سے خدا نے ابراہیم خلیل علیہ السلام کا امتحان فرمایا ان کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ آپ کے اپنے فرزند دلبند حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا مسئلہ تھا یا اس وقت کے عظیم طاغوت نمرود سے جنگ کا سوال تھا یا آتش نمرود میں کود پڑنے اور کمال خوشنودی سے اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دینے کے حکم کی تعمیل تھی یا یہ سبھی باتیں تھیں؟ قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ (12)

لیکن جو کچھ بھی ہوا ایک عظیم حادثہ تھا کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے ایک بہت بڑا امتحان قرار دیا گیا ہے لہٰذا جب اولوالعزم پیغمبر اس امتحان کے پیچ وخم سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہوئے اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح بندگی اور اخلاص کے اظہار کے طور پر اپنا

سر بر گاہ ایزدی میں زمین پر رکھ دیا تو انہیں امامت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیا گیا۔ امامت کا مقام کتنا گرامی قدر ہو گا کہ نبوت، اولوالعزمی اور خلت (خدا کی دوستی) کے مراتب حاصل کرنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عطا ہوتا ہے تو آپ وجد میں آ جاتے ہیں اور اپنی اولاد کیلئے بھی اس مقام کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امامت کی بنیاد خدا کی جانب سے تقرر اور تنصیب پر ہے اور اس میں فقط حکم الٰہی لائق اتباع ہے اور بس۔

خدا کا یہ پیغام سننے اور اس عالی رتبے پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ بہ متقضائے بشریت خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ یہ رتبہ آپ کی اولاد میں بھی برقرار رکھا جائے۔ انسانی فطرت کے مطابق آپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے بھی یہ روحانی سرفرازی حاصل کریں۔ "قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" (سورہ بقرہ-124) اور خدا نے جواب میں فرمایا "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (سورہ بقرہ-124) امامت اپنے بندے کے ساتھ میرا خاص عہد ہے اور یہ عہد ستمگار اور ظالم کو نہیں پہنچتا۔

ظالم کسے کہتے ہیں؟ قرآن مجید کی زبان اور لغت میں بعض اوقات اس شخص کو جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ظالم کہا جاتا ہے مثلاً جو شخص بت کو پوجتا ہے یا شراب پیتا ہے یا خود کشی کرتا ہے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور اس بناء پر اسلام اسے ظالم کہتا ہے۔ بعض اوقات جو شخص دوسروں پر ظلم ڈھاتا ہے اور ان کے حقوق میں تجاوز کرتا ہے اسے ستمگار کہا جاتا ہے مثلاً جو شخص دوسروں کا مال ہتھیاتا ہے یا ان سے سود وصول کرتا ہے یا کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی شکل میں بھی خدا کے حکم کی مخالفت کرتا ہے قرآن اور اسلام کی نظر میں ظالم ہے۔ (سورہ طلاق-1)

جس شخص نے ایک لحظہ بھی خود اپنے یا دوسروں کے ساتھ ظلم کرنے میں بسر کیا ہو وہ نظام ربانی کے دقیق معیار کی بنیاد پر ظالم ہے اور وہ امامت کا اہل نہیں ہے لہٰذا قرآن مجید کے اس واضح استدلال کی بنا پر امام کیلئے ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو۔

اس آیت کریمہ کے علاوہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی امامت کا ذکر آیا

ہےاور اس کی بنیاد خدا کی جانب سے تقرر اور تنصیب ہی بتائی گئی ہے۔

ہم نے ان سب کو لوگوں کا امام بنایا جو ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے، نماز پڑھنے اور زکات دینے کی وحی نازل کی اور یہ سب کے سب ہمارے مطیع بندے تھے۔'' (سورۂ انبیاء-73)

''ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو جو زحمتیں برداشت کرتے تھے اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے امام بنایا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے۔''

(13)

اہل بیت کے مکتب میں امامت کا تعارف قرآن مجید کی بنیاد پر اس شکل میں کرایا جاتا ہے کہ وہ فقط اللہ کی جانب سے تعین، تقرر اور تنصیب کی بنیاد پر امکان پذیر ہے اور بس۔

دوسرا مرحلہ جسے امامت میں زیر غور لایا جاتا ہے امام کی عصمت کا مسئلہ ہے جس کی تصریح سورۂ بقر کی اس آیت میں کی گئی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت کا ذکر آیا ہے اور جسے ہم نے مختصر اُمورِ دِ بحث قرار دیا ہے۔ اب اگر ہم ایک دفعہ پھر قرآن مجید سے رجوع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ارشاد ہوا ہے ''اللہ نے ارادہ کیا ہے کہ تم (اہل بیتؑ) سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھے۔'' سورہ الاحزاب 22/33/33

لفظ ''اہل بیت'' جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے شرعی اصطلاحات میں سے ہے کیونکہ یہ قرآن مجید کے وسیلے سے وضع ہوا ہے۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس گروہ کے ان تمام افراد کو جو آپ کے زمانے میں موجود تھے قطعی طور پر معین فرما دیا تھا۔ آپ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو اپنی چادر (14) کے نیچے جمع کیا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اُن کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یوں آپ نے واضح طور پر طے کر دیا کہ آپ کی بیویاں ''اہل بیت'' میں سے نہیں ہیں لہٰذا ''اہل بیت'' اس خاص گروہ کا نام ہو گیا اور اسلام میں جہاں کہیں اہل بیت کا ذکر آتا ہے یہی نفوس قدسیہ مقصود ہوتے ہیں اور یہی معصوم ہیں۔ یہ امامت کی دوسری شرط ہے۔

پہلی شرط کا مزید مطالعہ

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اہل بیتؑ کے مکتب میں امامت انتصابی چیز ہے اور ضروری ہے کہ یہ انتصاب منجانب اللہ ہو۔ رسول اکرمؐ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اس (نامزدگی) کی تبلیغ کریں اور یہ نہیں کہ آپ علیؑ کو امام نامزد کریں یا ان کی حکومت کے بارے میں وصیت کریں۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تبلیغ فرماتے ہیں اور اس کام کے انجام دینے میں فقط اللہ کا حکم بجالاتے ہیں اور حج کی تبلیغ کرتے ہیں اور یہ حکم بھی اللہ کی جانب سے ہے اور آپ فقط اللہ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے ہیں، بعینہ یہی صورت امامت کے مسئلے کی بھی ہے۔ رسولِ اکرمؐ اللہ کی جانب سے امامت کی تبلیغ کرتے ہیں اور تقرر اللہ کی جانب سے ہے۔ پس جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امامت کے بارے میں بتاتے ہیں وہ ایسے ہی ہے جیسے آپ نماز، حج، زکوۃ اور جہاد کے متعلق بیان کرتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ نماز کے بارے میں فرماتے ہیں وضو یوں کرنا چاہیے، سورہ حمد پہلی اور دوسری رکعت میں پڑھنی چاہئیں اور اس کے مقدمات کیا ہیں۔ بلاشبہ یہ سب باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کرتے ہیں لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو کچھ رسول اکرمؐ نے امامت کے بارے میں کہا وہ اللہ کی جانب سے ہے۔ مَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی۔ (سورۂ نجم-3)

اب ہم اس مختصر بحث کی حدود میں رسول اکرمؐ کی ان احادیث اور ان روایات کا مطالعہ کرتے ہیں جو مسئلہ امامت کے سلسلے میں دستیاب ہیں۔ اس قسم کی نصوص کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

1- وہ احادیث جن کا تعلق بالعموم آئمہ اہل بیتؑ سے ہے۔

2- وہ احادیث جن میں آئمہ اہل بیتؑ میں سے کسی امام کے نام کا بالصراحت ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے حصے کی احادیث میں کسی امام کا نام بطور خاص نہیں لیا گیا بلکہ بالعموم اہل بیتؑ

کی امامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے ہم اس قسم کی احادیث کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

1۔ حدیث ثقلین

پہلی روایت ہم صحیح مسلم (15) سے نقل کرتے ہیں اگر چہ یہ دوسری بہت سی معتبر کتابوں مثلاً مسند احمد بن حنبل، سنن دارمی، سنن بیہقی اور مستدرک علی الصحیحین (16) وغیرہ میں موجود ہے۔ زید بن ارقم ہیں مکہ اور مدینہ کے راستے کے بیچ میں (حجتہ الوداع سے واپسی کے سفر کے دوران) رسولِ اکرمؐ نے ایک تالاب (غدیر) کے کنارے جس کا نام ''خم'' تھا لوگوں کے درمیان یوں خطبہ ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! یاد رکھو، میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ وہ وقت قریب ہے جب مجھے (عالم بقا کی جانب) بلایا جائے اور میں خداوند تعالیٰ کی یہ دعوت قبول کرلوں۔ میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں بطور میراث چھوڑ رہا ہوں۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اسے نہ چھوڑنا اور اس پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑے رکھنا اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔''

اور مستدرک کے نسخے کے مطابق آپ نے ان الفاظ کا اضافہ فرمایا:

''خیال رکھو کہ میرے بعد ان دو نشانیوں کے ساتھ تم کیسا سلوک کرتے ہو۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں۔''

آنحضرتؐ کے ارشاد کے آخری جملے پر تکیہ کرتے ہوئے ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ آئمہ اہل بیتؑ (جن کی تعداد بھی دوسری معتبر روایات کی رو سے طے ہو چکی ہے) میں سے ایک کی عمر اتنی طویل ہونی چاہیے کہ وہ دنیا کے خاتمے تک زندہ رہے اور اس کے نتیجے میں قرآن مجید کے پہلو بہ پہلو ہمیشہ انسانی معاشرے میں موجود رہے اور ان دونوں کے جدا نہ ہونے کے بارے میں آنحضرت کا ارشاد صحیح ثابت ہو۔

جابر، انہیں سے ملتے جلتے الفاظ آنحضرتؐ کے خطبہ عرفہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں نے ایام حج میں آنحضرتؐ کو عرفہ میں دیکھا۔ آپ اپنی عضباء نامی اونٹنی پر سوار تھے اور لوگوں کے سامنے یوں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔

''اے لوگو! میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب خدا اور میری عترت میرے اہل بیتؑ۔'' (17)

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ترمذی کہتے ہیں کہ ابوذر، ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور حذیفہ بن اسید نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت مختلف صورتوں میں اور متفاوت افراد کے وسیلے سے اس قدر نقل ہوئی ہے کہ ان کا ذکر اور مطالعہ کرنا خاص فرصت کا محتاج ہے۔ ہم ان احادیث پر تکیہ کرتے ہوئے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے امامت کو اپنے اہل بیتؑ میں محدود کر دیا ہے اور انہیں قرآن مجید کا سرچشمہ قرآن مجید اور آپ کے اہل بیتؑ ہیں اور آپ نے ان کے دامن کو تھامنے کو گمراہی اور ضلالت سے قطعی نجات کا موجب قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ''ہوشیار رہو اور غور کرو کہ میرے بعد تم ان دونوں سے کیسا سلوک کرو گے اور یہ جان لو کہ یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کے جدا نہ ہوں گے اور حوض کوثر پر مجھ پر آملیں گے جو کہ قیامت کے دن نجات پانے والوں کے ورود کا مقام ہے۔''

یہ ایک مسلمہ قرآنی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابیں لوگوں کی امام ہیں اور نظری نقطۂ نگاہ سے ان کی فکر، اعتقاد، اخلاق اور عمل کی پیشوا ہیں۔ (18) اسی اصول کی جانب توجہ اور اس پر انحصار کی بناء پر اہل بیتؑ رسولؐ کو قرآن مجید کے پہلو بہ پہلو رکھے جانے سے ان کی امامت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور بلاشبہ یہ عمل کے لحاظ سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں علمی لحاظ سے اسلام کی تصویر کشی قرآن مجید میں کی گئی ہے اور عملی صورت میں اور خارجی تجسیم کے طور پر وہ اہل بیتؑ میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور چونکہ ہم ایک شکل میں قرآن مجید کی امامت قبول کرتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ دوسری شکل میں ہم اہل بیتؑ کی امامت بھی قبول کریں۔ علاوہ ازیں چونکہ رسول اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق ہدایت آپ کی اس گراں قدر

میراث میں منحصر کی ذمے داری ہوتا کہ ہدایت اتمام پذیر اور کامل ہو جائے۔

2۔ آئمہ کی تعداد کے بارے میں روایات

روایات کے ایک مجموعے میں آنحضرتؐ کے بعد آنے والے آئمہ، خلفاء اور حکام کی تعداد معین کر دی گئی ہے البتہ ان کے افراد میں سے کسی کا نام اس میں نہیں آتا۔ اب تک مجھے یہ روایات رسول اکرمؐ کے چار صحابہ سے ملی ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ جابر بن سمرہ ہیں اور ان کی روایت صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، مسند طیالسی اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ میں موجود ہیں۔(19)

جابر کی روایت صحیح مسلم کے نسخے سے نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں اپنے باپ کے ساتھ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دین ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رہے گا تاوقتیکہ قیامت برپا ہو جائے اور تم پر بارہ خلیفہ ہوں جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔''

اس روایت میں اس سے زیادہ نقل نہیں کیا گیا لیکن امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس حصے کا اضافہ فرمایا ہے جو اس روایت میں سے محذوف ہے۔

آپ کا ارشاد ہے ''بلاشبہ آئمہ قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے اُبھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔(20)

ایک اور روایت میں جو مسند احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم وغیرہ میں مسروق سے مروی ہے کہ ہم کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ہمیں قرآن کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص نے ان سے سوال کیا۔ ''اے ابوعبدالرحمٰن! کیا آپ نے رسول اکرمؐ سے یہ نہیں پوچھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ ہوں گے؟''

عبداللہ نے کہا ''جب سے عراق میں آیا ہوں کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا۔'' پھر کہا۔ ''ہاں ہم نے رسول اکرمؐ سے اس مسئلے کے بارے میں سوال کیا تھا اور آنحضرتؐ نے فرمایا تھا۔ ''بارہ افراد جتنی کہ بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد تھی۔''(21)

یہ روایات انس بن مالک اور عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کی گئی ہے۔ بلاشبہ ان روایات میں سے ہر ایک اتنے زیادہ افراد نے نقل ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی روایات تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہیں اور مکمل طور پر قابل اطمینان ہیں۔

حواشی

-1 (ماوردی: الاحکام السلطانیہ، صفحہ 10 تیسرا ایڈیشن، مطبوعہ 1393ھ، ابویعلٰی حنبلی: الاحکام السلطانیہ، صفحہ 25 دوسرا ایڈیشن، مطبوعہ مصر 1386ھ۔ نیز دیکھئے قاضی روز بہان: سلوک الملوک دستور حکومت اسلامی صفحہ 45/44 مطبوعہ حیدرآباد دکن، 1386ھ)

-2 (ماوردی صفحہ 7 اور ابویعلٰی صفحہ 33 علاوہ ازیں دیکھئے سلوک الملوک صفحہ 43-44)

-3 ماوردی صفحہ 7 سقیفہ اور اس کے واقعات کے بارے میں مزید معلومات کیلئے عبداللہ بن سبا، جلد 1، صفحہ 78-139، چوتھا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیے۔

-4 طبقات الکبریٰ جلد 2، صفحہ 38، مروج الذہب جلد 2، صفحہ 200، الامامۃ والسیاسۃ، جلد 1، صفحہ 4

-5 یہ تمام اقوال ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، صفحہ 7، مطبوعہ مصر 1393ھ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

-6 ابویعلٰی کی الاحکام السلطانیہ، صفحہ 23

-7 سلوک الملوک، دستور حکومت اسلامی، صفحہ 47، مطبوعہ حیدرآباد دکن

-8 ماوردی: الاحکام السلطانیہ، صفحہ 15

-9 صحیح مسلم، جلد 6، صفحہ 20-22 باب الامر بلزوم الجماعۃ، مطبوعہ محمد علی صبیح بمیدان الازہر۔

-10 صحیح مسلم، جلد 6 صفحہ 22 باب الامر بلزوم الجماعۃ مطبوعہ مصر، 1334ھ

-11 مسلم کی شرح نووی، باب الامر بلزوم الجماعۃ، جلد 12، صفحہ 229، سنن بیہقی، جلد 8، صفحہ 158-159، منتخب کنز العمال بر حاشیہ المسند، جلد 2، صفحہ 146-147-148-149 اور بعد کے صفحات، مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 93-306-381-488 اور جلد 3 صفحہ 114 اور جلد 4 صفحہ 126 اور 302 سنن ابوداؤد، جلد 4، صفحہ 241-242 حدیث 4758-4759 اور 4762، صحیح ترمذی، جلد 4، صفحہ 488، حدیث 2199

-12 شاید یہ کہا جاسکے کہ لفظ ''کلمات'' سے جو قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ تمام امتحانات مقصود ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے لئے یعنی وہ تمام امتحانات جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ساری زندگی میں اس وقت تک دیئے اور تائید الٰہی سے ان میں سرخرو ہوئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مفرد لفظ و کلمہ نہیں بلکہ جمع کا لفظ ''کلمات'' استعمال کیا ہے۔

-13 ماہرین تفسیر اور ماہرین لغت کی رائے جاننے کیلئے اس کتاب کا ضمیمہ ب ملاحظہ فرمائیے۔

-14 اصول کافی، جلد 1، صفحہ 286-287، الوافی، جلد 2، صفحہ 63، باب 30

-15 صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 122-123، مطبوعہ مصر، سنہ 1334ھ ق۔

-16 المستدرک جلد 3، صفحہ 109 اور 148 باقی مدارک کیلئے **مُعْجَمُ الْمُفَهرِس لِاَلْفَاظِ الْحَدِیْثِ النَّبوِیّ** سے رجوع کیجئے۔

-17 ترمذی، جلد 5، صفحہ 662، حدیث 3786

-18 سورۂ احقاف، آیت 12

-19 صحیح مسلم، جلد 6، صفحہ 2-4، کتاب الامارہ، باب الناس تبع القریش، صحیح بخاری، جلد 9، صفحہ 81، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف، صحیح ترمذی، جلد 2، صفحہ 45 (مطبوعہ ہندوستان) اور جلد 4 صفحہ 501 حدیث 2225 (مطبوعہ مصر) سنن ابوداؤد، جلد 4، صفحہ 106، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، اس کے علاوہ مسند احمد بن حنبل جلد 5 صفحہ 86-107۔

-20 نہج البلاغہ، مرتبہ صبحی صالح، خطبہ 144، صفحہ 201، مطبوعہ بیروت۔

-21 مسند احمد بن حنبل جلد 1، صفحہ 398 اور 406 مستدرک علی الصحیحین، جلد 4، صفحہ 501، کنز العمال جلد 3 صفحہ 26-27، منتخب الکنز، جلد 5، صفحہ 312 بر حاشیہ المسند، صواعق محرقہ، صفحہ 20، (دوسرا ایڈیشن 1385ھ) مجمع الزوائد جلد 5، صفحہ 190، الجامع الصغیر، جلد 1، صفحہ 75، تاریخ الخلفاء، صفحہ 10 (مطبوعہ پاکستان)

علیؑ اور بنوامیہ

یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد امیر معاویہؓ کے والد ابو سفیان نے اسلامی معاشرہ کے اندر ہی سے نئے اسلامی نظام میں ایک بہت بڑا رخنہ ڈالنے کی کوشش کی۔ تاریخ میں ثقیفہ بنی ساعدہ میں، حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد مسئلہ خلافت پر بحث وتمحیص کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کی بیعت کے بعد ایک روز ابوسفیانؓ مدینہ میں حضرت علیؓ کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے کہ ''میں مدینہ میں ایک عجیب شورش دیکھتا ہوں جس کو سوائے کشت وخون کے اور کوئی چیز فرونہیں کرسکتی، اے آل عبد مناف! ابوبکرؓ تمہارے ہوتے ہوئے سرداری کا کیسے مستحق ہوسکتا ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں ضعیف وذلیل حضرت علیؓ وعباسؓ۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت وسلطنت قریش کے نہایت چھوٹے اور حقیر قبیلے مین چلی جائے۔'' یہ کہہ کر علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا ''السبط یدک ابایعک فواللہ لئن شئت لا ملانھا علیہ خیلا وراجلا'' (ہاتھ بڑھاؤ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں بخدا اگر کہو تو میں ابوبکرؓ پر یہ میدان تنگ کردوں اور پلک جھپکنے میں اسے سواروں اور پیادوں سے بھردوں۔'' علیؓ نے یہ سن کر اس کا جواب نہایت سختی سے دیا اور کہا واللہ تمہاری اس بات سے سوائے فتنہ وفساد کے اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ بخدا تم نے اسلام میں آتش فتنہ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاؤ مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں۔'' (تاریخ ابن خلدون حصہ اول رسولؐ اور خلفائے رسول۔ ترجمہ علامہ حکیم احمد حسین

الہ آبادی، نفیس اکیڈمی کراچی۔ صفحات 222 لغایت 224)

اسی واقعہ کو طبری نے بھی ریکارڈ کیا ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ تاریخ طبری میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

ابوسفیان کی کارروائی

عوانہ سے مروی ہے کہ جب سب لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کے لئے تیار ہوئے ابوسفیان سب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے یقین ہے کہ اس کارروائی سے ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا جس میں خون ریزی ہو کر رہے گی' اے آلِ عبد مناف' ابوبکرؓ کو تمہارے معاملات میں مداخلت کرنے کا کیا حق ہے۔ وہ دونوں نکمےّ کہاں ہیں جن کو کمزور اور حقیر سمجھا گیا ہے یعنی علیؓ اور عباسؓ، اے ابوالحسن تم ہاتھ کھولو میں تمہاری بیعت کرتا ہوں۔ مگر علیؓ نے اس کی بات نہ مانی۔ ابوسفیان نے اس وقت کی مثال میں متلّمس کے یہ شعر پڑھے۔

الاّ الانلان عيوالحيى والوته　　ولن مقيم على خصف يراديه

وذاليشج فلا يبكى له اَحدُ　　هذا على الخسف معكوسّ برمته

سوائے ان دو ذلیلوں' قبیلے کے گدھے اور خیمے کی میخ کے اور کوئی ظلم کو آسانی سے برداشت نہیں کرتا۔ میخ پر جب ضرب لگائی جاتی ہے اس کا سر دبتا چلا جاتا ہے اور گدھا اپنے بار کی وجہ سے کراہتا ہے مگر کوئی اس پر رحم نہیں کرتا۔

علیؓ نے ابوسفیان کو ڈانٹا اور کہا کہ اس تجویز سے تیرا مقصد صرف فتنہ وفساد برپا کرنے کا ہے۔ تو نے ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے' ہمیں تیری اس نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

ابومحمد القرشی نے بیان کیا کہ ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد ابوسفیان نے علیؓ اور عباسؓ سے کہا کہ تم دونوں ذلیل ہو کہ اس موقع پر خاموش ہو' اور پھر یہ شعر اس موقع کی مثال میں پڑھے:

والحرينكره والرسلة الاجُد　　ان الهوان حمارِ الاهل يعرفه

صرف شہری گدھا ذلت کو برداشت کر لیتا ہے مگر شریف اور جوانمرد اسے برداشت

نہیں کرتا۔

ولا یقیم علی ضیمٍ یرادیه　　الاّ الاذلان عیرالحیی والوتد

اور سوائے بستی کے گدھے اور میخ کے کوئی ظلم کو آسانی سے برداشت نہیں کرتا۔

هذا علی الخسف معکوسٌ برمته　وذالیشجّ　فلایبکی　له　احدُ

میخ پر جب ضرب پڑتی ہے اس کا سر دب جاتا ہے اور گدھا اپنے بار کی وجہ سے کراہتا ہے مگر کوئی اس پر رحم نہیں کرتا۔

حضرت علیؑ کے خطبات وخطوط پر مشتمل کتاب نہج البلاغۃ کے پانچویں خطبے میں اسی واقعہ کا حوالہ ملتا ہے۔اس خطبہ کا عام فہم ترجمہ درج ذیل ہے۔

اے لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر پار ہو جاؤ' منافرت کی راہ چھوڑ دو اور مفاخرت و بزرگی کے تاج سر سے اُتار کر زمین پر پھینک دو' جو پر و بال (یار و یاور) کے ساتھ اٹھا' وہ کامیاب ہوا' جس نے حالات کو ان کے حال پر چھوڑا' اس نے راحت پائی۔ یہ (ذمہ داری) تو ایک گندہ پانی ہے' وہ لقمہ ہے جس کے کھانے والے کو اچھو ہو جاتا ہے اور وقت سے پہلے خوشہ چینی کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی عنبر کی زمین پر کاشت کرے۔ اگر اب خلافت کے بارے میں کچھ کہتا ہوں' تو لوگ کہیں گے یہ امارت کی حرص ہے اور اگر خاموش رہتا ہوں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہیں گے کہ مرنے سے اور جان دینے سے ڈرتا ہوں۔ افسوس...... میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے مصائب جھیل چکا ہوں......خدا کی قسم ابو طالب کا بیٹا موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا ایک طفل شیر خوار' پستان مادر سے۔نہیں یہ بات نہیں۔ میرے سکوت کا راز وہ اسرار ہیں کہ جو کچھ جانتا ہوں' اگر اُسے افشا کر دوں' تو تم یوں لرزنے اور کانپنے لگو گے' جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور کانپتی ہیں۔ (تاریخ طبری جلد اول' نفیس اکیڈمی کراچی' مترجم سید محمد ابراہیم بی اے۔ اشاعت دوم۔ صفحات 537'538)

حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت میں مختلف خطبات وفرمودات کے ذریعہ اپنے ہم عصروں کو گواہ بنا کر مستقبل کی تجزیہ نگاری کی تھی۔ امام علیؑ نہ صرف اپنی ذات میں ایک مدبر'

فقیہ، قادر الکلام اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے بلکہ بقول رسولؐ مقبول امام علی نبوت کے علم کے شہر کا صدر دروازہ بھی تھے۔ آپ نے اپنے خطبات میں امت مسلمہ کو خطرناک اور بھیانک مستقبل کے متعلق آگاہ بھی کیا اور ال ابی سفیان کی حکومت کے خاتمہ کی پیشینگوئی بھی کی تھی۔ امام حسینؑ ان تمام خطبات کے چشم دید گواہ تھے اور ان عوامل و عناصر سے بھی آگاہ تھے جن کی بدولت حالات خطرناک انجام کی طرف بڑھ رہے تھے جن میں شعائر اللہ کی توہین بھی شامل تھی۔ ان خطبات میں خطبہ نمبر 97 بعنوان عہد فتن خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں بنو امیہ کے دور اقتدار میں خدا کے ہر حرام کو حلال قرار دینے اور عہد و پیمان توڑنے (یعنی امام حسنؑ کے ساتھ کئے گئے معاہدہ صلح) کا ذکر موجود ہے۔ قارئین کرام کی سہولت کیلئے امام علیؑ کے چند خطبات کا ترجمہ درج ذیل پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

اب آپ نہج البلاغۃ کا خطبہ نمبر 72 پڑھیں جس میں امیر المومنینؑ نے مروان بن حکم اور اس کی اولاد کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ لوگ کس طرح مسلمانوں کو خون میں نہلائیں گے، اور فتنہ وفساد پھیلائیں گے، جو بعد میں صحیح ثابت ہوا۔

جنگ جمل میں جب مروان بن حکم گرفتار ہوا، تو اس نے حضرات حسنین علیہما السلام کو امیر المومنین کے پاس سفارشی بنا کر بھیجا، چنانچہ ان دونوں نے اس کی سفارش فرمائی، آپ نے اس سفارش کو مان لیا اور اسے رہا کر دیا، پھر دونوں حضرات (یعنی حسنین علیہما السلام) نے امیر المومنین سے عرض کیا۔

''یہ آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہے!''

اس پر امیر المومنین نے فرمایا:

''کیا اس نے قتل عثمانؓ کے بعد میری بیعت نہیں کی تھی؟...... (نہیں، اب) مجھے اس کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہاتھ تو بہت بڑے عہد شکن کا ہاتھ ہے۔ اگر آج یہ بیعت کرے گا تو کل اسے توڑ بھی دے گا۔

خبردار......!

یہ حکومت حاصل تو کرے گا مگر اتنی ہی دیر کے لیے جتنی دیر کتا اپنی ناک کو چاٹتا ہے۔

یہ چار سرداروں کا باپ ہے اور وہ دن بہت جلد آنے والا ہے' جب مروان اور اس کے فرزندوں سے مسلمانوں کو روز سُرخ دیکھنا پڑے گا۔

نہج البلاغۃ کے خطبہ نمبر 90 میں امیر المومنین نے عہد بنو امیہ کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ اور لوگوں کو صبر و شکر کی تلقین فرمائی ہے۔

خدا کی قسم' یہ بنو امیہ اس وقت تک برسر اقتدار رہیں گے' جب تک خدا کے ہر حرام کیے ہوئے حکم کو حلال نہ کر لیں۔ اور (مسلمانوں سے) جو عہد و پیمان کر چکے ہیں اس گرہ کو (اپنے جور و جبر سے) کھول نہ دیں یہاں تک کہ اینٹوں سے بنا ہوا کوئی مکان اور بالوں سے بٹا ہوا کوئی خیمہ ایسا نہ ہوگا' جہاں ان کا ظلم و ستم داخل نہ ہو چکا ہو اور ان کے فساد و تباہ کاری اور بدرفتاری نے وہاں کے لوگوں کو درماندہ نہ بنا دیا ہو' یہاں تک کہ (ان کے ظلم و ستم کے باعث) دو رونے والے گروہ پیدا ہو جائیں گے' ایک وہ کہ اپنے دین پر گریہ کناں ہوگا' دوسرا اپنی دنیا پر (خون کے) آنسو بہائے گا۔ (دین پر اس لیے روئے گا کہ آئین دین پر عمل کی آزادی نہ ہوگی اور دنیا پر یوں روئے گا کہ اس کے مال و دولت پر غارت گری ہوگی اور وہ تاب دفاع سے محروم ہوگا۔) یہاں تک کہ تم میں سے کسی کی یاری و خدمت گزاری ان میں سے کسی کے لیے ایسی ہوگی جیسے غلام کی اپنے آقا سے کہ وہ (محض خوف سے) سامنے تو فرماں برداری کرتا ہے اور غیر حاضری میں اس کی بدگوئی اور برائی بیان کرتا ہے۔ یہاں تک کہ (اس آزمائش سے ایسا معلوم ہوگا کہ) بزرگ ترین شخص تم میں سے وہ ہے جو خدا سے حسن ظن رکھے' پس اگر خدا تمہیں عافیت عطا فرمائے (اس فتنہ و فساد سے رہائی عطا کرے) تو اس کا شکر و سپاس بجالانا اور اگر گرفتار بلا کر دے تو صبر کرنا اور شکیبائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا (یاد رکھو) متقی اور پرہیزگار لوگوں ہی کے لیے کامیابی ہے۔

نہج البلاغۃ کے خطبہ نمبر 92 میں حضرت نے اپنے علم و کردار' کے ساتھ ساتھ کچھ مستقبل کے بارے میں فرمایا ہے۔ اس میں بنو امیہ کا دور بھی شامل ہے، فرماتے ہیں:

اے لوگو!

حمد و ثنائے الٰہی' اور درود بر پیغمبر اکرمؐ کے بعد واضح ہو' کہ میں نے فتنہ وفساد کی آنکھیں نکال دی ہیں۔ میرے سوا کوئی بھی اس فتنہ وفساد کو (رفع کرنے کی) جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ تاریکی روز افزوں اور اس کی سختی بہت بڑھ چکی تھی' لہٰذا قبل اس کے تم مجھے نہ پاؤ' جو کچھ دریافت کرنا ہے' دریافت کرلو۔ اس ذات کی قسم' جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ تمہارے اور قیامت کے درمیان جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں یا اس گروہ کے بارے میں جو سو کو ہدایت یاب کرے گا تو سو کو گمراہ بھی کردے گا' اس کے متعلق کسی امر کا سوال نہ کرو گے' مگر یہ کہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کا پکارنے والا' اس کا کھینچنے والا اور ہنکانے والا کون ہے؟ اور اس کی سواری کے ٹھہرنے کا مقام اور اس کے قیام کی منزل کہاں ہے؟ ان میں سے کون قتل ہو کر مارا جائے گا اور کون اپنی موت مرے گا؟

اور اگر میں تمہارے درمیان نہ رہا اور اس کے بعد مشقتیں اور مصیبتیں تم پر نازل ہوئیں تو سوال کرنے والوں میں سے اکثر اپنا سر جھکا لیں گے اور جن سے پوچھا گیا ہوگا' وہ (جواب دینے کی) جرأت نہ کرسکیں گے' اور یہ اس وقت ہوگا جب لڑائی طویل ہو جائے گی کہ تم بلا' اور تعب کے دنوں کو زیادہ طویل گمان کرنے لگو گے' یہاں تک کہ خدا عالم تمہارے بچے ہوئے خوش کرداروں کو فتح عطا فرمائے گا۔

بلاشبہ فتنے جب نمودار ہوتے ہیں تو حق کو مشتبہ کر دیتے ہیں اور جب منہ موڑتے ہیں' تو متنبہ کر جاتے ہیں' جب سامنے آتے ہیں تو پہچانے نہیں جاتے' اور جب پیٹھ موڑتے ہیں تو آسانی سے شناخت کر لیے جاتے ہیں۔ یہ ہواؤں کی طرح چکر کاٹتے ہیں۔ کسی آبادی کو زد میں لے لیتے ہیں' کسی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

خبردار!

میرے نزدیک تم پر سب سے سخت فتنہ جو نمودار ہوگا' وہ بنو امیہ کا فتنہ ہوگا' کیونکہ یہ خود بھی تاریک ہے اور دنیا کو بھی تاریک کردے گا۔ اس کا فرمان سب کے لیے عام مگر بلائیں اہل بیت کے لیے خاص ہوں گی!

جو کوئی اس فتنہ میں بینا رہا' وہ بلا اور سختی کا شکار ہوگا' اور جو نابینا اس سے مصیبت اور

بلا دور رہے گی۔

خدا کی قسم' میرے بعد بنوامیہ تمہارے لیے بُرے حاکم ثابت ہوں گے' اس شریر اونٹنی کی مانند جو دودھ دُوہنے والے کو کاٹ کھاتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اسے روندتی اور پاؤں سے پامال کرتی ہے اور اپنے دودھ کو روک لیتی ہے۔

یہ بڑی مدت تک تم پر مسلط رہیں گے' یہ صرف اسی کو صحیح سلامت چھوڑیں گے جو ان کے لیے مفید ہو یا کم از کم اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو' ان کی آفت تم سے دُور نہ ہوگی' تا آنکہ تم میں کا دادخواہ ان کے سامنے اس طرح ہو جائے گا جیسے آقا کے سامنے غلام' اور متبوع کے سامنے تابع' ان کا فتنہ تم پر اس بُری طرح اور خوفناک طور پر وارد ہوگا کہ نہ اس میں ہدایت کا کوئی مینار ہوگا اور نہ حق کی کوئی ایسی علامت جو دیکھی جا سکے۔

ہم اہل بیت رسولؐ اس فتنہ کی دسترس سے دُور ہیں' اور بنوامیہ کے مانند اس کے داعی نہیں ہیں' پھر خدا ان کے ستم و جور کو اس طرح دور کردے گا جس طرح گوشت سے کھال جدا کی جاتی ہے' ان لوگوں (بنوعباس) کے وسیلہ سے' جو ان کو ذلیل کریں گے' انہیں سختی کے ساتھ کھینچیں گے اور لبالب بھرے ہوئے تلخ جام پلائیں گے' وہ انہیں زخم شمشیر کے علاوہ کچھ اور نہیں دیں گے' نہ خوف کے علاوہ کچھ اور پہنائیں گے۔

اس ہنگام میں قریش آرزو کریں گے کہ دنیا و مافیہا دے کر' صرف ایک بار (تھوڑی دیر کے لیے) مجھے پالیں' خواہ اونٹ کے ذبح کرنے کی دیر تک ہی کے لیے کیوں نہ ہوتا کہ میں ان سے وہ پوری چیز لے لوں' جس کا اس وقت صرف ایک حصہ طلب کر رہا ہوں' اور یہ نہیں دیتے۔

مطلب یہ کہ قریش' یعنی بنوامیہ' بنوعباس کے ہاتھوں اس طرح ذلت و خواری اور تباہی و بربادی اور ہرج مرج سے دوچار ہوں گے کہ آرزو کریں گے کاش میں موجود ہوتا اور یہ مجھے اپنا امیر بنا لیتے۔

اور حضرت کی اس گفتار کا شاہد مورخوں کا یہ قول ہے کہ...... ''بنوامیہ کے آخری بادشاہ مروان بن محمد نے جب خراسان میں لشکر بنوعباس کی قیادت کرتے ہوئے عبداللہ ابن علی'

ابن عبداللہ ابن عباس کو دیکھا' تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا:

''اے کاش! علی ابن ابی طالب بجائے ایں جواں درزیر ایں بیرق پیشوائے لشکر بود۔''

نہج البلاغۃ میں درج خطبہ نمبر 104 میں آپ نے انقراض دولت بنوامیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور پند و نصیحت قبول کرنے نہی عن المنکر کے فریضہ انجام دینے اور منہیات سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے!

یہاں تک کہ خدائے بزرگ و برتر نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسالت و پیغمبری کے منصب سے سرفراز فرمایا' کہ (نیکوکاروں اور بدکاروں کے) آپ گواہ بنیں اور (نیکوکاروں کو ان کے اعمال حسنہ کے صلہ میں) مژدہ دیں اور (معصیت کاروں کو عذاب الٰہی سے) ڈرائیں۔ آپ عہد طفلی و خوردسالی میں بھی بہترین خلائق اور نبوت میں (چالیس سال کی عمر میں) کریم ترین و برگزیدہ ترین شخصیت تھے' آپ کی طبیعت اور خلقت جملہ پاکانِ عالم سے پاک تر تھی' اور آپ کی بخشش' تمام دادودہش کرنے والوں سے (کہیں) زیادہ تھی۔

پس (اے نبوامیہ) دنیا تمہارے لیے شیریں اور لذیذ نہیں بن سکتی اور اس کے پستان سے دودھ پینے کی توانائی تم میں نہیں آئی مگر اس کے بعد کہ تم نے اسے اس حالت میں پالیا کہ اس کی مہار ڈھیلی تھی اور اس کا پالان جنبش میں تھا' (اور یہ اسی کا اثر تھا کہ) اس (دنیا) کا حرام ان (صاحبانِ خلافت) قوموں (قبیلوں) کے نزدیک بے کانٹے کی بیری تھی اور حلال نہ صرف دور بلکہ موجود ہی نہیں تھا اور یہ گمان نہ کرنا کہ دولت بنوامیہ اسی طرح قائم رہے گی' بلکہ بخدا' تم نے اسے ایک عرصہ دراز تک پھیلے ہوئے سایہ کے مانند پایا' پس زمین تمہارے لیے خالی ہے اور تمہارے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور پیشوایان (حقیقی) کے ہاتھ تم سے رُکے ہوئے ہیں' تمہاری تلواریں ان پر مسلط ہیں' اور ان کی تلواریں تم سے روک لی گئی ہیں!

خبردار!

ہر خونِ (ناحق) کا بدلہ لینے والا اور ہر حق کا طلبگار ہوتا ہے اور ہمارے خون کا خونخوار ایسا حاکم ہے کہ خود اپنے بارے میں (بدون دلیل و گواہ) حکم صادر کرتا ہے اور ہمارا

خون اور ہمارے حق کا طلب گار وہ خدائے عز و جل ہے کہ جسے وہ طلب کرے، اس سے وہ عاجز نہیں اور جو بھاگے وہ اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

پس اے بنو امیہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بہت جلد تم دیکھ لو گے کہ ریاست و دولت دنیا (تم سے چھن کر) دوسروں کے ہاتھ میں آجائے گی اور تمہارے دشمنوں کے گھر میں منتقل ہو جائے گی۔

خبردار!

بیناترین آنکھ وہ آنکھ ہے کہ جس کی نظر خیر و صلاح پر ہو، ہوشیار ہو جاؤ کہ شنواترین وہ کان ہے کہ جو پند و نصیحت کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہے۔

اے لوگو! (اپنی سعادت و خوش بختی کا) چراغ، نصیحت کرنے اور نصیحت قبول کرنے والوں کی لو سے جلاؤ، اور چشمہ صاف سے پانی کھینچ لو کہ گندلے پن سے پاک ہے!

بندگانِ خدا! اپنے جہل و نادانی پر اعتماد نہ کرو، نہ خواہشات نفس کی پیروی کرو، کیونکہ اس منزل پر وارد ہونے والا، گویا اس نہر کے کنارے اُترنے والا ہے جس کا شگاف قریب بہ انہدام ہے اور ہلاکت کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے، ایک خیال سے دوسرے خیال پر تکتا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو چیز چسپاں نہیں ہو سکتی اسے چسپاں کر دے اور جو چیز نزدیک نہیں ہو سکتی، اسے نزدیک کر دے۔ پس خدا سے ڈرو، ایسا نہ کرو کہ اپنی شکایتیں ایسے شخص کے سامنے پیش کرنے لگو جو تمہارے غم و اندوہ کو برطرف نہ کر سکے اور نہ اپنی رائے سے انہیں توڑ سکے جو (احکام الٰہی) کہ تم پر لازم کیے جا چکے ہیں۔

امام پر ان چیزوں کا قیام واجب ہے جن کا پروردگار نے اسے حکم دیا ہے (اور یہ پانچ چیزیں ہیں) (۱) موعظے کا پہنچانا (۲) نصیحت میں کوشش (۳) سنت کی تجدید اور اس کا احیا (۴) لائق تعزیر پر حد جاری کرنا (۵) بیت المال سے لوگوں کو ان کا صحیح حصہ دینا!

پس حصول علم و دانش کے لیے جلدی کرو قبل اس کے کہ اس کی گیاہ خشک ہو جائے۔ اور قبل اس کے کہ اپنے آپ کو دوسری چیزوں میں مشغول کرو، کسب نور (علم و دانش) اس کے اہل (امام) سے حاصل کر لو، مرتکبین کو روکو اور خود بھی باز رہو، کیونکہ تمہیں نہی کا حکم، خود باز

آ چکنے کے بعد ہی دیا گیا ہے!

نہج البلاغۃ میں درج خطبہ 157 میں امیر المومنین نے بعثت نبیؐ، مدح قرآن اور بنی امیہ کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

رسولوں کے درمیانی وقفے کے موقع پر حضرتؐ کو بھیجا۔ جبکہ اُمتیں ایک مدت سے خواب (غفلت) میں تھیں اور مضبوط (احکام) ٹوٹ رہے تھے، تو حضرتؐ ان لوگوں میں اپنے ساتھ گواہی لے کر تشریف لائے جو قابلِ اقتدا نور ہے اور وہ قرآن ہے اس سے بولنے کی درخواست کرو، تو وہ نہ بولے گا، ہاں اس کے معانی و مطالب کی خبر دی جائے گی (حاملین قرآن اہل بیت مطلب بتائیں گے) یاد رکھو! اس قرآن میں مستقبل کا علم ہے۔ ماضی کا تذکرہ ہے۔ تمہارے امراض کا اعلان اور تمہاری درمیانی (بدنظمی) کی ترتیب و تنظیم ہے۔

اُس زمانے میں تو اینٹ کا مکان اور اُون کا (خیمہ) بھی ایسا نہ باقی ہوگا کہ جس میں ظلم وستم کے بانیوں کی سختیاں نہ پہنچ چکی ہوں اور ان کے مظالم نہ گھس گئے ہوں۔ اس وقت نہ آسمان (بارگاہ الٰہی) میں ان کا کوئی عذر باقی رہا ہوگا نہ زمین پر کوئی مددگار۔

تم نے غیر مستحق کا انتخاب کیا اور (خلافت) کو نامناسب جگہ پر رکھا۔ اور خدا ظلم کرنے والے سے بہت جلد بدلہ لے گا۔ کھانے کا کھانے اور پینے کا پینے سے۔ کھانے کو ایلوا اور پینے کو حد سے زیادہ تلخ اور کڑوا پانی ملے گا، پہننے کو خوف اور تلوار کا لباس۔ وہ لوگ (بنی امیہ) غلطیوں کی سواری ہیں اور گناہوں کا بوجھ۔

تو میں قسم پر قسم کھاتا ہوں کہ بنی امیہ خلافت کو میرے بعد اس طرح پھینک دیں گے جس طرح آبِ بینی اور اس کے بعد پھر یہ مزہ ان کو قیامت تک چکھنا نصیب نہ ہوگا۔

نہج البلاغۃ میں درج خطبہ نمبر 229 میں امام علیؑ نے سیاسی مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس خطبہ کے مندرجات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالات کس رخ جا رہے تھے۔

میرے ماں باپ نثار وہ لوگ ان گنے چنے آدمیوں میں ہیں جن کے نام آسمانوں میں مشہور اور زمین میں نامعلوم ہیں۔ اچھا تم اپنے معاملات کے دگرگوں ہونے، اور اتحاد اور میل کو ختم ہونے اور نسلوں کی حکومت کا انتظار کرو۔ کہ اس وقت مومن کے لیے تلوار کھانا

حلال (کمائی) کے ایک درہم سے زیادہ آسان ہوگا۔ جب لینے والا (سائل) دینے والے (سخی) سے زیادہ ثواب پائے گا۔ اس وقت لوگ نعمت و راحت میں بے شراب کے مست ہوں گے۔ بلا سبب حلف اٹھائیں گے، مجبوری نہ ہوگی، مگر جھوٹ بولیں گے۔ اس وقت جب کہ بلائیں اس طرح کاٹیں گی جس طرح اونٹ کے کوہان کو (عماری اور) پالان کاٹتا ہے۔ یہ دکھ کس قدر طولانی اور یہ امیدیں کتنی دور ہیں۔

لوگو!

اپنے ہاتھوں سے ان ناقوں کی مہاروں کو چھوڑ دو، جن کی پیٹھ پر تمہارے کرتوت لدے ہوئے ہیں (نفس امارہ کی پیروی نہ کرو) اپنے بادشاہ (یعنی مجھ) سے ٹکر نہ لو کہ اس عمل کے بعد بُرا کہے جاؤ گے اور فتنوں (انقلابات) کی آگ بھڑکتے وقت بے دھڑک آگے نہ بڑھو، اس کے راستوں سے ہٹ جاؤ، اس کی راہیں خالی رکھو، اپنی جان کی قسم، اس کے شعلوں میں مومن تباہ، اور غیر مسلم (منافق و کافر) بچ جائیں گے۔

تم میں میری مثال اس چراغ کی سی ہے، جو اندھیرے میں اس لیے ہوتا ہے کہ جو آئے وہ روشنی حاصل کرے، تو لوگو! سنو اور یاد رکھو اور دل کے کان لگا کر سنو!

بظاہر یہ خطبہ یا کلام مبارک انتہائی بحرانی دور سے متعلق ہے اور حضرت نے اس بحرانی دور کے لئے مرد مومن کی نجات کا ذریعہ بتایا کہ صبر و سکون کے ساتھ یقین و اعتقاد پختہ رہے۔ مجھ سے وابستہ رہو۔ آندھیاں اتر جائیں گی، سیلاب نکل جائیں گے۔ حقیقتیں کھل کر بے نقاب ہوں گی۔ لیکن دل و دماغ کی حاضری شرط ہے۔ ورنہ اس اندھیری رات اور تاریک راہ میں، ہر چمک پر نور، اور ہر نور پر منارۂ منزل کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ اسی غلط فہمی نے قوموں، مفکروں، جماعتوں اور ان کے سربراہوں کو گمراہ کر دیا۔

حق کی آواز کمزور نہیں، ایمان کی صدا خارا شگاف ہوتی ہے۔ حقیقت کا سورج پوری تابنا کی سے چمکتا ہے لیکن

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب راہ چہ گناہ

امیر معاویہؓ کے ساتھ امیر المومنین علیؑ کی خط و کتابت بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ایک خط کے مندرجات سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنی امیہ نے حضرت علیؑ کی خلافت کو قبول ہی نہ کیا۔خط ملاحظہ ہو۔

امابعد' وقت آ گیا ہے کہ روشن حق کو دیکھو اور اس سے فائدہ اُٹھاؤ تم اپنے بزرگوں کی راہ پر چل پڑے ہو۔باطل دعوے کر رہے ہوں' انسانوں کو کذب و زور کی دلدلوں میں پھنسا رہے ہو۔اس مقام کا ادعا کر رہے ہو' جو تم سے بہت بلند ہے۔اس چیز کو ہتیا لینا چاہتے ہو' جس سے روک دیے گئے ہو۔یہ سب اس لیے ہے کہ تم حق سے بھاگ چکے ہو اور اس بات سے منکر ہو گئے ہو جو تمہارے لیے تمہارے گوشت اور خون سے بھی زیادہ ضروری ہے حالانکہ اسے اچھی طرح سُن چکے ہو اور اس کے علم سے تمہارا سینہ بھی بھر چکا ہے۔تو اب بتاؤ حق کے بعد کیا رہ جاتا ہے؟ محض ضلالت' کھلی ضلالت! اور بیان کے بعد کیا رہتا ہے؟ اوہام' سراسر اوہام! اگر تمہیں بچنا ہے تو شبہات سے بچو' شبہات کے جال سے بچو۔فتنہ مدت سے اپنے پردے چھوڑے ہوئے ہے اور اس کے اندھیرے ایک زمانے سے آنکھوں کو چندھا کر چکے ہیں۔

تمہارا خط ملا۔یہ خط بھی عجیب ملغوبہ ہے امن وسلام تم سے دور ہو۔تمہارے پاس جو کچھ ہے محض اساطیر ہیں اور ڈھکو سلے' ان کا تانا بانا نہ تمہارے علم کا کام ہے نہ تمہاری عقل کا عمل' یہ خط لکھ کر تم ویسے ہو گئے ہو جیسے کوئی شخص سنگلاخ زمین پر چل رہا ہو' یا اندھیاروں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو' تم ایسی بلندی کی طرف اُٹھ گئے ہو' جہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔اس کے نشانِ راہ بہت دُور ہیں۔عقاب بھی وہاں پر نہیں مار سکتا اور وہ ثریا کا ہمدوش ہے۔

نہج البلاغۃ میں درج خطبہ 172 میں امیر المومنین نے بتایا ہے کہ امر خلافت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں استحقاق' اہلیت اور حق کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔اس خطبے کے مندرجات سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ امام حسینؑ کے ذہن میں خلافت کا معیار کیا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ وحی خداوندی کے امین ہیں' خاتم پیغمبراں ہیں' رحمت الٰہی کے بشارت دینے اور قہر خداوندی سے ڈرانے والے ہیں!

اے لوگو......!

امر خلافت کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے، جو ان میں سب سے زیادہ اس پر قوی اور قادر ہو اور اس کے بارے میں جو احکام خداوندی میں سب سے زیادہ ان کا واقف اور رمز شناس ہو۔ تو اگر (اس باب میں) کوئی فتنہ انگیزی اور تباہ کاری پر آمادہ ہوتا ہے (تو سب سے پہلے) اسے حق کی طرف پلٹنے پر آمادہ کیا جائے گا اور انکار کی صورت میں اس سے جنگ (جائز) ہو گی۔ اپنی جان کی قسم! اگر امر امامت اس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتا، جب تک سب لوگ حاضر نہ ہوں، تو یہ بات کبھی عمل پذیر نہیں ہو سکتی، (کیونکہ ایسا ہونا ناممکن ہے) لیکن جو لوگ اس کے اہل ہیں (یعنی اصحاب و آشنایانِ راہِ خیر و شر، ان لوگوں پر حکم لگا سکتے ہیں جو تعیین امامت کے وقت موجود نہیں تھے۔ پس اس صورت میں جو موجود ہوں وہ اس فیصلہ و پلٹنے کا حق نہیں رکھتے، اور جو غیر موجود ہوں۔ انہیں یہ اختیار نہیں کہ کسی اور کو منتخب کر لیں۔

خبردار......!

میں دو شخصیتوں سے ضرور جنگ کروں گا، ایک اس سے جو ایسی چیز کا دعویٰ کرے، جو اس کی نہیں ہے، اور دوسرے اس سے جو ان حقوق کو ادا نہ کرے، جو اس پر واجب ہیں۔

خدا کے بندو! میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں بلاشبہ تقویٰ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے، جن کی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو وصیت کرتے ہیں، اور یہ انجاموں میں سب سے بہتر انجام ہے، خدا کے نزدیک! تمہارے اور اہل قبلہ کے مابین جنگ کا دروازہ کھل گیا ہے، اور اس پرچم کو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو صاحب بصیرت ہو، اور شدائد پر صبر کا عادی ہو، حق کے مواقع سے آشنا ہو، پس تمہیں جس بات کا حکم دیا جائے اس کی پیروی کرو، جس بات سے منع کیا جائے اس سے باز آ جاؤ اور کسی معاملہ میں جلد بازی سے کام نہ لو، جب تک وہ اچھی طرح واضح نہ ہو جائے، کیونکہ یہ ہمارا حق ہے، کہ اس بات میں تغیر کر دیں جس سے تم (ازروئے نادانی) انکار کرتے ہو، (بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا انکار کیا جاتا ہے، لیکن مصلحت ان کے قبول کر لینے میں ہوتی ہے، اور بعض ایسے امور ہوتے ہیں کہ انہیں قبول کر لیا جاتا ہے مگر مصلحت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے، کہ انہیں رد کر دیا جائے

پس چونکہ تم حقائق نا آشنا ہو' لہٰذا میری گفتار سنو اور اس پر عمل پیرا ہو)۔

خبردار......!

یہ دنیا جس کی تمنا کر رہے ہو' اور جس کے بارے میں رغبت کا اظہار کرتے ہو' اس کا یہ حال ہے کہ کبھی یہ تمہیں غضب ناک کر دیتی ہے' کبھی راضی کر لیتی ہے' نہ یہ تمہارا اصلی گھر ہے نہ منزل مقصود' جس کے لئے تم خلق کئے گئے ہو' نہ وہ منزل ہے۔ جس کی طرف تمہیں بلایا گیا ہے' نہ یہ تمہارے لئے ہمیشہ باقی رہے گی' نہ تم اس پر ہمیشہ باقی رہو گے' اس نے اگر تمہیں اپنی سجاوٹ سے فریب دیا ہے تو اپنی بدی سے تمہیں ڈرایا بھی ہے' تم اس کی سجاوٹ کے فریب کو اس کی خوف انگیزی کو' اس کی تحریص کو' اس کی تخویف کی بنا پر ترک کر دو' اور یہاں رہنے کے باوجود' اس گھر کی طرف بڑھو' جس کی طرف تمہیں بلاوا دیا گیا ہے' اپنے قلوب کو اس کی جانب سے پھیر لو' اور تم میں سے کسی کی اگر کوئی مرغوب اور پسندیدہ چیز روک لیجائے تو اس طرح اس پر نہ کڑھے جس طرح لونڈیاں روتی ہیں اور خدا نے تم پر جو نعمتیں ارزانی فرمائی ہیں' ان کی تکمیل اس طرح کرو کہ اس کی طاعت میں دُکھ جھیلو' اور اس کی کتاب حفاظت کرو!

خبردار......!

اس دنیا میں اگر تمہاری کوئی چیز ضائع جائے تو یہ تمہارے لئے مضر نہ ہوگا' اگر تم نے اپنے دین کے اصول مستحکم کر لئے ہوں۔

خبردار......!

دین کو ضائع کر دینے کے بعد تم کو دنیا کی کوئی چیز بھی فائدہ نہ دے گی' جس کی تم نے حفاظت کی ہو' خدا ہمارے اور تمہارے دونوں کے دلوں کو حق کی طرف متوجہ کر دے اور ہم کو اور تم کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

تاریخ ابن خلدون' جلد دوم بعنوان خلافت معاویہ' کے صفحات 20 لغایت 24 میں درج ہے کہ قبیلہ قریش میں بنی عبد مناف ایک ایسا گروہ تھا جس کا کثرت نفوس اور شرافت میں کوئی خاندان مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عبد مناف کے دو بڑے خاندان بنو امیہ اور بنو ہاشم

تھے۔امیہ اور ہاشم کی امارت و ریاست کو قبیلہ قریش تسلیم کرتا تھا مگر بنو ہاشم کے مقابلہ پر امیہ کے افراد زیادہ تھے اور بقول شاعر انما العزة للکاثر۔لہٰذا بنو امیہ کو قبل اسلام ایک اعزاز حاصل تھا۔

اسلام کی بدولت مسلمان امور جاہلیت سے رک گئے۔حضورؐ کا قول ہے کہ بے شک اللہ تبارک تعالیٰ نے تم لوگوں سے جاہلیت کا آبائی نسل فخر دور کر دیا ہے کیونکہ ہم اور تم آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔لیکن صفوان بن امیہ نے جنگ حنین میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست کے بعد طنزاً کہا تھا کہ آج سحر باطل ہو گیا ہے۔

اسی صفحہ پر ابوسفیان کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ

بنی عبد مناف کا شرف و اعزاز ہمیشہ بنو عبد شمس اور بنو ہاشم میں محدود رہا۔لیکن ابو طالب کے انتقال کے بعد اُس کے لڑکے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہجرت کر آئے اور ایسا ہی حضرت حمزہؓ بعد ازاں حضرت عباسؓ اور اکثر بنو عبدالمطلب اور تقریباً کل بنو ہاشم مکہ چھوڑ کر مدینہ میں آگئے۔اس وقت تنہا بنی اُمیہ مکہ میں ریاست و اعزاز کی کرسی پر متمکن ہو گئے۔مشائخین قریش نے بنو اُمیہ کو بدر میں اعزاز و افتخار کا تمغہ دیا اس واقعہ میں عتبہ' ربیعہ' ولید' عقبہ بن ابی معیط وغیرہ سرداران بنی عبد شمس کے مارے جانے سے ابوسفیان کو بنی اُمیہ کی سرداری مستقلاً مل گئی اور قریش میں ان کو سر برآوردہ ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔چنانچہ جنگ اُحد میں بنو اُمیہ ہی قریش کے سردار تھے اور نیز غزوہ احزاب اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں بھی یہی سپہ سالار رہے۔زمانہ فتح مکہ میں ابوسفیان کے اسلام لانے کے بعد عباسؓ ابن عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا (جیسا کہ مشہور ہے......ابوسفیان اور حضرت عباسؓ میں دوستی تھی) یا رسول اللہ ان ابا سفیان (جل یحب الفخر) فاجعل له ذکراً آپ نے ارشاد فرمایا من دخل و ادابی سفیان فھو امن۔پھر فتح کے بعد آپ نے قریش سے فرمایا تم لوگ آزاد ہو! جاؤ مسلمان ہو جاؤ۔

خلافت راشدہ اور بنو امیہ

اس کے بعد دور خلافت اول میں روساء قریش نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس امر کی شکایت کی کہ وہ مہاجرین اولین کے برابر نہیں سمجھے جاتے اور حضرت عمرؓ بن خطاب

کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روساء قریش کو شریک شوریٰ نہ کرنے کی بھی شکایت ہے تو حضرت ابو بکرؓ صدیقؓ نے عذر خواہی کر کے کہا اپنے بھائیوں کی طرح جہاد کرو' اسلام کو مخالفین کی ایذا رسانی سے مستغنی بناؤ، مرتدین عرب کی سرکوبی کرو جس سے اسلام اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہو۔ مرتدین و کفار اعراب کا استیصال کرو تا کہ تمہاری بھی ویسی ہی عزت کی جائے' چنانچہ آپ نے جنگ مرتدین پر ان کا لشکر مرتب کر کے روانہ کیا۔ پھر حضرت عمرؓ فاروق کا زمانہ آیا تو انہوں نے ان کو روم کی جنگ پر روانہ کیا قریش کو شام پر فوج کشی کی ترغیب دی اور یزید بن ابی سفیان کو مامور فرمایا اور حضرت عثمانؓ بن عفان نے بعد حضرت عمرؓ فاروق کے ان کو بحال رکھا اس وجہ سے بنو اُمیہ کی ریاست و سرداری قریش پر زمانہ اسلام میں اس رعایت سے مل گئی جو فتح مکہ سے کچھ دنوں پہلے ان کو حاصل تھی جس کا رنگ زمانہ نے نہ بدلا تھا جس کے عہد کو لوگوں نے اس وقت نہ بھلایا تھا جس وقت بنو ہاشم امر نبوت میں مصروف تھے اور دنیا کو چھوڑ کر بعوض اس کے شرف قربت الٰہی حاصل کر رہے تھے اُس زمانہ میں لوگ برابر بنو اُمیہ کی سرداری کے معترف رہے۔ مثلاً حنظلہ بن زیاد کاتب نے محمد بن ابی بکر سے یہ کہا تھا کہ اگر یہ کام (خلافت و امارت) اس شور و غل سے انجام کو پہنچ گیا تو تم پر بنو عبد مناف غالب آجائیں گے۔

تاریخ ابن خلدون کے صفحہ 23 پر امام حسنؓ کی دستبرداری کے عنوان سے یوں لکھا ہے:

حضرت عثمانؓ بن عفان کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی امارت سے مخالفت کی تو لشکر کا زیادہ حصہ بوجہ فضیلت صحبت و سابق الاسلام ہونے کے ان ہی کے ساتھ رہا مگر اکثر یہ لوگ قبائل ربیعہ و یمن وغیرہ کے تھے اور امام معاویہؓ کا لشکر جو در حقیقت شام کا لشکر تھا اس میں قریش و مضر بھرے ہوئے تھے جو زمانہ فتح سے حدود شام میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پس ان کا قومی جوش اور حمیت و شوکت بڑھی ہوئی تھی پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے ہوا خواہوں میں سے ایک گروہ علیحدہ ہو گیا جو خوارج کے نام سے موسوم ہوا اور آپ کو انہوں نے اپنی جنگ میں مصروف کر لیا اس اثناء

میں امیر معاویہؓ نے اکثر شہروں کو دبالیا اور حضرت علیؓ ابن ابی طالب شہید ہو گئے۔امام حسنؓ ابن علی تخت خلافت پر بیٹھتے ہی خلافت سے دست بردار ہو گئے اور تمام مسلمانوں نے 41ھ کے نصف میں امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بالاتفاق بیعت کی یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ شان نبوت اور خوارق عادات کو بھلا کر قومی حمیت اور غلبہ پر آرہے تھے اور غلبہ کل عرب اور مضر پر بنو امیہ کو حاصل تھا اوران میں سب سے زیادہ عظیم الشان امیر معاویہؓ تھے نہ انہوں نے خود خلافت کو تقسیم کیا اور نہ کوئی غیر شخص ان کا سہیم ہوا جس سے ان کے قدم میدان حکومت میں جم گئے۔ان کی شان بڑھ گئی اُن کی ریاست سرزمین مصروشام میں مستحکم ہوگئی۔بیس برس تک حکمرانی کی اوراس دریا دلی سے لوگوں کو اپنے انعامات سے مستفید کیا کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ان کی قوم کا اُن سے زیادہ فیاض نہ تھا رؤساء عرب اور سرداران مضر کے ساتھ کریمانہ برتاؤ رکھتے تھے ان کی سخت و ناملائم باتوں کو برداشت کرتے ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے ان کے تحمل و بردباری کی کوئی حد نہ تھی۔یہی سبب تھا کہ ان کی حکومت و ریاست کو کسی قسم کی لغزش نہ ہوئی بلکہ بتدریج استقلال ہوتا گیا۔

اس کے بعد ابن خلدون عدی بن حاتم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مورخین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز عدی بن عاتم' امیر معاویہؓ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے امیر معاویہؓ نے ازراہ مذاق امیر المومنین حضرت علیؓ کی مصاحبت پر طنز کیا۔عدی نے ترش رو ہو کر کہا واللہ وہ قلوب جس سے ہم نے تم سے عداوت کی تھی ہمارے سینوں میں ہیں اور بے شک وہ تلواریں جس سے ہم تم سے لڑے تھے ہمارے قبضہ میں ہیں اگر تم ایک بالشت بھی بدعہدی سے ہماری طرف بڑھو گے تو ہم بُرائی سے تمہاری طرف پانچ ہاتھ بڑھیں گے اور بلاشبہ موت کا خوف اور حالت نزع کی تکلیف ہمارے لئے آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے حق میں کوئی کلمہ ناملائم سنیں' اے معاویہ تلوار کی بو سے تلوار اٹھائی جاتی ہے۔امیر معاویہ نے یہ سُن کر حاضرین سے خطاب کر کے کہا یہ باتیں نہایت صحیح ہیں ان کو لکھ لو پھر عدی کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی و ملاطفت سے گفتگو کرتے رہے اس کے علاوہ امیر معاویہ کے حلم وتواضع کی بہت سی روایتیں مشہور

ہیں۔

حضرت علیؑ سے بعض قریشیوں کو اس وجہ سے بھی عداوت تھی کہ ان کی تلوار سے کتنے متکبر قریشیوں کی گردنیں میدان جنگ میں گری تھیں۔

حضرت علیؑ سے عداوت کی بنیاد پر بعض پر لوگوں کو ابو طالب کے ایمان پر بھی شک ہے حالانکہ یہ وہ واحد ہستی ہیں جنہوں نے حضورؐ کی ہر قدم پر نصرت کی اور ان کی پرورش اور حفاظت کا بھی حق ادا کر دیا۔ شعب ابی طالب میں جناب ابو طالب نے حضورؐ کے ساتھ تین برس نظر بندی برداشت کی۔ آپ کی شاعری سے نہ صرف حضورؐ کی محبت کا ثبوت ملتا ہے بلکہ آپ کی نبوت کی پیشگی خبر بھی موجود ہے۔ دس اشعار ملاحظہ ہوں جو ہم نے مولنا مفتی جعفر حسین کی کتاب سیرت امیر المومنین کے صفحہ 81 سے نقل کئے ہیں۔

انت الامین امین اللّٰہ لاکذب

والصادق القول لا لھو ولا لعب

آپؐ الامین اور اللہ کے امین ہیں جس میں جھوٹ نہیں اور لچر اور پوچ باتوں سے پاک اور راست گفتار ہیں۔"

انت الرسولؐ اللّٰہ نعلمہ

علیک تنزل من ذی العزۃ الکتب

آپؐ وہی اللہ کے رسولؐ ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ اور آپؐ ہی پر تو رب العزت کی طرف سے قرآن نازل ہوا۔ (مناقب شہر آشوب، ج 1، ص 39)

جب قریش نے آپ سے یہ کہا کہ پیغمبر کو خاموش کیجئے ورنہ ہم سختی وتشدد کریں گے، تو آپ نے یہ اشعار کہے:

واللّٰہ لن یصلوا الیک بجمعھم

حتّٰی اوسد فی التراب دفنیا

خدا کی قسم جب تک میں زیر زمین دفن نہ کر دیا جاؤں قریش اپنے

جتھوں سمیت آپؐ کے قریب پھٹک نہیں سکتے۔

فاصدع بامرک ما علیک غضاضة

وابشر بذاک و قرمنک عیونا

بے کھٹکے اللہ کے احکام بیان کیجئے اور اس طرح خوش وخرم رہ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجئے۔

و دعوتنی و علمت انک ناصحی

ولقد دعوت و کنت ثم امینا

آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی ہے اور میں سمجھتا ہوں آپ میرے خیر خواہ ہیں اور پھر آپ امین بھی تو ہیں۔

ولقد علمت بان دین محمدؐ

من خیرادیان البریة دینا

مجھے یقین ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین دنیا کے تمام دینوں سے بہتر ہے۔'' (تاریخ ابن کثیر، ج3، ص42)

جب شعب ابوطالب میں پناہ لی تو فدائی و محافظ جناب ابوطالب نے ایک سوبیس اشعار کا ایک طویل قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:

کذبتم و بیت اللّٰہ نبزی محمدًا

ولما نطاعن دونه ونناضل

خانہ کعبہ کی قسم تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کے بارے میں دبا دیئے جائیں گے اور اُن کے سینہ سپر ہو کر نیزے اور تیر نہیں چلائیں گے۔

ونسلمه حتی نصرع حوله

ونذهل عن ابناء نا والحلائل

ہم اُس وقت تک انہیں دشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے جب تک

اُن کے سامنے مر نہ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھول نہ جائیں۔

حدبت بنفسی دونه و حمیته

و دافعت عن بالزرا والکلاکل

میں نے دل و جان سے اُن کی حفاظت کی اور اپنے دست و بازو اور سینہ کے زور سے اُن کا دفاع کیا۔

فایده ربّ العباد بنصره

واظهر دینا حقه غیر باطل

پروردگار عالم اپنی نصرت سے اُن کی دستگیری کرے اور اس دین کو جو سراسر حق اور باطل کی آمیزش سے پاک ہے غلبہ دے۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج1، ص291)

جناب ابوطالب کا یہ شعر تو بہت معروف ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه

ثمال الیتمٰی عصمة لارامل

یعنی وہ روشن چہرے والے جن کے چہرے کا واسطہ دیکر اللہ تبارک تعالیٰ سے بارش طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کی ڈھارس اور بیوؤں کا سہارا ہیں۔

سیرت امیر المومنین ہی میں صفحات 69-68 پر لکھا ہے۔

جب آنحضرتؐ کا سن بیس برس کا ہوا تو ایک دن انہوں نے ابوطالب سے ذکر کیا کہ میں خواب میں تین نورانی پیکروں کو دیکھتا ہوں کہ اُن میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہتا ہے کہ یہ ہے وہ جس کی نصرت وقت آنے پر تمہیں کرنا ہوگی، اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ ابوطالب نے مکہ کے ایک عالم سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے آنحضرت کو غور سے دیکھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ پاکیزہ رُوح کے حامل اور

پاکیزہ نبی ہیں۔ابوطالب نے اُس سے کہا کہ چپ رہئے اور اسے ظاہر نہ کیجئے۔ایسا نہ ہو کہ انہی کی قوم رشک وحسد کی بناء پر ان کی دشمن ہو جائے۔تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے اور میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔

''میرے والد عبدالمطلب مجھے بتا گئے تھے کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں بات کو پردۂ خفا میں رکھوں تا کہ دشمن اُن کے خلاف بھڑک نہ اُٹھیں۔''

''یہ واقعات و حالات ابوطالب کیلئے تصدیق نبوت کی راہیں ہموار کر چکے تھے اور آفتاب نبوت کے برافگندہ نقاب ہونے سے پہلے ان کے دل پر پرتو رسالت کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔اور وہ علم الیقین رکھتے تھے کہ یتیم عبداللہ مستقبل کے نبی ہیں۔اسی لئے ان کی خدمت،تربیت اور دیکھ بھال میں مادی مسرت سے کہیں زیادہ رُوحانی کیفیت وسرور محسوس کرتے،پروانہ وار اُن کے گردو پیش رہتے،شب و روز انہیں نظروں میں رکھتے اور اُن کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتے۔آنحضرتؐ بچپن کے حدود سے نکل کر جوان ہو چکے تھے۔ اب ابوطالب کو تربیت کے ضمن میں ان کے روزگار و معیشت کی فکر ہوئی۔قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کیا جاسکتا تھا۔اس وقت مکہ میں ایک معزز و مال دار خاتون خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ جو خرید و فروخت کیلئے اپنے کارندے دُوسرے شہروں میں بھیجا کرتی تھیں۔آپ نے آنحضرتؐ کو خدیجہ کا کاروبار سنبھالنے کا مشورہ دیا اور خود جناب خدیجہ سے جا کر کہا کہ وہ جن شرائط پر دُوسروں کو مالِ تجارت دے کر بھیجتی ہیں۔محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی بھیجیں۔خدیجہ نے اسے منظور کر لیا اور شرائط تجارت طے کرنے کے بعد مال تجارت آنحضرتؐ کے سپرد کیا۔ آپؐ کچھ عرصہ ان کا کاروبار کرتے رہے اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کی۔خدیجہ اُن کے کاروبار سے مطمئن اور اُن کی دیانت،راستبازی،خوش معاملگی سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں کسی ذریعہ سے شادی کا پیغام بھجوایا۔آپ نے اپنے چچا ابوطالب سے مشورہ کرنے کے بعد اس رشتہ کو منظور فرمایا۔ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد ابوطالب،حمزہ،عباس اور

دُوسرے بنی ہاشم واکابر قریش کے ہمراہ حضرت خدیجہ کے مکان پر آئے۔ بزم آراستہ ہوئی اور جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا جس کا عام فہم ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے، جس نے ہمیں ذریت ابراہیمؑ نسل اسمٰعیلؑ، اولادِ معد اور صلب مضر سے پیدا کیا اور ہمیں اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم کا پاسبان بنایا اور اُسے ہمارے لئے حج کا مقام اور جائے امن قرار دیا اور ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ یہ میرے بھتیجے محمدؐ ابن عبداللہ ہیں، جس کسی سے ان کا مقابلہ وموازنہ کیا جائے گا تو شرف ونجابت اور عقل وفضیلت میں ان کا پلہ بھاری رہے گا اگر چہ دولت ان کے پاس کم ہے لیکن دولت تو ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں، پلٹ جانے والی چیز اور واپس لے لی جانے والی عاریت ہے۔ خدا کی قسم! ان کا مستقبل عظمت تابناک اور ان سے ایک عظیم خبر کا ظہور ہوگا۔

اس خطبہ شریف کا ہر ہر لفظ توحید و مدح رسولؐ اور نبوت کی پیشگی اطلاع اور سابقہ تاریخ کے عرفان کی گواہی دے رہا ہے۔ کیا ایسا شخص کافر ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا شخص نبی آخرالزمان کا خطبہ نکاح پڑھے گا۔ یہ اعزاز کسی اور کو کیوں حاصل نہ ہوا۔ بلاشبہ ابو طالب جاں نثاری اور پیشگی ایمان میں سبقت لے گئے۔

جامع ترمذی شریف کے باب الفتن میں باب 106 بعنوان خلافت میں احمد بن منیع، سریح بن نعمان، حشرج بن نباتہ اور سعید بن جمہان نے حضرت سفینہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: میری امت میں خلافت (علی منہاج النبوت) تیس سال تک ہوگی۔ اس کے بعد بادشاہی ہو جائے گی۔ سعید کہتے ہیں سفینہ نے مجھ سے کہا خلافت ابوبکر وعمر وعثمان وعلی کا حساب کرو۔ ہم نے حساب کیا تو پورے تیس سال ہوئے۔ میں نے کہا بنوامیہ کا خیال ہے کہ خلافت ان میں ہے۔ سفینہ نے کہا زرقاء (بنی امیہ کی ایک عورت کا نام جوان کی اصل میں ہے) کی اولاد نے جھوٹ کہا۔ وہ لوگ تو بادشاہ ہیں بُرے

بادشاہ۔ اس باب میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کی مدت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ یہ حدیث (سفینہؓ) حسن ہے۔ مختلف لوگوں نے اس کو سعید بن جہان سے روایت کیا ہے اور ہم اس کو ابن جمہان کی روایت سے پہچانتے ہیں۔ ترجمہ جلد دوم، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل کراچی۔

اس حدیث کو متعدد محدثین نے نقل کیا ہے کہ علیؑ سے مومن کے سوا کوئی محبت نہیں رکھے گا اور منافق کے سوا کوئی بغض نہیں رکھے گا۔

فضائل حضرت علیؑ کے بارے میں سنن ابن ماجہ شریف مترجم لددو میں باب 14 میں حدیث نمبری 119 تا 126، 122 درج ذیل پیش کی جارہی ہیں۔

علی بن محمد، وکیع، ابومعاویہ، عبداللہ بن نمیر، اَعمش، عدی بن ثابت، ذر بن جیلش، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے عہد فرمایا کہ تجھ سے سوائے مومن کے کوئی محبت نہ کرے گا اور سوائے منافق کے کوئی بغض نہ رکھے گا۔

محمد بن بشار، محمد بن جعفر، شعبہ، سعد بن ابراہیم، ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے علی رضی اللہ عنہ کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو میری جگہ پر ایسا ہی ہو۔ جیسے ہارون رضی اللہ عنہ موسیٰؑ کی جگہ پر تھے۔

علی بن محمد، ابوالحسن، حماد بن سلمہ، علی بن زید بن جدعان، عدی بن ثابت، برابرؓ بن عازب فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حاضر تھے۔ آپ راہ میں ایک جگہ اترے۔ لوگوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ کیا میں مومنیں کا ان کی جانوں سے زیادہ مالک نہیں ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کیا میں ہر مومن کا اس کی جان سے زیادہ مالک نہیں ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا تو جس کا میں ولی ہوں اس کا یہ بھی ولی ہے اے اللہ جوا س سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ۔

عثمان بن ابی شیبہ، وکیع، ابن ابی لیلیٰ، حکم، عبدالرحمان، بن ابی لیلیٰ، ابولیلیٰ کہتے ہیں

وہ حضرت علیؓ کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے۔ حضرت علیؑ گرمی کے کپڑے سردیوں میں اور سردیوں کے کپڑے گرمیوں میں پہنتے۔ ہم نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے پاس آدمی بھیجا اور خیبر کے روز میری آنکھیں دکھنے آرہی تھیں۔ اپ نے میری آنکھوں میں تھوک لگایا اور فرمایا اے اللہ اس سے گرمی اور سردی کو دور فرما دے۔ تو اس روز سے گرمی اور سردی میں نے محسوس نہیں کی اور فرمایا میں ایسے آدمی کو بھیجوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور رسول اس سے محبت رکتا ہے۔ وہ بھاگنے والا نہیں ہے۔ حضرت علی کے پاس آدمی بھیجا اور انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔

محمد بن موسیٰ الواسطی، معلیٰ بن عبدالرحمٰن، ابن ابی ذئب نافع، ابن عمرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا حسنؓ و حسینؓ اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے اور ان کے والدان سے بہتر ہوں گے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ، سوید بن سعید اسماعیل بن موسیٰ، شریک ابو اسحاق، حبشیؓ بن جنادہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں اور میری جانب سے علیؑ ہی ادا کرسکتا ہے۔

محمد بن اسماعیل الرازی، عبید اللہ بن موسیٰ، علماء بن صالح منہال، عباد بن عبداللہ، حضرت علیؑ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ اس کے رسول کا بھائی ہوں، اور میں ہی صدیق اکبر ہوں اور اس خطاب کا دعویٰ میرے بعد کوئی کذاب ہی کرے گا۔ میں نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھی ہے۔

علی بن محمد، ابو معاویہ، موسیٰ بن مسلم، عبدالرحمٰن بن سابط، سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں۔ امیر معاویہؓ حج کو تشریف لائے۔ سعد ان کے پاس گئے۔ وہاں حضرت علیؑ کا کچھ بے ادبی کے ساتھ ذکر ہوا۔ جسے سن کر سعد رضی اللہ عنہ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا تم اس شخص کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہو جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا، میں جس کا ولی ہوں علیؑ بھی اس کے ولی ہیں اور فرمایا تھا تو میری جگہ پر ایسا ہی ہے جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کی جگہ پر تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

قیام حسینؑ کا پس منظر

رسولؐ اللہ کے قول کے مطابق قرآن اور اہل بیت حضورؐ کا بہترین ترکہ ہے۔ یہ وہ گرانقدر عطیہ ہے جو انہوںؐ نے امت مسلمہ کیلئے چھوڑا۔ اس حدیث میں یہ بات بھی پوشیدہ تھی کہ قرآن اور اہل بیت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ بنابراں ہمیں امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے ان قرآنی احکام کا جائزہ لینا چاہئے جو حکومت اور حاکم سے متعلق بیان ہوئے ہیں۔ قرآن پاک ہی کا ارشاد ہے کہ جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو ایسے شخص کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والا ہوگا۔ سورہ آل عمران 03/03/85

یہ دین کوئی نیا دین نہیں ہے۔ تمام انبیاء کرام کو یہی دین دیا گیا تھا۔ اسی لئے اسلام قبول کرنے کیلئے پہلی شرط ہی یہ بیان ہوتی ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ پہلے انبیاء کو بھی اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے یہی دین ملا تھا۔ اسی لئے آیت نمبر 83 میں درج ہے کہ یہ وہی دین ہے جو اس سے پہلے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو دیا گیا تھا۔ یہ وہی وحی ہے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ و دیگر انبیاء کو عطا ہوئی۔ ملاحظہ ہو۔ 02/02/213

اللہ تبارک تعالیٰ کا یہ آخری فیصلہ ہے کہ اسلام کی معرفت عطا ہونے والا نظام ہی وہ منشور ہے جسے اللہ جل جلالہٗ نے انسانیت کیلئے تجویز کر دیا ہے جو افراد، گروہ، طبقات یا قومیں اس نظام کے علاوہ زندگی یا نظام زندگی، جس میں حکومت بھی شامل ہے، کا کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیں یا کریں تو پھر ان کا یہ عمل اللہ کے میزان میں کوئی وزن نہیں رکھے گا۔

ایسے عمل سے اس گروہ کو یا اس شخص کی ذات کو فوری طور پر کوئی فائدہ تو ہو سکتا ہو لیکن نہ صرف یہ کہ ایسا گروہ مستقبل میں گھاٹے میں رہے گا بلکہ انسانیت کا اس عمل کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اسی سورہ کی آیت 81 میں درج ہے کہ خدا کا آخری نبی آ چکا ہے۔ اس نبی سے جو بھی انحراف کرے گا وہ سیدھی راہ سے منحرف ہو جائے گا۔ اس اعلان کے ذریعے قرآن ہمیں پرانی داستانیں نہیں سنا رہا نہ ہی ہمیں گذشتہ اقوام کے ناکام تجربوں، ان کی نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں سے آگاہ کر رہا ہے بلکہ بعثت نبیؐ کے بعد انسانوں کو اپنا مستقبل سنوارنے کی خبر دے رہا ہے۔ امام حسینؑ کو احساس تھا کہ اس خبر کے علاوہ یہ سب داستانیں، قصے، اقوام کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور مختلف رجحانات و عوامل کے ممکنہ نتائج کی بحث اس لئے بیان ہو رہی ہے کہ انسان اپنے حال یعنی آج کا تجزیہ کرے اور سمجھنے کی کوشش کرے کہ کہیں ہماری ہی داستان ہمیں تو نہیں سنائی جا رہی۔

اپنی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ حکومت کے معاملہ میں اسلام کا مزاج باقی مذاہب و ادیان سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حکومت اور اقتدار اعلیٰ اللہ رب العزت ہی کو سزاوار ہے۔ سورہ الاعراف 08/07/53 میں واضح اعلان ہے:

1- کہ خبردار سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔

2- فرمانروائی اللہ کے سوا کسی کیلئے نہیں۔ اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی (اطاعت) نہ کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ سورہ یوسف 12/12/40

3- اسی (اللہ) کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے۔ سورہ یٰسین 23/36/83

4- اللہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا بادشاہ ہے۔ اور اس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں۔ سورہ الفرقان 18/25/02

5- اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عظیم تریں اقتدار کا ربّ ہے۔ سورہ المومنون

18/23/116

آیئے اب ہم حکومت سے متعلق ان آیات کا جائزہ لیں جہاں انسان کو اختیارات تفویض کیئے گئے تا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کے پروگرام کو انسانی منفعت کیلیئے نافذ کیا جا سکے۔

1- اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔ یعنی حکمران بنا کر یا حکمرانوں پر نظر رکھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوئے۔ سورہ الانعام 08/06/165

2- سورہ الاعراف 08/07/69,74,100,128-130,137 اللہ نے تم کو قوم نوحؑ کے بعد جانشین (خلفاء) بنایا...... اللہ نے تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تم کو زمین پر رہنے کا ٹھکانا دیا...... اور کیا ان لوگوں کو جو زمین کے وارث ہوئے وہاں کے لوگوں کی ہلاکت کے بعد یہ بات نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے جرائم کے سبب ان کو ہلاک کر ڈالیں...... یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہے مالک بنا دے...... موسیٰ نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور ان کی جگہ تم کو زمین کی خلافت دے گا...... اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کیئے جاتے تھے اس سرزمین کے پورب پچھم کا مالک بنایا۔

3- سورہ یونس 11/10/14 میں لکھا ہے: پھر ان کے بعد ہم نے ان کی بجائے تمہیں خلیفہ (جانشین) مقرر کیا تا کہ ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔

4- سورہ یوسف 12/12/55-56 یوسفؑ نے (دعا کی کہ اے میرے اللہ) آپ ملک کے خزانے میرے تابع کر دیں (کیونکہ) میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں...... اس طرح ہم نے یوسفؑ کو ملک میں اقتدار عطا کیا جہاں چاہے رہے سہے۔

5- سورہ الانبیاء 17/21/11: اور بہت سی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔ یہی مضمون سورہ بنی اسرائیل 15/17/17 و دیگر مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں۔

6- سورہ نور 18/24/55: تم میں سے ایمان لانے اور نیک اعمال کرنے والوں سے اللہ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور اس زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسے ان لوگوں کو بنایا جو ان سے پہلے تھے۔

7- سورہ الفرقان 19/25/74: (عباد الرحمٰن) دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔اس مقام پر آپ امام حسینؑ کے جد امجد سیدنا ابراہیمؑ کی دعا پر غور کریں جسے قرآن نے سورہ البقرہ 01/02/124 میں ہماری رہنمائی کیلئے محفوظ کرلیا ہوا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمالیا اور وہ سب امتحانوں میں پورے اترے تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا۔(ابراہیمؑ نے) عرض کیا کہ اس انعام میں میری اولاد کو بھی شامل فرمادیں تو اللہ تعالیٰ نے (دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا) کہ میرا عہد (یعنی امامت کا انعام) ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

8- سورہ النمل 20/27/62 میں اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے کس کی پکار کو کون سنتا ہے اور زمین پر خلیفہ کون بناتا ہے۔

9- سورہ القصص 20/28/05,33 میں ارشاد رب ذوالجلال والاکرام ہے کہ پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں زمین میں بے حد کمزور کردیا گیا تھا اور ہم نے انہیں امام بنایا اور زمین کا وارث بنایا...... (اے موسیٰ) ہم تجھے تیرا بھائی دے کر تیرے بازو مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے۔

10- سورہ ص 23/38/26 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔تم لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

اس پس منظر میں آپ سورہ المعارج 29/70/41 سورہ ہود 12/11/59 سورہ توبہ 10/9/39 ' سورہ الانعام 08/06/133 وغیرہ آیات کو دیکھیں جہاں یہ اصول بار بار پیش کیا گیا ہے کہ وہ جس قوم کو چاہتا ہے اٹھالیتا ہے اور اس کی جگہ نئی قوم کو استحکام عطا کردیتا

ہے۔ بار امانت کی حفاظت بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روئے زمین سے مجرم و باغی وفسادی و ظالم کو حکومت واقتدار سے بے دخل کرنا قرآن پاک کا ہدف ہے تا کہ ایماندار، عبد صالح اقتدار کے وارث قرار پائیں۔

اِسی سلسلہ میں فساد فی الارض کے حوالے سے بات کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق صالح نظام کو درہم برہم کرنے کی بنیادی وجہ فساد فی الارض ہے۔ لفظ فساد دراصل صلاح کی ضد ہے اور اصلاح کا مطلب حالات کا سازگار اور متوازن رہنا ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے کئی بار ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اس زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن مفسدین کے نام سے یاد کرتا ہے جبکہ مومنین اور صدیقین کا وہ نظریاتی گروہ جو فساد کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتے ہیں قرآن کی لغت میں مصلحین کہلاتے ہیں۔ مفسدین کا گروہ کئی شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ کبھی تو الٰہی قانون کی خلاف ورزی کرنے کو فساد قرار دیا گیا ہے اور کہیں یتیم کے معاملات کی اصلاح نہ کرنے کو، کبھی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی بادشاہوں کے اس عمل کو کہ وہ جنگ کے دوران ہر شے کو تہ و بالا کر دیتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ مومن نہ تو سرکش ہوتا ہے نہ ہی فساد پھیلاتا ہے۔ سورہ القصص 20/28/83

امام حسینؑ کے قیام کے محرکات پر بات کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم امام کے مقام پر بھی غور کرلیں کہ وہ کون سے امور تھے جو امام کے منشور کا حصہ تھے۔ وہ کون سے اہداف تھے جو امام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ امام کے قیام سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ:

1- ہماری اطاعت کا مرکز اللہ تبارک تعالٰی کی ذات بابرکات اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مطہرہ ہے۔

2- مومن کو سنت رسولؐ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔

3- مومن کی زندگی میں قانون واحکامِ الٰہی کی بالادستی ہوتی ہے۔

4- اللہ کے نظام کے اندر حقوق بشری کے حصول وتحفظ کیلئے کوشاں رہو۔

5- انسان کی سیاسی، اقتصادی آزادی کا پرچم بلند رکھو۔

6- حق بات کہنے میں کوتاہی نہ برتو۔
7- عزت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔
8- عدل کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جبر واستبداد کا راج رہے گا۔
9- امانت میں خیانت انسانیت کے خلاف سازش ہے۔
10- ملوکیت اسلام کی نفی ہے۔
11- کسی طبقہ، گروہ، خاندان، قوم یا قبیلہ کو ذرائع پیداوار پر قابض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔
12- امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی تعلیمات کا اساسی جزو ہے اور اس ذمہ داری کو اس لئے نہیں چھوڑا جا سکتا کہ متعلقہ افراد نے چپ سادھ لی ہے۔ امر و نہی کا حکم سب نبیوں کو ملتا آیا ہے اور حضرت لقمانؑ نے بھی اپنے فرزند کو وصیت کرتے وقت امر و نہی کی تاکید کی تھی کیونکہ یہی وہ عنصر ہے جو اچھی اور صالح حکومت کی بنیاد بنتا ہے۔
13- اسلام کی تعبیر و تشریح کا حق صرف صاحبان علم ہی کو ہے۔ بادشاہ کو اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ قرآن وسنت کی تعبیر کرے۔
14- امور سلطنت میں عوامی مشاورت قرآن کا بنیادی اصول ہے۔
15- حق کا ساتھ دو کیونکہ ظلم اور فساد کا مقدر مٹنا ہے۔
16- دین اللہ تبارک تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے۔ دین کو قربان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے سامنے بڑی سے بڑی قربانی حتیٰ کہ اجتماعی قربانی کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔
17- دُنیا کی حکومت آنی جانی ہے کیونکہ دُنیا خود عارضی ہے لہٰذا یہاں کا اقتدار بھی عارضی ہے لہٰذا ایک عارضی اور وقتی چیز کسی مستقل قدر کا بدل نہیں ہو سکتی۔
18- موت پر فتح حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ شہادت ہے۔
19- امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی خاطر ہجرت بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ مدینہ اور مکہ تک بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔

20- مکہ اور مدینہ کی حرمت کو برقرار رکھنا ہر مومن کا فرض ہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ علی ابن ابی طالب نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالحکومت بنایا تاکہ مخدوش حالات کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی حرمت پامال نہ ہو جائے۔

21- جب حالات بگڑ جائیں اور حکومتیں منہ زور ہو جائیں تو پھر اہل علم کو اکٹھا ہو کر حالات حاضرہ کا تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ امام حسینؑ نے 58 ہجری میں بین الاقوامی کانفرنس منعقد کر کے ایک ہزار کے لگ بھگ مندوبین کو حج کے موقع پر اپنا دینی فریضہ طور اکرنے کی دعوت دی تھی۔

22- امام حسینؑ اپنے طرز عمل سے لوگوں کو امامت کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کرتے ہوئے اور بتاتے جا رہے ہیں کہ وقت کے امام کی حیثیت میں شریعت ان پر جو فرائض عائد کر رہی ہے وہ نہ صرف بیان ہو رہے ہیں بلکہ ان پر عمل بھی کیا جا رہا ہے۔

23- امام واضح کر رہے ہیں کہ بیت المال پر لوگوں کا حق ہے۔بیت المال کو ہیئت حاکمہ اپنے ذاتی یا سیاسی تصرف میں نہیں لا سکتی۔حق حقدار تک، امانت حقدار تک پہنچانا قرآنی فریضہ ہے جس کی اہمیت نماز روزہ سے کم نہیں ہے۔

24- جب سڑکوں اور گلیوں میں بھکاریوں کی بہتات ہو جائے اور ریاست ایسے محرومین کی پرورش کرنے میں کوتاہی کرنا شروع کر دے تو اہل الرائے کیلئے خاموش بیٹھنا عار ہے۔لوگوں کو مختلف قسم کے ظلم سے نجات دلانا بہترین جہاد ہے۔

25- امام کے قیام کا یہ سبق تھا کہ توقع بہترین نتائج کی رکھو، اہداف واضح ہونا چاہئیں۔اپنی طرف سے کوشش میں کمی نہیں آنی چاہیے لیکن بدترین حالات کیلئے تیار بھی رہنا چاہیے۔

26- امام کا پیغام یہ تھا کہ

”امام اور پیشوا وہی ہو سکتا ہے جو خود دین کا پابند ہو، عدالت اور انصاف قائم کرنے اور خدا کی رضا کے مقابل اپنے نفس کی پیروی نہ

کرے۔"

27- اسلام کے نام پر حکومت حاصل کرنے والے جبر سے اجتناب کرتے ہیں۔

امام کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اے حاکمو ظلم، جبر، استیصال، قتل، خونریزی، حقوق کی پامالی کو کب تک چھپا سکو گے۔ حق نے ظاہر ہونا ہے اور ظاہر ہو کر رہے گا اور اس دُنیا میں اللہ کی مخلوق ہی کے ذریعہ حق ظاہر ہوگا۔ امام مقتدر طبقات کو بزبان اقبال پیغام دے رہے تھے۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئین مسلمان دیگر است

یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ امام حسینؑ نے اپنے ناناؐ کے دین سے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ دُنیا کو ہر قسم کی غلامی سے نجات کا پیغام سیرت رسولؐ ہی سے ملا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالت یہ ہوگئی تھی کہ احادیث کی روایت کو روک دیا گیا تھا۔ ابوذر جیسے صحابی کو مدینہ سے شام، شام سے مدینہ اور مدینہ سے ربذہ جیسے مقامات تک بدر کیا جارہا تھا۔ بے شمار اصحاب کو مدینہ چھوڑنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ میثم تمار، رشید ہجری کی شہادت اور موت نے مسلمانوں کی تاریخ کا رخ موڑ دیا تھا۔ ایک طرف انحراف کا یہ چلن تھا لیکن امام مدینہ سے نکلتے وقت اپنے بھائی حنفیہ کے نام ہجرت کا عنوان اس طرح لکھ رہے ہیں:

اسیر بسیرت جدی وابی

یعنی اے بھائی میں اپنے نانا حضورؐ اور اپنے والد کی سیرت پر اپنے مشن کو استوار کروں گا۔ ان کی سیرت کو زندہ کروں گا۔

امام حسینؑ کے قیام کے پس منظر میں کربلا تک کے سفر کے بعض واقعات پر غور ضروری معلوم ہوتا ہے۔ امام حسینؑ کا رُخ کوفہ کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کو کوفہ جانے سے روکنا حکومتی مشینری کی مجبوری تھی کیونکہ مسلم والا واقعہ کوفہ میں پیش آچکا تھا جبکہ سینکڑوں لوگوں نے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر نئے گورنر کے آنے پر حالات کے رُخ بدل چکے تھے۔ حکومتی کارندوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ کوفہ کے متعدد اکابرین نے امام حسینؑ کو

دعوت نامے بھی بھیجے ہیں اور حکومتی سراغرساں ایجنسیوں نے یہ معلومات بھی فراہم کی ہوں گی کہ عام آدمی دلی طور پر امام سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس لئے امام کو کوفہ پہنچنے سے پہلے روکنا یزیدی انتظامیہ کی مجبوری تھی۔ اس کام کو سرانجام دینے کیلئے گورنر کوفہ نے حر کو ایک لشکر کا سربراہ بنا کر امام کے قافلہ کے ساتھ لگا دیا تھا۔ ذی حسم کے مقام پر حر کی ممانعت پر امام نے ایک خطبہ دیا جسے طبری نے نقل کیا ہے۔ اس کا عام فہم ترجمہ پڑھنے کے قابل ہے۔ پہلے امام کا خطبہ پھر ظہیر ابن القین، نافع بن ہلالی اور بریر ابن خضیر کی طرف سے تجدید بیعت کا ذکر ہے پھر حر کی جانب سے دھمکی آتی ہے اور اس کے جواب میں امام کا خطبہ ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے خداوند کریم کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا یہ مصیبت جو ہم پر نازل ہوئی ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو اور امور دُنیا پر پراگندگی اور تغیر واقع ہو چکا ہے۔ دُنیا کا مکروہ چہرہ سامنے آچکا ہے۔ نیکی دُنیا سے محروم ہو رہی ہے اور دُنیا اپنی اسی روش پر جاری و ساری ہے۔ اس پر آشوب ماحول میں کچھ نہیں بچا مگر سوائے چند چیزوں کے اور وہ چند چیزیں بھی پانی کے ان چند قطرات کی مانند ہیں جو برتن کی تہہ میں بچ گئے ہوں یا ایک تباہ حال کھیتی کی مانند ہیں کہ جس میں چند تنکے بچ جاتے ہیں۔ اے بندگان خدا! کیا تم اس چیز کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل کی مخالفت نہیں کی جا رہی، ذلالت اور گمراہی کے اس ماحول میں ضروری ہے کہ ایسے حق گو انسان کا ہونا جو حق کا طلبگار اور خدا سے ملاقات کا متمنی ہو۔ میں اس مرحلے پر عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہوں۔ میرے لئے یزید جیسے فاسق انسان کے ساتھ زندگی گزارنے سے موت کی آغوش ہزار درجہ اچھا ہے۔ (لہوف، ص 69، نفس المہموم، ص 166، بحار الانوار، ص 116 تا 117، کشف الغمہ، ص 185)

کتاب تحف العقول میں مذکور ہے کہ امام ذیشان نے اس خطبے کے اختتام پر یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

اِنَّ النَّاسَ عَبِيْدُ الدُّنيا، وَالدِّيْنُ لَعِقٌ عَلى اَلْسِنَتِهِمْ، يَحُوْطُوْنَهُ مَا دَرَّتْ مَعائِشُهُمْ، فَاِذا مُحِّصُوا بِالْبَلاءِ قَلَّ الدَّيَّانُونَ۔

فرماتے ہیں لوگ دُنیا کے پرستار ہیں اور ان کا دین اس طرح ہے جیسے منہ میں پانی ہوتا ہے۔ پس جب تک ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے دین دار رہتے ہیں لیکن جونہی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کا دین برائے نام رہ جاتا ہے۔ (تحف العقول، ص245 ومقتل خوارزمی، ص238)

اس کے بعد ظہیر ابن القین، نافع بن ہلال اور بریر ابن خضیر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور امامؑ کے دست مبارک پر کی گئی بیعت کا اعادہ اور تجدید کرنے لگے۔ حر بن یزید ریاحی جو کہ امام کا ہم سفر تھا کہنے لگا میں آپ سے متعلق خدا کو یاد کرتا ہوں یعنی آپ جنگ کریں گے تو قتل کئے جائیں گے۔ یہ سنتے ہی آپؑ نے حر کے جواب میں فرمایا:

سَأَمضی وما بِالْمَوْتِ عارعَلَی الْفَتٰی
إذا مانویٰ حَقّاً وَجاهَدَ مُسْلِمَا
وَواسَی الرِّجالَ الصَّالِحینَ بِنَفْسِهِ
وَفارَق مَثْبُوراً و خالَف مُجْرِما
فَإنْ عِشْتُ لَمْ أَنْدَمْ وَإنْ مِتُّ لَمْ أُلَمْ
کَفٰی بِکَ ذُلّاً أَنْ تَعیشَ وَتُرْغَما

اے حر! کیا تو مجھے موت سے ہراساں کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کردو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری مشکلات حل ہو جائیں گی؟ میں بھی یہی کہوں گا جو ہمارے اوسی بھائی نے اپنے چچا زاد سے کہا تھا۔ جب وہ رسول اکرمؐ کی مدد کرنا چاہتا تھا اور اس کے چچا کے بیٹے نے اس کو موت سے ڈرایا تھا اور یہ کہا تھا تو کہاں جاتا ہے کیونکہ اس راہ کی انتہا موت ہے تو اس نے چچا زاد کے جواب میں کہا:

1- میں ہر صورت میں جاؤں گا کیونکہ نوجوان کیلئے موت کوئی عیب نہیں اگر انسان کا عمل خدا کیلئے ہو اور اس کی تسلیم و رضا کیلئے جہاد کرے۔

2- اپنے جان و مال کی قربانی دے۔ نیک لوگوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرے اور بُرے لوگوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ بُرائی اور غیر اسلامی کاموں کے خلاف برسر پیکار رہے۔

3- بس اگر میں زندہ رہوں تو مجھے پشیمانی (شرمندگی) نہیں اور اگر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں تو لوگ مجھے قابل مذمت اور مورد ملامت نہیں ٹھہرائیں گے۔ تیرے لئے یہی ذلت کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور مورد ظلم قرار پائے اور اپنے حق کا دفاع نہ کر سکے۔

(ارشاد مفید، ص 243 اور اعلام الوریٰ ص 230 اور نفس المہموم، ص 116)

کہا جاتا ہے کہ یہ قیمتی کلمات اہل بیتؑ سے موسوم کئے گئے ہیں اور جواب امامؑ عالی مقام نے حر کو دیا تھا وہ یہ ہے۔

حضرت امامؑ فرماتے ہیں۔ میں ان افراد میں سے نہیں ہوں جو موت سے ڈرتے ہیں۔ حق کی راہ میں مرنا کتنا آسان اور آرام دہ ہے اور عزت کی موت حقیقی زندگی ہے اور ذلت کی زندگی بدترین موت کا پیش خیمہ ہے۔ کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو۔ تیرا تیر غلط جگہ لگا۔ تیرا خیال غلط ثابت ہوا۔ میں موت سے ڈرنے والا نہیں ہو۔ میرا نفس اور میری ہمت اس سے بزرگ تر ہے کہ میں موت کے ڈر سے ظلم و ستم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاؤں۔ کیا تم میرے قتل کے علاوہ کبھی اور کام کی بھی طاقت رکھتے ہو؟ آفرین ہے اس پر جو راہ خدا میں مارا جائے۔ تم مجھے قتل تو کر سکتے ہو مگر میری عزت و شرف اور مجد و بزرگی کو ختم نہیں کر سکتے پس اس حقیقت کے پیش نظر مجھے موت کی کوئی پرواہ نہیں۔ (توفیق ابو علم در کتاب اہل بیت، ص 448 مطبع سعادت، مصر)

سید الشہداءؑ ہی وہ شخصیت ہے جنہوں نے فرمایا۔

مَوْتٌ فِي عِزٍّ خَيْرٌ مِنْ حَيَاةٍ فِي ذُلٍّ

ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔

اور امام ہی ایسی شخصیت ہیں جو موت کو کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ اشعار ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلْمَوْتُ خَيْرٌ مِنْ رُكُوبِ الْعارِ
وَالْعارُ أَوْلٰى مِنْ دُخُولِ النَّارِ

ذلت کے روش پر سوار ہونے سے موت کی آغوش میں سو جانا بہتر ہے۔ اور عار و ذلت انسان کیلئے جہنم میں جانے سے بہتر ہے۔ (نفس المہموم، ص 219 و بحار الانوار، جلد 78، ص 128، از طبع حروفی)

حر اور اپنے اصحاب کیلئے حضرتؑ کا خطبہ

اور تاریخ طبری میں نقل ہے کہ ابو مخنف نے اقبہ ابی العیز ار سے روایت کی ہے کہ امام نے اپنے اور حر کی ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے مقام بیضہ میں یوں فرمایا:

اے لوگو بے شک رسولؐ خدا نے فرمایا کہ جو شخص کسی ایسے بادشاہ کو دیکھے جو ظالم ہو۔ خدا کے حلال کو حرام کرنے والا ہو۔ خدا کے عہد کو توڑنے والا ہو۔ رسولؐ خدا کی سنت کی مخالفت کرنے والا ہو۔ لوگوں میں گناہ اور زیادتی کا مرتکب ہو۔ اپنے قول یا فعل سے اس کی سرزنش نہ کرے تو خدا پر یہ حق ہے کہ اس شخص کو بھی اسی جگہ داخل کرے جہاں پر اس جابر بادشاہ کو داخل کرے گا۔

خبردار اے لوگو! جان لو! کہ بنی امیہ کے ظالم حکام نے ہمیشہ شیطان کی پیروی کی ہے اور خدائے رحمٰن کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔ فساد کو ظاہر کر دیا ہے۔ خدا کی حدود کو چھوڑ دیا ہے۔ مال غنیمت اور مال فیئ کو کہ جس کا تعلق تمام مسلمانوں کے ساتھ ہے اس کو انہوں نے اپنے لئے مختص کر دیا ہے۔ خدا کے حرام کو حلال کر دیا ہے اور خدا کے حلال کو حرام کر دیا ہے اور غیروں سے زیادہ میں حقدار ہوں (کہ ان امور سے روکوں اور مسلمانوں کی

اصلاح کروں)

میرے پاس تمہارے خط آئے تمہارے قاصد آئے جس میں تم لوگوں نے اپنی بیعت کا اظہار کیا اور مجھ سے یہ کہا ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے اور تمہیں رسوا نہیں کریں گے۔ اگر تم ابھی تک اسی بیعت پر باقی ہو تو حق یہی ہے۔

میں حسینؑ ابن علیؑ اور فاطمہؑ بنت رسول اللہ کا جگر ہوں میری جان آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ میرے اہل و عیال آپ لوگوں کے اہل و عیال کے ساتھ ہیں (یعنی میں اپنے لئے کسی خصوصی مراعت کا قائل نہیں ہوں) لیکن تم لوگوں کیلئے میری ذات میں اسوہ موجود ہے (مجھے اپنا امام سمجھو اور میری اطاعت کرو) اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے کئے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور میری بیعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو مجھے میری جان کی قسم آپ نے کوئی نئ بات نہیں کی بلکہ تم یہی کچھ میرے باپ بھائی اور میرے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کے ساتھ کر چکے ہو۔ پس وہ شخص دھوکہ کھانے والا ہے جو تمہارے جال میں پھنس جائے۔ تم لوگوں نے اپنے حصے سے منہ پھیر لیا ہے اور اپنے نصیب کو ضائع کر دیا ہے پس جس شخص نے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا تو وہ خود ہی اس کی سزا بھگتے گا اور خداوند جلد ہی مجھے تم لوگوں سے بے نیاز کر دے گا۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ (نفس المہموم، ص 115، طبری در تاریخ، ج 4، ص 304)

جب حضرت امام حسینؑ کربلا پہنچے تو امام نے کاغذ اور قلم دوات مانگی اور کوفہ کے بزرگوں اور ان لوگوں کو، جن کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ حق پر آ جائیں گے، خط لکھا۔ خط کے آخر میں اپنی مہر شریف لگائی اور خط کو بند کر کے قیس بن مسہر صیداوی کو دیا کہ یہ خط کوفہ میں پہنچا دے۔

اس مقام پر ہم امام کے شب عاشورہ کو اور یوم عاشور کے خطبات کا حوالہ دینا چاہیں

گے تا کہ قیام حسین کے پس منظر کے سلسلہ میں امام کا وہ موقف بھی قارئین کرام کے سامنے آ جائے جو انہوں نے افواجِ یزید کے سامنے پیش کیا تھا۔

شب عاشورا حضرت کا خطبہ

حضرت امام حسینؑ نے نویں کے دن غروب آفتاب کے وقت اپنے اصحاب باوفا کو اپنے گرد اکٹھا کیا۔ حضرت امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں۔ میں نزدیک ہوا تا کہ میں سنوں کہ امام کیا فرماتے ہیں حالانکہ میں بیمار تھا۔ امام اپنے صحابہ کرام سے فرمار ہے ہیں۔

میں خداوند عالم کی حمد وثنا کرتا ہوں بہترین حمد، اضطراب و بے چینی اور خوشی و مسرت دونوں حالتوں میں۔

اے پروردگار! میں حمد و تیری حمد وثنا کرتا ہوں کہ تو نے ہمیں پیغمبر اسلامؐ کے عہد نبوۃ کے صدقہ عزت وشرف عطا کیا اور ہمیں قرآن کی تعلیم دی اور دین میں ہمیں فقیہہ اور بے پناہ علم کا مالک بنایا۔ اس کے بعد میں یہ کہوں گا کہ میں نے اپنے صحابہ سے بہتر کوئی باوفا نہیں صحابی دیکھا اور اپنے اہل بیت سے بہتر نیک اور صلہ رحم کرنے والا نہیں دیکھا۔ اے میرے اصحاب و اہل بیت خداوند عالم تمہیں میری طرف سے بہترین جزا عنایت فرمائے تمہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ میں نے تمہیں جانے کی اجازت دے دی ہے تم سب چلے جاؤ میں تم سے اپنی بیعت ختم کرتا ہوں۔ میری طرف سے اب تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں۔ ابھی رات ہونے کو ہے اور اس کی سیاہی تمہارے لئے فائدہ مند ہے اب تم اپنے گھروں کی راہ لو۔

(ارشاد مفید، ص250، نفس المہموم 137)

آپ کے بھائی، بیٹے، بھتیجے اور جناب زینبؑ کے بیٹے مسلم ابن عوسجہ، زہیر ابن قین اور ان کے علاوہ دیگر اصحاب باری باری کھڑے ہوئے اور ہر ایک نے معذرت آمیز لہجے میں کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر زندہ رہیں بلکہ ہمارے دل میں یہ تڑپ ہے یہ آرزو اور خواہش ہے کہ ہم بار بار جئیں اور آپ کی

راہ میں قتل ہوں۔

روزِ عاشورا امام حسین نے اس طرح دُعا فرمائی۔ عاشور کی صبح کے وقت لشکر جب امام حسین کی طرف بڑھا تو آپ نے ہاتھ بلند کر کے یوں فرمایا:

اے خدا! تو ہی میرے ہر دکھ درد میں میرا بھروسہ ہے اور ہر مشکل وقت میں تو میری اُمید ہے اور ہر مصیبت و بلا کے نازل ہونے پر تو میرا بھروسہ تجھ پر ہے۔

کتنے ایسے مصائب ہیں کہ جس میں دل ضعیف ہو جاتے ہیں اور حیلہ وصحت اس میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت دوست انسان کو چھوڑ جاتے ہیں اور دشمن خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان تمام مصائب کو تمہارے سامنے لایا ہوں اور تجھ ہی سے ان کی شکایت کرتا ہوں اس امید کے سبب جو مجھے تجھ سے ہے اور کسی اور سے نہیں اے خدا تو نے ان کو مجھ سے دور کیا۔ میرے راستے کو کھول دیا اور تو نے میری کفالت کی۔

اے خدا! تو ہر نعمت کا پیدا کرنے والا اور نیکی و بھلائی عطا کرنے والا اور ہر امید کی انتہا تو ہے۔ (ارشاد مفید،ص 253، نفس المہموم ص 144، طبری در تاریخ، ج ۴،ص 321)

صبح عاشورہ حضرتؑ کا خطبہ

آپؑ نے اپنے گھوڑے کو منگوایا اور اس پر سوار ہو کر بلند آواز سے کہ جسے سب سن سکتے تھے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

اے لوگو! میری گفتگو کو غور سے سنو اور جلدی نہ کرو یہاں تک کہ جو آپ لوگوں کو مجھ پر واعظ و نصیحت کرنے کا حق ہے میں اسے ادا کرلوں اور تمہیں نصیحت کرلوں اور مدینے سے یہاں آنے کی وجہ بھی بتا دوں۔ پس اگر تم لوگوں نے میرے عذر کو قبول کرلیا تو تم سعادت اور نیک بختی کو حاصل کرلو گے اور جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم نے میرے عذر کو قبول نہ کیا

اور میری دلیل کو کافی نہ سمجھا تو تم اپنے تمام دوستوں سے مشورہ کرلو تا کہ آپ لوگوں کا کام کسی پر پوشیدہ نہ رہے۔اس کے بعد تم مجھ پر بے شک حملہ آور ہو اور پھر کسی چیز کی انتظار نہ کرو بے شک میرا ولی اللہ ہے جس نے قرآن کریم کو نازل کیا۔ بے شک وہی نیک لوگوں کا ولی ہے۔ (نفس المھوم از، ص144 تا ص146، مقتل، ج1، ص253، طبری ج4، ص242)

اس کے بعد آپ نے خداوند کریم کی حمد وثنا بجالائی اور پیغمبر گرامی پر درود وسلام بھیجنے کے بعد ایسا فصیح وبلیغ خطبہ فرمایا کہ اس سے پہلے ایسا خطبہ سنا گیا نہ سنا جائے گا۔

آپؑ نے فرمایا

پہلے میرے حسب ونسب کو جانو کہ میں کون ہوں، اس کے بعد آپ غور وفکر کرو اور پھر یہ سوچو کہ کیا میرا قتل کرنا تمہارے لئے مناسب ہے اور کیا میری حرمت کو پامال کرنا تمہارے لئے جائز ہے؟ کیا میں دختر رسولؐ خدا کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا میں وصیؑ پیغمبرؐ کا فرزند نہیں ہوں؟ کہ جو سب سے پہلا مومن اور رسول خدا اور جو کچھ خدا کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا تھا اس سب کی تصدیق کرنے والا تھا۔ کیا حضرت حمزہؑ سید الشہداء میرے باپ کے چچا نہیں؟ کیا حضرت جعفرؑ جو جنت میں دو پروں کے ساتھ محو پرواز ہیں میرے چچا نہیں؟ کیا تم نے رسولؐ خدا کی وہ حدیث جو میرے اور میرے بھائی کے بارے میں ہے نہیں سنی۔

هذان سيد شباب اهل الجنته

یہ دونوں نوجوانان جنت کے سردار ہیں۔

پس اگر تم میری ان باتوں کی تصدیق کرتے ہو اور جانو میں سچ کہہ رہا ہوں اور خدا کی قسم میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کیونکہ خداوند متعال جھوٹے پر غضبناک ہوتا ہے۔ (لہٰذا تم میرے قتل سے باز آجاؤ) اور اگر تم میری باتوں کو جھٹلاتے ہو۔تو کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو جابر بن عبداللہ انصاری۔ابوسعید خودری اور سہل بن سعد ساعدی اور زید بن ارقم، انس بن

مالک سے سوال کر لے کہ وہ آپ کو بتائیں کہ رسولؐ نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق ایسے فرمایا ہے۔ شاید یہ چیز تمہیں میرا خون بہانے سے باز رکھے۔

شمر نے کہا! جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسے فقط وہی سمجھ سکتا ہے کہ جس نے خدا کی یک طرفہ عبادت کی ہو۔

حبیب ابن مظاہر نے شمر کو جواب دیا۔

خدا کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستر (۷۰) طرف (شک وشبہ) سے کرتا ہے۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے۔)

حضرت سید الشہداؑ نے فرمایا:

اگر تمہیں اس بات میں شک ہے تو پھر کیا اس بات میں بھی شک ہے کہ میں دختر پیغمبرؐ کا بیٹا ہوں؟

خدا کی قسم پورے عالم میں مشرق سے لیکر مغرب تک تم میں سے اور نہ کسی اور میں سے میرے سوا پیغمبر اسلامؐ کی بیٹی کا بیٹا ہو۔ افسوس ہے تم پر کیا میں نے تمہارا کوئی قتل کیا ہے؟ جس کا قصاص لینے آج تم یہاں جمع ہوئے ہو۔ یا کیا میں نے تمہارے کسی مال و دولت پر قبضہ کر لیا ہے؟ یا میں نے تمہیں مجروح کیا ہے کہ جس کی تلافی کیلئے تم آئے ہو۔

تو ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ حضرت امام حسینؑ نے صدا دی۔

"اے شبث بن ربعی، اے حجاز بن ابجز، اے قیس بن اشعث اور اے یزید بن حارث کیا تم لوگوں نے اپنے خطوط میں مجھے یہ نہیں لکھا تھا کہ درختوں کے ساتھ میوے پک چکے ہیں اور زمین ہر طرف سرسبز ہو چکی ہے اگر آپ ہماری طرف آئیں تو ہم آپ کے تحت فرمان آپ کی مدد کیلئے ایک لشکر دیں گے۔ کیا آپ ہمارے ہاں آئیں گے؟

قیس بن اشعث نے کہا۔

جو کچھ تو کہہ رہا ہے اسے ہم نہیں سمجھتے مگر آپ کے چچا کے بیٹے (یزید) نے جو کچھ کہا ہے (وہی جانتے ہے) جو چیز تم چاہو گے وہ آپ کو دی جائے گی۔

حضرت امام حسینؑ نے اس حال میں فرمایا۔

نہیں اللہ کی قسم نہیں ایسا ممکن نہیں کہ میں بیعت کر کے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرتے ہوئے تمہاری اتباع کروں اور ظلم کا بوجھ اُٹھانے والوں کی طرف ظلم کے اس بوجھ کو اپنے دوش پر لوں۔

اس کے بعد فرمایا۔

اے بندگان خدا! میں اپنے اور تمہارے بارے میں اپنے ربّ سے اور تمہارے ربّ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔ نیز میں ہر متکبر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(لہوف میں ص 85 تا 88 تک آیا ہے۔ نفس المہموم، ص 149 اور ص 150۔ ملحقات احقاق الحق، ج 11، ص 644 اور ص 426)

جناب ابن طاؤس نے حضرت سید الشہداء سے روز عاشورہ درج ذیل خطبہ غرا کے ضمن میں روایت کی ہے کہ اور جب عمر بن سعد اور اس کے دیگر ساتھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر آمادہ پیکار ہوئے تو حضرت امام حسینؑ نے بریر بن خضیر سے لشکر اعداء کی طرف واعظ و نصیحت کیلئے بھیجا بریر نے جتنی بھی نصیحتیں کیں ان کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اس کے بعد خود امام عالی مقامؑ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر اعداء کی طرف گئے اور انہیں خاموش ہونے کو کہا۔

اس کے بعد حمد وثنا کی اور ختمی مرتبت اور فرشتگان او انبیاء پر درود و سلام کے بعد فرمایا:

اے ہلاک ہونے والی اور نقصان اُٹھانے والی جماعت! خدا تمہیں فقر و فاقہ میں مبتلا رکھے۔ اس لئے کہ تم نے ہمیں بلایا جب ہم آئے تو تمہارے دل تو تمہارے ساتھ تھے مگر تمہاری تلواریں بنی امیہ کیلئے بلند ہوئیں۔ وہ تلوار جو ہم نے تمہارے ہاتھ میں دی تھی۔ اسی کو تم ہماری گردنوں

پر چلانے کیلئے تان کھڑے ہوئے اور وہ آگ جس کو ہم نے اپنے اور تمہارے دشمنوں کیلئے جلائی تھی۔اسی آگ کو تم نے ہم پر پھینکا اور تمہاری بے وفائی کا یہ عالم ہے کہ تم اپنے دوستوں کے قتل کیلئے اپنے دشمنوں سے الحاق کر چکے ہیں۔ باوجودیکہ ان دشمنوں نے تمہارے درمیان عدل کو نافذ نہ کیا۔ جب تم مظلوم تھے تمہاری حمایت نہ کی اور اب بھی تم ان سے خیر کی امید نہیں رکھتے۔اس سبب سے ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی تمہیں نصیب ہوئی کیونکہ جب تک تلواریں نیام میں تھیں تمہارے بدن کو آرام تھا اور ہمارے قتل پر اتفاق رائے نہ ہوا تھا۔ ہمیں کیوں نہ چھوڑ دیا تاکہ ہم اپنے اور اپنے اہل بیت کی پاسبانی کر سکتے بلکہ تم ایک سیل رواں کی طرف آگے بڑھتے رہے اور ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ خدا تمہیں برباد کرے اور ہلاک کرے کیونکہ تم نے اللہ کے گروہ کو چھوڑ دیا۔ کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا۔ اور تم نے آیات الٰہی کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اے شیطان کا لقمہ حرص بننے والو کیا تم یہ سب کچھ ماننے کے بعد اس بے دین گروہ کی حمایت پر آمادہ ہو اور ہمیں تنہا چھوڑنے کا عزم کئے ہوئے ہو۔

خدا کی قسم تمہاری یہ بے وفائی مکر و فریب اور دھوکہ دہی پرانی عادت ہے۔ تم ایک ایسے درخت کی مانند ہو جس کا پھل مالک کی بجائے دشمن کا لقمہ بنتا ہو۔

آگاہ رہو۔ یہ حرام زادہ ابن زیاد اس نے ہمیں دو چیزوں کے درمیان لا کھڑا کیا ہے۔ یا بیعت یا شہادت جہاں تک جنگ کا تعلق ہے۔ وہ تو دفع کی حد تک ممکن ہے البتہ بیعت کی ذلت میں کسی بھی صورت میں قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ خدا، اس کا رسولؑ، اور مومنین اور وہ مقدس آغوش جس میں ہم نے پرورش پائی یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ ذلت ہمیں دامن گیر ہو۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم ایک بدکردار شخص کی بیعت کریں

اور نیک لوگوں کے قتل کی راہیں ہموار کریں۔ میں واضح کئے دیتا ہوں کہ میں اپنی اس قلیل جماعت کے ساتھ تمہارے مقابلے میں آمادہ جنگ ہوں اور اس گفتگو کے ساتھ ساتھ امامؑ نے فروت ابن مسیک مرادی کے اشعار پڑھے۔

1- اگر ہم دشمن پر غلبہ پالیں اس کو ذلیل کر دیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی کیونکہ یہ ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

اور فرض کیجئے کہ ظاہراً اگر ہم کہیں مغلوب ہو بھی جائیں تو وہ غلبہ حقیقی غلبہ ہوگا کہ ہم اصلاح کیلئے مارے گئے اور یہ ظاہری شکست حقیقتاً فتح ہے۔

2- ہماری بیعت موت سے ڈرنے والی نہیں ہے اور ہم جنگ میں اس لئے نہیں آئے کہ ہم اپنی جان بچائیں بلکہ اس لئے آتشِ جنگ کو سینکنے پر آمادہ ہوئے ہیں کہ دشمن کے نجس وجود کو اپنے سے دور رکھیں۔ چونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جب تک زندہ رہوں وہ ہمیں اپنی اتباع پر مجبور کر سکے اگر چہ اس کی حکومت ہماری موت کے در پے ہے۔

3- موت کسی گروہ پر سے اپنا ہاتھ اٹھالے تو کسی اور گروہ پر رکھ لیتی ہے۔ اور موت سے فرار ممکن نہیں۔

4- کسی موت نے ہم سے ہمارے اشراف اور بزرگان کو ہم سے چھین لیا جیسا کہ اس سے پہلے والی امتوں کے ساتھ کیا۔

5- بادشاہ اور مقتدر علماء اس دُنیا میں باقی رہتے لیکن اس دُنیا میں ابدی زندگی ممکن نہیں۔

6- ہماری مخالفت کرنے والوں سے کہہ دو کہ خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور ہوش کے ناخن لو کیونکہ تمہارا انجام بھی موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر مرنا ہی ہے تو ہماری حمایت کرتے ہوئے مرو۔ (یہ خطبہ کتاب ''لہوف'' میں ص 85 تا ص 88 تک ذکر کیا گیا ہے اور نفس المہموم میں ص 149 اور ص 150 میں ذکر کیا گیا ہے)

ان اشعار کے بعد امامؑ نے اپنے خطبے کو جاری رکھا اس کے بعد فرمایا۔

اللہ کی قسم میری شہادت کے بعد جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے نہ پا

سکو گے اور زیادہ دیر آرام وسکون نہ پاؤ گے کہ اچانک حوادثات زمانہ چکی کے پاٹ کی طرح تمہارے آس پاس گھومیں گے اور پھر اچانک جب تم محور کی زد میں آؤ گے تو اس کی حرکت تمہیں بے چین، مضطرب اور ہمیشہ کیلئے پریشان کر دے گی۔ یہ وہ عہد ہے کہ جو میرے پدر بزرگوار نے میرے جد نامدار کی طرف سے میرے ساتھ کیا۔ تم لوگ اپنی اور اپنے ہم خیال لوگوں کی آراء کو یکجا کرو اور غور وخوض کرو تا کہ تمہارا معاملہ تم پر واضح ہو جائے اور تم اپنے اس کردار کے سبب سے بعد میں پشیمان ہونے اور کف افسوس ملنے سے بچ جاؤ۔ تم صدق وصفاء سے اپنے آپ پر نظر ثانی کرو اگر تم ہدایت پالو تو ٹھیک وگرنہ مجھ پر حملہ کر دو اور جتنا جلدی ممکن ہو مجھے اپنے راستے سے ہٹا دو۔ میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ وہ خدا جو میرا اور تمہارا ربّ ہے وہ خدا جس کی قدرت ہر چیز میں کارفرما ہے۔ کوئی پتا اس وقت حرکت نہیں کرتا جب تک اللہ کا امر نہ ہو اور یہ حقیقت ہے تقرب الٰہی صراط مستقیم کے سبب سے ممکن ہے۔ اے پروردگار اپنی ابر رحمت کے قطرات اس قوم سے روک لے اور انہیں بھوک و پیاس کی مصیبت میں مبتلا کر جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قحط پڑا تھا اور ایک ثقفی نوجوان کو ان پر مسلط فرما، تا کہ وہ انہیں زہر کے تلخ جام پلائے کیونکہ انہوں نے ہمیں جھٹلایا اور غلط باتوں کو ہماری طرف منسوب کیا اور ہمیں ذلیل ورسوا کیا اے خدا! تو ہی ہمارا پروردگار ہے اور ہم تجھ پر ہی توکل رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور ہر چیز تیری ہی طرف لوٹ کر جائے گی۔

حقیقی معیار

حاکم اور حکومت کے متعلق قرآنِ پاک کا موقف جاننے کے بعد ہم امام حسینؑ کے

قیام کے متعلق بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن ہی بہترین حکم اور بلا بدل قاضی ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ آل عمران 03/03/83: کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے تو ایسے شخص کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والا ہوگا۔

1- سورہ الانعام 08/06/165: اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔ یعنی حکمران بنا کر یا حکمرانوں پر نظر رکھنے کی اہلیت وصلاحیت دے کر۔

2- سورہ الاعراف 08/07/69,74,100,128,137 اللہ نے تم کو قوم نوحؑ کے بعد جانشین (خلفاء) بنایا...... اللہ نے تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تم کو زمین پر رہنے کا ٹھکانا دیا...... اور کیا ان لوگوں کو جو زمین کے وارث ہوئے وہاں کے لوگوں کی ہلاکت کے بعد یہ بات نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے جرائم کے سبب ان کو ہلاک کر ڈالیں...... یہ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہے مالک بنا دے...... موسیٰ نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور ان کی جگہ تم کو زمین کی خلافت دے گا...... اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس سرزمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا۔

3- سورہ یونس 11/10/14 میں لکھا ہے: پھر ان کے بعد ہم نے ان کی بجائے تمہیں خلیفہ (جانشین) مقرر کیا تا کہ ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔

4- سورہ یوسف 12/12/55-56 یوسف نے دُعا کی (کہ اے میرے اللہ) آپ ملک کے خزانے میرے تابع کر دیں (کیونکہ) میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کو ملک میں اقتدار عطا کیا جہاں چاہے رہے سہے۔

5- سورہ الانبیاء 17/21/11: اور بہت سی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔ یہی مضمون سورہ بنی اسرائیل 15/17/17 و دیگر مقامات پر دہرایا گیا ہے: ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں۔

6- سورہ نور 18/24/55: تم میں سے ایمان لانے اور نیک اعمال کرنے والوں سے

اللہ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور اس زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسے ان لوگوں کو بنایا جو ان سے پہلے تھے۔

7- سورہ الفرقان 19/25/74: (عباد الرحمٰن) دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔ اس مقام پر آپ امام حسینؑ کے جد امجد سیدنا ابراہیمؑ کی دُعا پر غور کریں جسے قرآن نے سورہ البقرہ 01/02/124 میں ہماری رہنمائی کیلئے محفوظ کرلیا ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: جب ابراہیمؑ کو ان کے ربّ نے کئی کئی باتوں سے آزمالیا اور وہ سب امتحانوں میں پورے اترے تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا۔ (ابراہیمؑ نے) عرض کیا کہ اس انعام میں میری اولاد کو بھی شامل فرمادیں تو اللہ نے (دُعا قبول کرتے ہوئے فرمایا) کہ میرا عہد (یعنی امامت کا انعام) ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

8- سورہ النمل 20/27/62 میں اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے کس کی پکار کو کون سنتا ہے اور زمین پر خلیفہ کون بناتا ہے۔

9- سورہ القصص 20/28/05,33 میں ارشادِ ربّ ذوالجلال والاکرام ہے کہ پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں زمین میں بے حد کمزور کردیا گیا تھا اور ہم نے انہیں امام بنایا۔ اور زمین کا وارث بنایا...... (اے موسیٰ) ہم تجھے تیرا بھائی دے کر تیرے باز و مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے۔

10- سورہ صٓ 23/38/26 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔ تم لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

اِس پس منظر میں آپ سورہ المعارج 29/70/41، سورہ ہود 12/11/59، سورہ توبہ 10/9/39، سورہ الانعام 08/06/133 وغیرہ آیات کو دیکھیں جہاں یہ اصول بار بار پیش کیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے اُٹھا لیتا ہے اور اس کی جگہ نئی قوم کو استحکام عطا کر دیتا ہے۔ بار امانت کی حفاظت بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی

ہے کہ روئے زمین سے مجرم و باغی وفسادی وظالم کوحکومت واقتدار سے بے دخل کرنا قرآن پاک کا ہدف ہے تاکہ ایماندار، عبد صالح اقتدار کے وارث قرار پائیں۔

امام حسینؑ کی تحریک کا مرکزی نقطہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرآن پاک کی خصوصی اصطلاح ہے جو انبیاء کی تعلیمات کا نچوڑ تصور کیا جاسکتا ہے۔اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ نیک کاموں کی دعوت دینا اور بُرے کاموں سے منع کرنا ہے۔اس شعار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سورہ المائدہ 6/5/78-79 میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

کہہ دیجئے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو اور زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو خود بھی گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰ کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

آپس میں ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے (جو وہ کرتے تھے) منع نہ کرتے تھے۔جو کچھ بھی یہ کرتے تھے یقیناً وہ بہت بُرا تھا۔

اس حکم سے یہ اصول برآمد ہوا کہ اقوام کی تباہی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ معاشرہ میں بُرے کاموں سے روکنے والا باقی نہیں رہتا جس کے نتیجہ میں احکام الٰہی اور حقوق بشری پامال ہو جاتے ہیں۔ایسے لوگوں پر انبیاء کے ذریعہ اللہ کی لعنت بھیجی گئی۔ قرآن کا یہ اصول نہ تو کسی ایک امت کیلئے مخصوص تھا اور نہ ہی یہ کسی ایک زمانے کیلئے تھا۔یہ حکم قرآن پاک کا ہے اور تاقیامت اقوامِ عالم کی یاددہانی کیلئے محفوظ کرلیا گیا۔یہ حکم نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے احکام کی طرح زندہ وجاوید ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقوام کی زندگی کا راز اس اصول میں پنہاں ہے۔اس پس منظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ وحی کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنی معاشرتی زندگی میں اس اصول کو اپنا لے کیونکہ قرآن پاک نے اسے ایک

جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔

آیئے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ قرآن پاک نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جامع اصطلاح کو کس کس مقام پر ذکر کیا ہے۔اس تجزیہ کے بعد ہی ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

-1 تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیک کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔سورہ ال عمران 04/03/104

-2 تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ سورہ ال عمران 04/03/110

-3 بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ نیک بخت لوگوں میں سے ہیں۔ سورہ ال عمران 04/04/114

-4 جو لوگ ایسے رسول، نبی اُمی کی پیروی کرتے ہیں جن کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔سورہ الاعراف 09/07/157

-5 یہ منافق مرد اور عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں۔ یہ بُری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں لوگوں کی بہبود کیلئے خرچ نہیں کرتے۔سورہ توبہ 10/09/68

-6 مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار رمعاون اور دوست ہیں۔وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور بُرائیوں سے روکتے ہیں۔نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غلبے والا حکمت

والا ہے۔سورہ توبہ 10/09/71

-7 بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔ان پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔تم لوگ اس معاہدے (بیع) پر خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے (راہ حق میں) سفر کرنے والے، رکوع وسجود کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم دینے والے اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیں۔سورہ توبہ 10/09/111-112

-8 یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔تمام کاموں کا انجام اللہ تبارک تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔سورہ الحج۔ آیت 41

-9 اے بیٹے! تو نماز قائم رکھنا، اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا، بُرے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آ جائے صبر کرنا۔یہ بڑے تاکیدی کام ہیں: عزم الامور۔سورہ لقمان 21/31/17

ان آیات کو پڑھنے کے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

-1 کہ ادیانِ عالم میں پہلی بار اسلامی تعلیمات کے ذریعے اس بات کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا گیا کہ صاحب ایمان کو معاشرہ کی بہتری کیلئے امرونہی کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔یہ اصول ایک انقلابی تصور کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ہر زندہ، عاقل، بالغ، راشد، نظریاتی انسان یعنی مومن مسلم کو معاشرہ کے سامنے جوابدہ قرار دے دیا گیا ہے۔

2- اس ذمہ داری کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اُمت مسلمہ کو بہترین اُمت ہی اس لئے کہا گیا ہے کہ اس امت کے افراد لوگوں کو نیک کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہیں۔

3- قرآنی تعلیمات کے مطابق یعنی معروف کے مقابلہ پر لفظ منکر آتا ہے۔ان الفاظ پر لغات القرآن میں بحث موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معروف و منکر کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں اور اس تقسیم وتفریق کا معیار قرآن کریم کے غیر متبدل ضابطے ہوتے ہیں۔

4- اس حوالے سے سورہ الممتحنہ کی آیت 12 قابل غور ہے۔اس کا مفہوم درج ذیل ہے۔

> اے نبیؐ! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زناکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیا کریں اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف کرنے والا ہے۔

یعنی ہر وہ بات جو احکام قرآن کے مطابق ہو وہ معروف ہو گی اور جو کام اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا وہ منکر کی تعریف میں آئے گا۔

6- کسی تحریک کی قدر و قیمت میں اضافہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول پر کاربند ہونے سے ہی ہوسکتا ہے۔اس اصول پر کاربند ہونے کا بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ انسان معاملات کے حسن و قبح سے آگاہ ہو جائے گا۔کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی کا ادراک اس شے کو جاننے سے ہی ہوسکتا ہے۔

7- یہ کہ دین اسلام کا مزاج انفرادی فلاح کی بجائے اجتماعی نجات، اجتماعی فلاح پر ہے۔ ہر فرد بہتر ہو اور جماعت بھی مضبوط ہو۔ امر و نہی کا اصول اتحاد کا موجب بنے گا کیونکہ صاحبان علم اپنی کوتاہیوں سے آگاہ ہو کر ہی ترقی کی منازل طے کر سکیں گے۔

سیاسی ورثہ

امام حسینؓ کا زمانہ اسلامی تاریخ کا ایک کٹھن دور تھا۔ خلیفہ ثالثؓ کی شہادت کے بعد جنگ جمل اور جنگ صفین نے مسلمانوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ امیر معاویہ نے چوتھے خلیفہ کی بیعت سے انکار کر کے ریاستی امور میں نافرمانی اور علیحدگی کے رجحان کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں مشاورت واطاعت جیسے بنیادی اسلامی سیاسی ضابطوں کی جگہ کشت وخون فیصلہ کن قدر قرار پا گئی۔ اور اس طرح اصحابؓ کرام کی زندگی ہی میں مسلمانوں کی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

18 رمضان 40 ہجری کو عبدالرحمٰن ابن ملجم مرادی کی زہر آلود تلوار سے امام علیؓ کو مہلک زخم لگا اور آپ کی شہادت کے بعد عبداللہ ابن عباس کی تحریک پر کوفہ کے چالیس ہزار افراد نے 21 رمضان بروز جمعہ امام حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طرح امام حسن پانچویں خلیفہ راشد قرار پائے۔ یہ وقت بھی پُر آشوب تھا۔ مسلمانوں کی تفریق سے فائدہ اٹھا کر امیر معاویہؓ حاکم شام نے امام حسنؓ کو بھی شہید کروانے کی کوششیں شروع کر دیں اور اہم اشخاص کی وفاداری کو یقینی بنانے کیلئے دل کھول کر دولت بانٹنا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لشکر عراق پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کر دیا۔ حالات بگڑتے گئے حتیٰ کہ امام حسن نے خلافت سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا تاکہ مخلوق خدا کو قتل وغارت سے بچایا جا سکے۔ اس کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان صلح ہوئی۔ صلح کا معاہدہ 25 ربیع الاول 41 ہجری کو لکھا گیا جس کی شرائط حسب ذیل تھیں:

1- یہ کہ معاویہؓ حکومت میں قرآن وسنت رسولؐ پر عمل کریں گے۔

2- یہ کہ معاویہؓ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

3- یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کیلئے امان ہوگی۔

4- یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی ہیں ان کے جان و مال اور ناموس اور اولاد کو تحفظ حاصل ہوگا۔

5- یہ کہ معاویہؓ حسن ابن علی اور ان کے بھائی حسین ابن علی اور خاندان رسولؐ میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی خفیہ یا اعلانیہ کوشش نہیں کی جائے گی۔ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا اور ڈرایا نہیں جائے گا۔

6- یہ کہ جناب امیرؑ (حضرت علیؑ) کی شان میں نازیبا کلمات جو مسجد جامع اور قنوت میں استعمال کئے جا رہے ہیں وہ ترک کر دیئے جائیں گے۔ اس شرط پر معاویہؓ کو عذر تھا لہٰذا طے پایا کہ امام حسنؑ کی موجودگی میں حضرت علیؑ کو گالیاں نہیں بکی جائیں گی۔

(حوالہ چودہ ستارے مولفہ سید نجم الحسن کراروی۔ پشاور)

شیخ راضی آل لیس نے اپنی کتاب صلح حسنؑ کے صفحہ 61-259 پر مندرجہ ذیل چھ شرائط درج کی ہیں:

1- معاویہؓ کو اس شرط پر حکومت دی جاتی ہے کہ وہ کتاب خدا، اس کے بھیجے ہوئے رسولؐ کی سنت اور اس کے نیک خلفاء کی سیرت پر عمل کرے گا۔

2- معاویہؓ کے بعد امور حکومت امام حسن علیہ السلام کے حوالے کر دیں گے اگر انہیں کوئی حادثہ پیش آجائے تو پھر امور حکومت ان کے بھائی امام حسین علیہ السلام کے سپرد کئے جائیں گے۔ ان کے علاوہ معاویہؓ امور حکومت کسی اور کے حوالے نہیں کرے گا۔

3- امیر المومنین علی علیہ السلام کو گالی دینا اور نماز میں ان کے خلاف کوئی بات کہنا بند کر دیا جائے اور علی علیہ السلام کو سوائے اچھے الفاظ کے یاد نہ کیا جائے۔

4- کوفہ کے بیت المال میں جتنا مال ہے یعنی پانچ ملین درہم یا دینار وہ مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے معاویہؓ کی حکومت کی کے کنٹرول میں نہیں دیا جائے گا، معاویہؓ اس بات کا پابند

ہوگا۔ کہ وہ ہر سال دوملین درہم امام حسین علیہ السلام کو بھیجے گا۔ پہنچنے والے عطیات دیتے وقت بنی ہاشم کو بنی عبدالشمس پر برتری اور اہمیت دے گا اور وہ لوگ جنہوں نے امیر المومنین علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین میں مل کر جہاد کیا تھا ان کے بچوں کے درمیان ایک ملین درہم تقسیم کرے گا اور یہ رقم صوبہ ابگرد جو کہ اہواز کے قریب فارس کے شہروں میں سے ایک شہر ہے اس کے خراج سے ادا کرے گا۔

5- لوگ جہاں چاہیں زمین خدا پر زندگی بسر کر سکتے ہیں چاہے وہ شام وعراق میں ہوں یا حجاز و یمن میں سیاہ رنگ کے ہوں یا سرخ رنگ وہ امن و امان سے رہیں گے۔ معاویہؓ ان کی غلطیوں کو برداشت کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیں گے، ان کو سابقہ جرم کی وجہ سے سزا نہیں دی جائے گی۔ اہل عراق کے ساتھ کینہ و دشمنی کا رویہ نہیں اپنایا جائے گا۔ شیعیان علیؑ جہاں کہیں بھی ہوں گے امان میں رہیں گے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ شیعیان علیؑ اور ان کے چاہنے والوں کی جان و مال، بیوی بچے امان میں ہوں گے وہ ہر قسم کی اذیت اور تکلیف سے محفوظ اور ان کے ساتھ کوئی بھی ٹکراؤ پیدا نہیں کرے گا۔ ہر صاحب حق کو اس کا حق پہنچے گا اور شیعیان علیؑ نے جو کچھ بھی جہاں سے بھی حاصل کیا ہوگا وہ ان کیلئے محفوظ رہے گا۔

6- حسن ابن علی علیہ السلام اور ان کے بھائی حسینؑ اور اہلبیت رسولؐ اللہ میں سے کسی ایک کو بھی پوشیدہ ہو یا ظاہر کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی اور ان میں سے کسی ایک کی بھی امن و سلامتی میں، کسی بھی علاقے میں کوئی رخنہ اندازی پیدا نہیں کی جائے گی۔

صلح نامہ پر دستخطوں کے بعد امیرؓ معاویہ نے اپنی عام بیعت کا اعلان کیا۔ امیر معاویہؓ کی بیعت کے وقت ایسا زمانہ تھا کہ لوگ شان نبوت اور نبوی خوارق وعادات کو بھلا کر قومی حمیت اور غلبہ پر آرہے تھے اور سارے عرب اور مصر پر بنو امیہ کو غلبہ حاصل تھا۔ امیر معاویہؓ کی حکومت میں کوئی حصہ دار نہ تھا اور ان کے قدم حکومت میں میدان میں جم گئے اور

انہوں نے اس کے بعد 20 برس مزید حکومت کی جو ان کی فیاضی کی وجہ سے مستحکم ہوتی گئی اور لوگ ان کی سخت اور نا ملائم باتیں بھی برداشت کرتے رہے۔ (تاریخ ابن خلدون جلد دوم بعنوان خلافت معاویہ)

امام حسنؑ نے جن لوگوں کے اشتراک سے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا تھا ان کے سامنے زندگی اور نظام حکومت کے متعلق کوئی مضبوط نظریہ نہ تھا۔ متحد و منظم ہو کر نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی۔ اس وقت معاشرہ کئی طبقات میں بٹ چکا تھا۔ ایک طرف اموی گروہ تھا جو کافی عرصہ سے حکومتی سطح پر اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنے کے علاوہ مقتدر بھی بن چکا تھا۔ یہ گروہ آل رسولؐ کی حرکات وسکنات پر نگاہ بھی رکھتا تھا اور پل پل کی خبریں حاکم وقت تک پہنچ جاتی تھیں۔ دوسرا گروہ خوارج کا تھا۔ اہل کوفہ کی اکثریت امیر معاویہؓ کے خلاف جنگ کرنے پر اصرار کرتی تھی۔ ان لوگوں نے امام حسنؑ کی موجودگی میں امام حسینؑ کو اکسانے کی کوشش کی۔ امام کو یہ کہنا پڑا کہ امام حسنؑ کی زندگی میں وہ بیعت کا اعلان کرنے والے نہیں ہیں۔ تیسرا طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جو شک وشبہ کا شکار ہو چکے تھے۔ سیاسی بے یقینی کے وقت بعض لوگ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ انہیں کس پارٹی کا ساتھ دینا ہے۔ حضرت علیؑ کی شہادت نے ایک غیر یقینی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ استاد عادل ادیب نے اپنی کتاب زندگانی تحلیلی پیشوایانِ آئمہ دواز دھگانہ نے ایک اور گروہ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے اس گروہ کو حمرا یعنی سرخ گروہ کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ یہ گروہ زیاد کے پہرے دار اور پاسبان تھے جو صرف اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے جس کی تلوار سب پر غالب ہو۔ اس گروہ نے کوفہ کا نام ہی کوفہ حمراء رکھ دیا تھا۔ پانچواں طبقہ ان اشخاص پر مشتمل تھا جنہوں نے حضرت امام حسنؑ کی بطور خلیفہ بیعت کر لی تھی لیکن اموی اور خوارج کے گروہ نے اس طبقہ کی قوت اور تنظیم کو کافی نقصان پہنچایا۔

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت علیؑ اور ان کے دونوں بیٹوں میں ایک ایسا فرق تھا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ دونوں کے حق میں نصوص موجود تھیں اور دونوں بیٹے یعنی حسنینؑ بھی امام اور معصوم تھے۔ لیکن جو مقام حضرت علیؑ کا تھا وہاں کسی اور کی

رسائی ناممکن تھی۔ حضرت علیؓ اسلام لانے میں سابقون میں سے تھے۔ اسلام کے خلاف جنگوں میں ان کا کردار نمایاں اور فیصلہ کن تھا۔ آپ سیدہ فاطمہؓ کے شوہر بھی تھے۔ آپ نے رسوؐل کی طویل تربیت سے فیض حاصل کیا تھا۔ آپ کی حضوؐر سے وہی نسبت تھی جو سیدنا ہارونؑ کو سیدنا موسیٰؑ کے ساتھ تھی۔ آپ من کنت مولا کا مصداق تھے اور مسلسل 23 برس اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر رسول پاکؐ کی مدد کرتے رہے۔ لہٰذا لوگوں کے دلوں میں جو احترام اور عقیدت حضرت علیؓ کے ساتھ تھی اتنے شدید جذبات امام حسنؓ کا مقدر نہ بن سکے۔ ہوسکتا ہے کہ امام حسنؓ نے جن حالات میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور امیرؓ معاویہ کے ساتھ جنگ کی کیفیت پیدا ہوئی اس وقت بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہو کہ یہ محض دو خاندانوں میں حصول حکومت کی جنگ ہے لہٰذا دونوں طرف سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

اس پس منظر میں قابل غور بات یہ ہے کہ نظام حکومت کا جو پودا ثقیفہ میں لگایا گیا اور جس طرح اس عمل نے ارتقائی سفر اختیار کرتے کرتے جمہوری رنگ اختیار کیا تھا وہ اصول اور عمل تین اہم تاریخ ساز دہائیوں کے بعد 41 ہجری میں نئے حادثے کا شکار بن کر قصہ پارینہ بن گیا۔ دعویٰ تو خلافت کا ہو اور تسلسل بھی خلافت راشدہ کا مقصود ہو جس میں باہمی مشاورت اور عوامی سطح پر استصواب رائے کلیدی حیثیت اختیار کر چکی ہو لیکن مخلوق خدا کو اپنے امیر کا انتخاب نہ ہو۔ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے مسلمانوں کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ خلافت راشدہ کے انتخاب کے اصول سے انحراف کے نتائج 60 ہجری میں برآمد ہوئے جبکہ امیرؓ معاویہ کے نامزد ولی عہد فرزند نے اپنے والد کی وفات کے بعد نام نہاد خلافت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس ایک واقعہ نے بے یقینی کی کیفیت کو ایک ایسی سیاسی اور آئینی بحران بنایا جس نے نہ صرف امت مسلمہ کو آنے والی صدیوں میں نظریاتی سطح پر تقسیم کر دیا پہلے کربلا جیسے سانحہ سے دوچار کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ بعض لوگوں نے امام حسینؓ اور کو عبداللہ ابن زبیرؓ کے طرز عمل کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ابن زبیر کا مطمح نظر عبدالملک بن مروان کو حکومت سے علیحدہ کرنا تھا۔ اس کی جنگ کسی نظریہ

پر نہ تھی۔

چونکہ عبداللہؓ ابن زبیر کا ذکر آ گیا ہے اور وہ بھی امام حسینؑ کی طرح یزید کے مطالبہ بیعت سے متاثر ہوا تھا لہٰذا ان دونوں کا ایک تقابل غیر ضروری نہ ہوگا۔ دونوں بزرگوں کے ابتدائی ردعمل میں ظاہری مماثلت تھی کیونکہ دونوں یزید کی بیعت پر متفق نہ تھے۔ چونکہ دونوں حضرات سے بیعت کا مطالبہ تھا لہٰذا دونوں نے مدینہ سے مکہ کی طرف سفر اختیار کیا۔ دونوں کا دشمن مشترکہ تھا۔ دونوں ظلم کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن دونوں کے نصب العین میں جوہری فرق مقاصد اور اہداف کا تھا۔ ابن زبیرؓ نے اپنی جان کے تحفظ کیلئے اور اقتدار کے حصول کیلئے کعبہ کو ڈھال بنایا اور اس عمل میں خانہ کعبہ پر گولہ باری اور آتش زنی کا اندوہناک سانحہ بھی ہوا لیکن امام حسینؑ نے کعبہ کے تقدس کو بچانے کیلئے اپنی اور اپنے اہل بیت اور اصحاب کی جانوں کو ڈھال بنانے کا فقید المثال مظاہرہ کیا۔ آپ کے اس عمل میں یہ تعلیم تھی کہ شعائر اللہ کا بہر حال احترام لازمی ہے حتی کہ جان اور مال بھی قربان ہو جائے۔ امام حسینؑ نے اسلام کی خاطر خود کو قربان کیا جبکہ ابن زبیرؓ نے اپنے تحفظ کیلئے اسلام کو قربان کیا۔ امام حسینؑ نے لوگوں کو اللہ عز و جل کی راہ پر چلنے کی دعوت دی جبکہ ابن زبیر نے لوگوں کو اپنی ذات کے تحفظ کیلئے دعوت دی تھی۔ ابن زبیر حرم کا کبوتر بنا جبکہ تاریخ حسینؑ کو حرم کے پہلے محافظ کی صورت میں بھی پہچانتی ہے۔

اس دوران ترغیب، تحریص، تخفیف اور تحدید نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ کوفہ کے باسی امیر معاویہ کی طرف جھک گئے تھے۔ امام حسنؑ نے محسوس کیا کہ اگر چہ حق ان کے ساتھ ہے لیکن جنگ کی صورت میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت کا اندیشہ ہے لہٰذا امام نے صلح کو جنگ پر اور دستبرداری کو اقتدار پر ترجیح دی۔ اس صلح نے امام حسنؑ کو اخلاقی فتح سے بھی ہمکنار کیا کیونکہ امیر معاویہ کا خیال تھا کہ امام حسنؑ بعض وجوہ کی بنا پر جنگ سے دستبردار نہیں ہونگے اور امیر معاویہ کی طرف سے صلح کا پیغام امت میں ان کے مقام کو بلند کر دے گا۔ امام کی حکمت عملی نے امیر معاویہ کو بعض شرائط پر صلح کا معاہدہ قبول کرنا پڑا۔

ایک طرف یہ جذبہ ہے کہ مسلمانوں کو خونریزی سے بچایا جائے اور آئندہ کیلئے

امارت کے مسئلہ کو پُر امن ماحول میں اصولوں کے تابع کیا جائے تا کہ انتقال اقتدار میں رخنہ پیدا نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی تھی کہ امیر مملکت کو اخلاقی اقدار کا پابند بھی کیا جائے تا کہ لوگوں کی جان و مال کا تحفظ ہو سکے۔ صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے جبکہ امام حسنؓ کے محترم نانا ؐ نے حالات کے پیش نظر معاہدہ کو امن کا ذریعہ بنایا تھا۔ قرآن پاک نے معاہدات کو بنیادی اہمیت دی ہے اور سنت مطہرہ سے ہمیں بہت سے واقعات ملتے ہیں جہاں میثاق، معاہدہ اور وعدہ وعید کو قانون الٰہی کی سند حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلہ کو برقرار رکھتے ہوئے رئیس مملکت کے معاملہ کو معاہدہ کے ذریعہ طے کرنے کی ابتداء کی گئی اور یہ امید تھی کہ مسائل کا حل پُر امن طریقے سے کیا جائے گا۔ قرآن پاک کی سورہ انبیاء کی آیت 59 میں یہ اصول درج ہے کہ اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بہتر بھی ہے۔

مفسرین نے قرآن کے اس اصول کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد ہے اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے۔ مودودی صاحب کے مطابق اس میں چار مستقل اصول مرتب ہوتے ہیں۔ (1) اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے اللہ تبارک تعالیٰ کا بندہ ہے باقی جو کچھ بھی ہے اس آیت کے بعد ہے۔ (2) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ (3) تیسری ذیلی اطاعت ان اولی الامر کی ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ اولی الامر میں علماء، سیاسی راہنما، حکام، جج، شیوخ و سردار ہونگے۔ (4) فیصلے کیلئے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اس اصول کی وضاحت مزید اگلی آیت میں ہوگئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اے نبیؐ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔

اس سے واضح ہوا کہ معاملات کے تصفیہ کیلئے قرآن وسنت سے رہنمائی لینا بنیادی فریضہ ہے جہاں یہ ہدایت موجود ہے کہ معاہدہ کے ذریعہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے تاکہ امن برقرار ہو اور معاہدہ کی پابندی لازمی ہے کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ خود معاہدات کو پورا کرنے کی تعلیم فرماتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایفائے عہد وعقد پر بہت زور دیا ہے۔ بنابراں یہ کہنا درست ہوگا کہ صلح امام حسنؑ ایک نہایت مستحسن اقدام تھا اور اس معاہدہ کا منطقی انجام برآمد ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے اس کی شرائط میں یکطرفہ ترمیم و تنسیخ سے اسلامی نظام حکومت میں ایسا رخنہ پڑا کہ آج چودہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی مسلمان اکٹھے نہیں ہو سکے۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ امام حسنؑ کے طرز عمل کی حکمت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ لوگوں میں یہ تاثر قائم کرنا چاہتے تھے کہ معاہدہ کی شرائط پوری کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے امیرؓ معاویہ نے لوگوں کو عطیات دینا شروع کر دئے اور اپنی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے مخبروں کا جال بچھا دیا۔

امیرؓ معاویہ کو حکومت کرنے کا طویل عرصہ میسر آیا۔ پہلی حیثیت میں وہ شام کے گورنر تھے اور بعدازاں آپ اسلامی ریاست کے سربراہ بنے لیکن آپ کے دور حکومت کو خلفاء راشدہ کے برابر قرار نہیں دیا گیا حالانکہ امیر معاویہؓ نے اپنی آنکھوں سے دور رسالتؐ کے بعد خلفاء راشدہ کے دور حکومت میں شام کی امارت بھی کی تھی۔ دراصل حضرت علیؑ کی شہادت تاریخ اسلام کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مسلمانوں نے ان حالات میں اس بات کو محسوس کیا کہ ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے' ان پر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ امت اسلامیہ کا وجود نابودی کے خطرہ سے دوچار ہے۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ احکام شریعت کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ خلافت ایک کھیل بن چکا ہے اور مال غنیمت ومفتوحہ علاقے قریشیوں کے باغیچے بن چکے ہیں جہاں بنوامیہ کے بچے کھیل کھیلتے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام نے ان تمامتر حالات میں اپنے مثبت پروگرام کو جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے حکومت خوف زدہ تھی۔ ہیئت حاکمہ کو ہر وقت امام علیہ السلام کی طرف سے

اس بات کا ڈر رہتا کہ امام کے مسلسل عوامی رابطوں سے بنی امیہ کے مظالم کے خلاف انقلاب آسکتا ہے۔ حکومت کے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی لہٰذا امام کو راستے سے ہٹانا حکومت کی اوّلین ترجیح تھی۔ امام علیہ السلام کو زہر کے ساتھ شہید کرنا اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ معاویہؓ یہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ امام علیہ السلام ایک مکتب کی نمائندگی کرتے ہیں وہ اپنے پیغام کو پہنچانے کیلئے کسی بھی قسم کی کوشش سے گریز نہیں کرتے وہ ہر وقت اپنی تمام تر صلاحیتوں اور کوششوں کو اپنے مکتب اور ہدف کی بلندی کیلئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں لہٰذا ان کو راستے سے ہٹانا اشد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ علیہ السلام کو زہر سے شہید کر دیا گیا۔

سیاسی ورثہ کے حوالے سے ہم ان ذمہ داریوں کا جائزہ لیتے ہیں جو ہمارے خیال میں آئمہ طاہرین پر قرآن وسنت کی رو سے عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو حتی الوسع پورا کرنا وقت کے امام کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔

1- ہادی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اسلامی عقائد کو نہایت وضاحت کے ساتھ عامتہ الناس کے سامنے پیش کرتا رہے۔ ہر دور میں کئی کئی نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔ ہر روز اُبھرنے والا سورج نت نئے چہروں کو دیکھتا ہے اور ان نومولود بچوں نے وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنا ہوتا ہے۔ ان بچوں کی تعلیم اور تربیت معاشرہ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور وقت کے امام پر ایک طرف صحیح عقائد واضح کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے تو دوسری طرف منفی رجحانات کی نشاندہی اور اس کے واسطے رائے عامہ کو تیار کرنا بھی ان کے ایجنڈے میں شامل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں سورہ السجدہ 21/32/24 اور سورہ الانبیاء 73-17/21/72

ترجمہ: اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔ (السجدہ)

ترجمہ: تو ان میں سے ہم نے آئمہ پیدا کئے جو ہمارے حکم سے

رہنمائی کرتے تھے۔

ان دو مقامات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآن کی روشنی میں آئمہ کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ان ہستیوں کو ان مقاصد واہداف کو زندہ رکھنا ہوتا ہے جن مقاصد کے حصول کیلئے اللہ عزوجل انبیاء کو مبعوث فرماتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا ہے کہ آئمہ اپنے اپنے وقت اور حالات کے مطابق قرآن کے تابع اور نبی کا اتباع کرتے ہوئے بندگان خدا کی ہدایت کرتے ہیں اور حالات کی تبدیلی کے مطابق اجتہادی عمل کو بروئے کار بھی لاتے ہیں۔

ان آیات میں غور طلب بات یہ ہے کہ آئمہ اللہ تبارک تعالیٰ کے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں یعنی یہ آئمہ کسی بادشاہ، سلطان، امیر یا ملک سے ہدایات حاصل نہیں کرتے نہ ہی لوگوں کی خواہشات کے پیش نظر اپنے ایجنڈے کو مرتب کرتے ہیں۔ یہ آئمہ نہایت یقین، صبر، استقلال اور جرأت کے ساتھ کام کرتے ہیں کیونکہ وہ کار الٰہی کی انجام دہی میں مصروف ہوتے ہیں اور اللہ تبارک تعالیٰ ہی حاکم اعلیٰ ہے اور سب کو اسی کے پاس جانا ہے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کے عمل سے اسی جگہ پیش ہونا ہے۔

2- نظام عدل گستری کا قیام

ایک متوازن معاشرے کا قیام قرآن کا بنیادی ہدف ہے۔ جب تک معاشرہ متوازن نہیں ہوتا حقوق بشری کا تحفظ ممکن نہیں۔ عدم توازن کی صورت میں ظلم اور فساد برپا ہونا لازمی ہے۔ قرآن نے عدل، میزان قسط جیسے تصورات پیش کر کے زندگی کے ہر پہلو میں عدل اور عدل کے ساتھ احسان کے پہلو کی نشاندہی کر دی ہے۔ یہ کام اگر چہ انفرادی سطح پر بھی ممکن ہیں لیکن مثبت، دوررس اور مستقل نتائج حاصل کرنے کیلئے ان میں اجتماعی کوشش لازمی ہے جس کیلئے رہنمائی امام ہی مہیا کر سکتا ہے کیونکہ امام قرآن وسنت کا مزاج شناس ہوتا ہے۔

3- خلافت علی منہاج الرسالت کا قیام

اسلام کا عقیدہ توحید باقی مذاہب کے خدائی تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ مومن

مسلمان اپنی ساری زندگی اللہ تبارک تعالیٰ کے بتائے ہوئے ضابطوں کے مطابق گزارتا ہے کیونکہ توحید کے تصور میں اللہ تعالیٰ خالق اور ربّ العالمین کے علاوہ احکم الحاکمین، خیرالوارثین اور مالک یوم الدین بھی ہے۔ مزید براں اللہ عزوجل زندگی گزارنے اور معاشرہ کے قیام کیلئے اصول وضوابط بھی فراہم کرتا ہے جن کو عملی جامہ پہنانے کیلئے مسلمان جماعت کو سیاسی اقتدار کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ معاملات احکام الٰہی کے مطابق طے ہوں۔ انسانی تاریخ دوسری طرف واضح کرتی ہے کہ انسان حکومت کے معاملہ میں بہت لالچی ثابت ہوا ہے۔ انسانی جماعتیں اپنی ہی جنس کے معاشی اور سیاسی استیصال میں مصروف نظر آتی ہیں لہٰذا امت کو ظلم و جبر واستبداد سے بچانے کیلئے امام کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف ہدایت اور رہنمائی مہیا کرے بلکہ اقتصادی سطح پر حقداروں کو ان کے حق ملنے میں مدد بھی کرے۔

4- جہاد کے عمل کو زندہ رکھنا

معاشرہ کو متوازن رکھنے کیلئے اور مملکت کو بیرونی خطرات سے محفوظ کرنے کیلئے جامع پالیسی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ حالت امن میں انسانیت ترقی کے مراحل طے کر سکے۔ داخلی مسائل حل کرنے کیلئے وطن عزیز کے اندر اجتہاد جیسے فعال رکن کو سیاسی نظام کا حصہ بنانا اور عسکری لحاظ سے وطن کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنا بھی قومی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔

5- کفالت کا اصول

کفالت کا اصول اسلامی تعلیمات کا بنیادی رکن ہے۔ نبی کی بعثت کا مقصد لوگوں کو ہر قسم کے خوف وحزن سے نجات دلانا ہوتا ہے۔ احتیاج کو ختم کر کے تکریم آدم کو یقینی بنانا تاکہ وسائل پیداوار میں ہر فرد بشر کے حصہ کو محفوظ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ادارہ سازی کر کے اداروں کو عملی سطح پر فعال بنانے کیلئے وسائل کا مہیا کرنا بھی قومی قیادت کی اساسی ذمہ داری ہوتی ہے۔

امام پر مختلف النوع ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تاکہ وہ اس نظام کو عملی سطح پر نافذ

کر سکے جس کا تصور اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن پاک میں محفوظ کر دیا ہے۔اس ذمہ داری کی ادائیگی میں رکاوٹوں کا آنا قدرتی امر ہے کیونکہ انسان کے ذاتی مفادات کو اجتماعی مفادات کے تابع کرنے کیلئے ایک فکری انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے جس کیلئے عوامی شعور کا بیدار ہونا بنیادی شرط ہے۔

6- انذار کا منصب

امام کے ذمہ انذار کا فریضہ بھی ہوتا ہے۔انذار کا لغوی مطلب آگاہ کرنا ہے۔کام کے نتائج سے آگاہ کرنا۔آگاہ کرنے والے کو منذر کہا جاتا ہے چونکہ نبی کا ایک منصب لوگوں کو اعمال کے نتائج سے آگاہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا نبی کو بھی منذر کہا جاتا ہے۔اس مادہ سے لفظ نذیر بنتا ہے جس کا عام فہم ترجمہ ڈرانے والا کیا جاتا ہے۔یہ ترجمہ اس لئے درست نہیں معلوم ہوتا کہ نبی لوگوں کو خوف زندہ نہیں کرتا بلکہ ان مضر اور نقصان دہ نتائج سے آگاہ کرتا ہے جس کے متعلق فاعل کو علم نہیں ہوتا۔نبی وحی کے علم کی وجہ سے اعمال کے نتائج کا اسی طرح جاننے والا ہوتا ہے جس طرح ہم تجربے کی بنیاد پر عوامل کے ردعمل جانتے ہیں کہ اگر ایک شخص، کو جسے تیرنا نہ آتا ہو، سمندر میں پھینک دیا جائے تو وہ ڈوب جائے گا۔بنابراں انذار یعنی پیشگی آگاہی سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جسے منذر پر ایمان ہو یعنی وہ شخص نبوت کا انکاری نہ ہو۔قرآن پاک کی سورہ یونس 11/10/02 میں لکھا ہے کہ لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیجی گئی تاکہ وہ لوگوں کو انذار یعنی آگاہ کرے اور جو ایمان لے آئے یعنی ان باتوں کو تسلیم کرلے اس کو بشارت سنا دے کہ ان کے ربّ کے پاس ان کو (اچھے نتائج والے اعمال کا) اجر ملے گا۔کافروں نے کہا کہ یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو انذار کا عمل اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے کیونکہ انذار کی وجہ سے پیشگی اطلاع ہو جاتی ہے اور انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ کاش مجھے علم ہوتا تو میں ان تباہ کن نتائج سے بچ جاتا۔انذار کے متعلق قرآن پاک کی ایک اہم ہدایت سورہ توبہ 11/09/122 میں درج ہے۔اس آیت مبارکہ کا عام فہم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں......
ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور
جب اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہیں انذار کریں یعنی انہیں آگاہ کریں
تاکہ وہ آگاہ ہو جائیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انذار کا عمل ایک مسلسل عمل ہے جسے مسلمانوں کی ایک جماعت نے ادا کرنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امام اس بات کا سزاوار ہے کہ لوگوں کو آگاہ کرتا رہے کیونکہ مرورزمانہ میں تعبیریں بدل جاتی ہیں، گروہی مفادات جنم لے لیتے ہیں اور نئے رجحان پیدا ہو جاتے ہیں لہٰذا احکام کی تعبیر وتفسیر اور اجتہادی عمل کو بروئے کار لانے کیلئے علماء، صاحبان علم وخبر اور آئمہ ہی زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔

انذار کے سوال پر غور کرنے کیلئے سورہ القمر 39-27/54/15 کا ملاحظہ سود مند رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور بے شک ہم نے اس واقع کو نشانی بنا کر باقی رکھا پس کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا...... اور بے شک ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے...... پس ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کر دیا پس کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا...... قوم لوط نے انذار کرنے کی تکذیب کی...... پس میرے عذاب کا مزا چکھو۔

بنابراں امام پر لازم آتا ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصول وضوابط، مقاصد واہداف سے مومنین کو آگاہ کرے اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ بھی کرے۔ غور سے دیکھیں تو آگاہی کے اس عمل میں انسان کی فلاح اور اجتماعی نجات ہے۔ بہت سی باتیں جو انسان طویل اور تلخ تجربات کے بعد حاصل کرتا ہے وحی اور سنت کی روشنی میں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ کام صرف صاحبان علم ہی سرانجام دے سکتے ہیں کیونکہ اب کسی نبی نے تو آنا نہیں اور نہ ہی وحی کے حجم میں اضافہ ہونا ہے۔

سنن بن ماجہ، کتاب الفتن کے باب العقوبات باب 733 کی حدیث نمبری 1817 میں بطور انذار مندرجہ ذیل باتیں درج ہیں۔ (۱) جب کسی قوم میں کھلم کھلا فحشات ہونے لگیں تو ان میں طاؤن اور وہ بیماریاں عام ہو جاتی ہیں جو پہلے کبھی پیدا نہ ہوئی

تھیں (مثلاً آج کل آتشک سوزاک کے بعد ایڈز جیسی نامعلوم بیماری لاحق ہو جاتی جارہی ہے) (۲) جب لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگ جاتے ہیں تو ان پر قحط اور سختیاں نازل ہوتی ہیں، بادشاہ ان پر ظلم کرتے ہیں، جب لوگ زکوٰۃ دینا چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تبارک تعالیٰ بارش کو روک دیتے ہیں اور اگر زمین پر چوپائے نہ ہوتے تو آسمان سے ایک قطرہ پانی نہ گرتا اور جب (۳) لوگ اللہ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑتے ہیں تو اللہ تبارک تعالیٰ ان پر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے اور وہ دشمن ان کا مال وغیرہ سب کچھ چھین لیتے ہیں (جس طرح آج کل امریکی حکومت عربوں کے تیل پر قبضہ کئے بیٹھی ہے) (۴) اور جب مسلمان حکمران اللہ کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قانون اور احکام خداوندی میں سے کچھ لیتے ہیں اور کچھ چھوڑتے ہیں تو اللہ تبارک تعالیٰ ان کے درمیان اختلاف پیدا فرما کر اختیار دیتے ہیں۔

اس حدیث کی روشنی میں امام حسینؑ کے قیام کی وجوہات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ بنابراں ہم سمجھتے ہیں کہ بہترین سیاسی عمل یہ ہے کہ لوگوں کو آگاہ کیا جائے، ان کے احساس کو جھنجھوڑا جائے، انہیں معروف کی طرف متوجہ کیا جائے اور منکرات سے بچنے کی تلقین کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں کربلا بھی انسانی روح کا ایک جاوداں استعارہ ہے۔ امام کی جدوجہد اور قربانی کا ثمرہ ہے کہ جب بھی کسی دور میں کسی مقام پر ظلم و جور واستبداد کا عمل ہوتا ہے انسان کا ضمیر، انسان کی روح ایسے ظلم وفساد کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ آج اس بغاوت اور ردعمل کا اظہار اسی استعارے کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بعض اور چیزیں بھی قابل غور ہیں جنہیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

بلاشبہ اللہ ہی حاکمیت اعلیٰ کا سزاوار ہے اور حکومت اسی کو زیبا دیتی ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ کی اعلیٰ ترین حکمرانی کی بہترین دلیل یہ نظام کائنات ہے جس میں اس کی ربوبیت ہر ہر لحظہ جلوہ گر ہے۔ انسانی تاریخ کے جائزے سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان ابھی تک انداز حکمرانی سے بے بہرہ ہے۔ نہ تو انسان کو خود اپنی ذات کو کنٹرول کرنے کا طریقہ سمجھ آیا ہے اور نہ ہی مخلوق خدا کی دیکھ بھال کرنے کا ڈھنگ آیا ہے۔ طاقت کا نشہ انسان کو درندگی

کی حدود میں داخل کر دیتا ہے اور طاقت کے خمار میں انسان فتنہ وفساد، ظلم واستبداد اور قتل ناحق جیسے جرائم کے ارتکاب میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

انسان کے اردگرد تعمیری قوتوں اور وسائل پیداوار کے اتنے بڑے ذخائر موجود ہیں کہ اگر وہ انصاف کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انسان کی بہتری کیلئے اقدام کرے تو چند برسوں میں یہ دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔ انسان کی آج سب سے بڑی پریشانی بھی یہی ہے کہ گڈگورنس یعنی اچھا طرز حکومت کا کون سا طریقہ آزمائے۔ صدیوں کی کوشش کے بعد انسانوں کے ایک طبقے نے جمہوریت پر اتفاق کرتے ہوئے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ اس سے بہتر طرز حکومت ابھی تک انسان نے ایجاد نہیں کیا حالانکہ وہ نظام جس کی بنیاد مادیت پر ہو انسانی عمومی فلاح کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے نہ ہی انسانوں کی غیر فطری تقسیم در تقسیم کا ابھی تک مداوا کر سکا ہے۔

دین اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کو پہلی بار بتایا کہ:

1- اقتدار اعلیٰ اللہ تبارک تعالیٰ ہی کا حق ہے جو پیدا کرتا ہے، ربوبیت کے نظام کو جاری رکھے ہوئے ہے اسے حق حاصل ہے کہ انسان کی فلاح ونجات کیلئے راستہ تجویز کرے۔

2- انسان کو انسان پر حکومت کا حق نہیں۔

3- ہر انسان کو مکرم بنادیا گیا ہے۔

4- ہر انسان انعامات الٰہی سے فیض یاب ہونے کا حقدار ہے۔

5- حقوق بشری کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

6- خوف وحزن اور فتنہ وفساد سے نجات دلانا معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

7- انسان کو مختلف طبقات یا خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ انسانوں کے درمیان مساوات تسلیم شدہ امر ہے کیونکہ سب انسان ایک ہی طرح پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی طرح اپنا وقت پورا کرکے اِس دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ انسان کی بڑائی یا عظمت کا معیار اس کے اعمال، نیت اور خلوص ہے۔ سب انسان نیابت میں ساجھے

ہیں۔

8- مادیت کے علاوہ روحانیت بھی انسانی زندگی کا عنصر ہے۔

9- ہدایت حاصل کرنا، تعلیم سے بہرہ ور ہونا اور اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

10- حکومت کے معاملات میں مشاورت ہر انسان کا حق ہے کیونکہ اسلام میں طبقات کی بجائے اجتماعی نیابت/اجتماعی خلافت کا تصور ہے۔

12- حکومت/معاشرہ سرمایہ دار گروہ پر کڑی نظر رکھے گا کیونکہ انسانی آزادی کے راستے میں ایک رکاوٹ سرمایہ داری ہے۔ فارغ البال طبقات اور مرفہ الحال لوگ محرومین کی نجات میں رکاوٹ ڈالنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی تکذیب کرتے ہیں، احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں اور مخلوق خدا کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔

13- جاگیرداری بھی ملوکیت کی ایک شاخ ہے جو انسان کی آزادی کی رکاوٹ ہے۔

14- نظریاتی ہم آہنگی حصول مقاصد کیلئے آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔

15- اسلام میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کی بنیاد پر ایک متوازن معاشرہ کی تشکیل ممکن ہے جو قومیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے علاوہ انسانی حاکموں اور انسان ساختہ نظام اور قانون کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتی ہیں وہ محکومی و رسوائی اور عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

16- اسلام نے دین جیسے بنیادی معاملہ میں بھی جبر کی اجازت نہیں دی اور قرآنی تعلیمات نے واضح کیا ہے کہ کسی فرد بشر کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔

ان معروضات کے پیش نظر ہم یہ بات کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اسلامی نظام دراصل آفاقی روحانی جمہوریت کا تصور پیش کرتا ہے جس تصور کو ملوکیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری برداشت نہیں کرتی لہٰذا باطل کے مقابلہ حسینؑ کی شکل میں حق کو سامنے آنا پڑتا ہے۔

کربلا، کوفہ اور شام

کئی برس پہلے پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی مرحوم و مغفور میرے دفتر 15-بی، واقع فین روڈ لاہور تشریف لائے اور قرآن پاک کی سورہ ق 26/50/16 میں آیت مبارک

ولقد خلقنا الانسان و نعلم ماتوسوس به نفسه و نحن اقرب الیه من حبل الورید۔

پر ایک سابقہ بحث کے حوالے سے گفتگو کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ شاہ صاحب امام عالی مقامؑ کی نسبت سے ایک شعر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ عابدی صاحب کے مقام کے پیش نظر میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ آپ نے فرمایا

خنجرِ شمر چلا، آئی فلک سے یہ صدا
فاطمہ فکر نہ کر، میں ہوں رگ جاں سے قریب

یہ شعر سن کر میں دم بخود رہ گیا کیونکہ سید صاحب نے قرآن کی ایک آیت کی نہایت خوبصورت انداز میں تعبیر پیش کی تھی۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات کربلا سے کوفہ اور پھر شام تک کے سفر کی کرنی ہے۔ شمر کے خنجر کی بارہ ضربات کے بعد امام حسینؑ کی سجدے میں جھکی گردن کو کاٹا گیا۔ سر اقدس نیزے پر بلند ہوا۔ اس کے بعد دیگر شہداء کے سر کاٹے گئے۔ عمر سعد کے حکم پر اسحٰق بن حویہ، اخنس بن مرثد، حکیم بن طفیل، عمرو بن صبیح، رجا بن منقذ، سالم بن خیمثہ، صالح بن وہب، واعظ بن تاغم، ہانی بن ثبت اور اسید بن مالک نے شہداء کی مقدس لاشوں کو پامال کیا۔ اس کے بعد شام غریباں کا دلگداز واقعہ ہوتا ہے۔

یزید کی عسکری انتظامیہ خوش ہے۔ ان کے ہاتھ ایک نادر ٹرافی یعنی بے مثل بند خزانہ لگا ہے جس کی چابی دمشق میں یزید کے قبضہ میں ہے۔ لشکر یزید کے امیر اور کوفہ کا گورنر انعام کی امید لگائے بیٹھے ہیں اور طاقت کے نشہ میں امام حسینؓ اور دیگر شہدائے کرام کے کٹے ہوئے سروں کا جلوس ترتیب دے کر اور ان کے جلو میں ال رسولؐ کی خواتین اور بیمار کربلا امام زین العابدین کو قیدی بنا کر ایک جماعت کی شکل میں کوفہ کی طرف روانہ کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کا یہ سفر مختلف شہروں اور قصبوں کے بازاروں سے ہوتا ہوا، دمشق پہنچتا ہے۔ ہر شہر کے بازار میں ان قیدیوں کی تشہیر کی جاتی ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس طویل سفر کی روئیداد قلم بند کی ہے جسے اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

امام حسینؓ کی شہادت کے بعد دشمن کیلئے میدان خالی تھا۔ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بانی اسلام کا نواسہ اور ان کے اصحاب و انصار مارے جا چکے تھے اور اب اہل بیت رسولؐ کی خواتین، انصار و جان نثاران اہل بیت کے اہل خانہ اور امام حسینؓ کے بیمار فرزند امام علی زین العابدینؓ کے سوا کوئی قابل ذکر ساتھی زندہ نہ تھا۔ شہادت کے بعد شام غریباں نازل ہوتی ہے۔ یہ وہ شام غم ہے جہاں سے تحریک حسینی کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ جہاد کی دوسری کڑی اسی شام شروع ہو جاتی ہے اور اس لمحہ درد والم کے علاوہ خون ناحق کی تشہیر اور حسینی تحریک کے مقاصد کی اشاعت کا کام بھی شروع ہو جاتا ہے۔ تحریک کا دوسرا باب شدید مصائب کے المناک لمحات میں محرم کی گیارہویں شب لکھا گیا۔ 61 ہجری کے محرم کی یہ گیارہویں شب اہل بیت اطہار کی زندگی کی تاریخ کی طویل ترین اور شدید ترین رات شمار کی جاسکتی ہے۔ جبکہ دشمنوں کے چنگل میں بیمار، بچوں اور عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس رات نے پہلی بار خانوادہ رسولؐ کو ایسی حالت میں دیکھا جس کا تصور کسی صاحب ایمان کیلئے سوہان روح سے کم نہیں۔ اس رات کا غم کیسے بیان ہو۔ کوئی ایک واقعہ ہو تو بیان کیا جائے۔ باہر گنج شہیداں تھا اور جلتے ہوئے خیموں کے اندر بچے، عورتیں اور بیمار تھے۔

اس بے سروسامانی کی حالت میں علیؓ ابن ابی طالب کی شیر دل خاتون سانحہ کربلا کے وپس ماندگان کی حفاظت اور سرپرستی کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے اللہ کے

حضور استغاثہ بھی پیش کرتی ہیں۔

اے اللہ کے رسول محمد مصطفیٰ آسمان کے فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ یہ ہے آپ کا حسینؑ جو خاک وخون میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کے جسم کے اعضاء پارہ پارہ ہیں اور آپ کی بیٹیاں اسیر ہو چکی ہیں۔

گیارہویں محرم کو اسیروں کا قافلہ مرتب کر کے اسے دانستہ گنج شہیداں سے گزارا گیا۔ اس مقدس ومحترم لیکن قیدی کاروان میں پسماندگان شہدائے کربلا کی ترتیب کچھ اس طرح تھی۔

1- سیدہ زینب کی سربراہی میں سید الشہداء کی ازواج ودختران

2- بیمار کربلا امام علی زین العابدینؑ

3- بچے اور بچیاں جن میں (امام) محمد باقرؑ بھی شامل تھے۔

4- امام حسینؑ کی اولاد

5- انصار ودیگر شہداء کربلا کے اہل خانہ

6- خدمت گذار

ان اسیروں کے پاس سوائے قوت ایمان، صبر واستقامت، اعلیٰ اخلاق اور اسلام سے محبت کے علاوہ اور کوئی اثاثہ نہ تھا۔ ہاں ان کے شہداء کے پاک سران کے ہمراہ تھے جو انہیں بار بار اپنے مقصد کی یاد دلا رہے تھے لیکن ان کی ہمت توڑنے کیلئے دشمن نے اسیروں کو بشمول بچوں کے رسیوں سے باندھ رکھا تھا۔ ان تمام تر مصائب کے باوجود سیدہ زینبؑ ذہنی طور پر خود کو جہاد کے دوسرے مرحلے کیلئے تیار کر چکی تھیں۔ پسماندگان کی دیکھ بھال اور حفاظت کا فریضہ بنیادی تھی۔ اہل بیت رسولؐ کی خواتین کی عزت وناموس کو قائم رکھنا تھا۔ حاکم کے ظلم کو بیان کرنا تھا۔ اپنا تعارف کروانا تھا۔ آل رسولؐ کے مقام سے لوگوں کو آگاہ کرنا تھا۔ حسینی تحریک کے خدوخال بیان کرنا تھے۔ لوگوں کے سامنے اصل حالات پیش کرنا تھے۔ بے حسی اور بے یقینی کی کیفیت کا پردہ چاک کرنا تھا۔

اسیروں کا قافلہ جب کوفہ پہنچتا ہے تو وہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ دشمن فتح کے شادیانے

نے بجا رہا تھا۔ اہل کوفہ تماشائی بنے ہوئے تھے۔ تاریخ ابن خلدون میں لکھا ہے کہ عمر بن سعد نے اپنے مقتولوں کو جمع کرا کے نماز ے جنازہ پڑھی اور انہیں دفن کرنے کی بعد کوفہ روانہ ہوا۔ امام حسینؑ کا سر مبارک اور دیگر شہداء کے کٹے سر خولی بن یزید اور حمید بن مسلم ازدی کے ہمراہ ابن زیاد کے پاس روانہ کر دیئے گئے تھے۔ شہداء کربلا کے سر دربار عام میں سر طشتوں میں رکھ کر پیش کئے گئے۔ ابن زیاد اپنی چھڑی کے ساتھ امامؑ کے دندان مبارک کو ٹھونکے مار رہا تھا اور اس موقع پر ایک صحابی رسولؐ زید بن ارقمؓ یہ کہتے ہوئے مجلس سے اُٹھ آئے کہ اے ابن زیاد اس چھڑی کو ان دانتوں پر مت مارو واللہ میں نے بار ہا دیکھا ہے کہ رسولؐ اللہ کے لب ہائے مبارک ان دانتوں اور لبوں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ زید بن ارقمؓ نے یہ بھی کہا اے گروہ عرب تم لوگ سخت نالائق ہو کہ ابن فاطمہؑ کو شہید کر کے ابن مرجانا کو اپنا حاکم بنایا جو امت کے نیک بندوں کو قتل کر رہا ہے اور شریر فتنہ انگیزوں کو سرفرازی کی خلعت دیتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ ذلت و رسوائی پر راضی ہو گئے۔ تف ہو ان پر جو ذلت و رسوائی پر راضی ہوئے۔ اس کے بعد اسیران کربلا کے عنوان کے تحت ابن خلدون کی تاریخ میں لکھا ہے:

اسکے بعد دوسرے دن عمر بن سعد اہل بیت امام کو جس میں علی ابن حسینؑ بھی تھے پا بہ زنجیر لئے ہوئے آ پہنچا۔ ابن زیاد نے تین بار زینب (بنت علیؑ) کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا، یہ کون ہے، چوتھی مرتبہ کسی نے کہا یہ زینب بنت فاطمہؑ ہیں، ابن زیاد نے مخاطب ہو کر کہا" اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے تم کو رسوا اور ذلیل کیا اور جھوٹے کو اس کے کذب کی سزا دی۔'' زینب نے جواب دیا'' اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک سے سرفراز کیا اور ہمارے بزرگوں کی شان میں آیہ تطہیر نازل فرمائی۔ یہ دنیا چند روزہ ہے یہاں کی ذلت و رسوائی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ آخرت میں فاسق و فاجر کو اللہ تعالیٰ ذلیل و خوار کرے گا اور ہم کو سرفراز و ممتاز۔'' ابن زیاد بولا۔'' کیا خوب کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی ابھی کس کو ذلیل و رسوا کیا ہے؟ کیا تمہارے خاندان والے خوار نہیں ہوئے؟'' زینب یہ سن کر رو پڑیں۔

حضرت زین العابدینؑ

ابن زیاد نے علی ابن حسینؑ کی طرف متوجہ ہوکر نام دریافت کیا جواب دیا۔ ''علی ابن حسین'' ابن زیاد نے متوجہ ہوکر کہا'' کیا اللہ تعالیٰ نے علی بن حسینؑ کو نہیں مارا ہے؟'' آپ یہ سن کر خاموش رہے پھر ابن زیاد نے کہا تم کیوں جواب نہیں دیتے؟ ارشاد کیا'' میرا ایک بھائی علی نامی تھا اُس کو لوگوں نے شہید کرڈالا ہے۔ ابن زیاد ہنس کر بولا۔'' ہاں اس کو اللہ تعالیٰ نے مار ڈالا ہے۔ آپ خاموش ہورہے پھر ابن زیاد نے کہا تم کو کیا ہوگیا ہے؟ کہ تم کچھ نہیں بولتے۔ آپ نے فرمایا'' اللّٰہ یتوفی الا نفس حین موتھا و ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللّٰہ۔'' ابن زیاد نے کہا'' واللہ تو بھی ان ہی میں سے ہے۔ پھر اس نے ایک مصاحب سے کہا۔'' دیکھو شاید یہ بالغ ہوگیا ہے اگر ایسا ہے تو میں ابھی اس سے سمجھ لیتا ہوں۔ مری ابن معاذ نے دیکھ کر کہا'' ہاں یہ بالغ ہوگیا ہے۔ ابن زیاد بولا۔'' اس کی بھی گردن مارو۔'' آپ نے فرمایا'' میرے بعد کون ان عورتوں کی کفالت کرے گا؟'' زنیب رو کر لپٹ گئیں اور ابن زیاد سے خطاب کر کے کہا اے ابن زیاد کیا تیرا جی ابھی ہماری خوں ریزی سے نہیں بھرا؟ کیا تو ہم میں ایک مرد کو بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا؟ میں تجھ سے اگر تو مومن ہے یہ کہتی ہوں کہ اگر تو اس کو قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھ کو بھی اس کے ساتھ قتل کردے'' پھر آپ نے ارشاد کیا'' اے ابن زیاد! اگر ان عورتوں میں اور تجھ میں کوئی قرابت ہو تو کسی مرد متقی باخدا کو ان کے ہمراہ کردینا کہ مسلمانوں کی طرح ان کے ساتھ رہے۔'' ابن زیاد تھوڑی دیر تک زینب کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ سمجھ کر بولا۔'' مجھے اپنے رحم پر تعجب آتا ہے واللہ اگر میں اس کو (امام زین العابدینؑ کی طرف اشارہ کرکے) قتل کرتا تو اس کو بھی (زینب کی طرف اشارہ کرکے) قتل کرڈالتا اس شخص کو عورتوں کے ساتھ رہنے کیلئے چھوڑ دو۔''

عبداللہ بن عفیف کا قتل

اس کے بعد منادی نے'' الصلوٰۃ جامعۃ'' کی ندادی۔ لوگ مسجد میں جمع ہوگئے۔ ابن

زیاد منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا۔ اثناء خطبہ میں امیر المومنین حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کو سخت سست کہا۔ عبداللہ بن عفیف ازدی والبی سے ضبط نہ ہو سکا، بول اُٹھے۔ ''اے ابن مرجانہ! کذاب ابن کذاب تو اور تیرا باپ ہے اور جس نے تجھے امیر بنایا ہے۔ اللہ کی مار تجھ پر ہو۔ نبیؐ کے نواسوں کو قتل کر کے صدیقین اور صالحین جیسی باتیں کرتا ہے۔'' ابن زیاد نے کہا ''علّی بہ'' (اس کو میرے پاس گرفتار کر لاؤ) لوگوں نے عبداللہ کو گرفتار کر لیا۔ عبداللہ یا مبرور یا مبرور'' چلا اُٹھے ارد کے چند لوگوں نے پہنچ کر چھڑا دیا۔ پھر ابن زیاد نے ان کو بذریعہ پولیس گرفتار کرا کے مسجد میں سولی دے دی۔

میر انیس نے کوفہ کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عالم اسلام بحرانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ جبر کا دور دورہ اور انسانی روح ایک کرب کے عالم میں ہے۔

کوچے بھی اُجڑ جانے سے بے ربط ہوئے ہیں — جو بھاگ گئے تھے ان سب کے مکاں ضبط ہوئے ہیں
جب دیکھیں دوڑیں چلی آتی ہیں گھروں پر
کچھ خوف سے مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ — بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ
آفت ہے محلوں پہ بپا بند ہیں بازار
کیا کیا شرفا نان شبینہ کو ہیں محتاج — کل قتل ہوا وہ جو گرفتار ہوا آج
اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے
دروازے نہیں کھولتے لٹ جانے کے ڈر سے

(انیس شناسی، انتظار حسین)

اسیرانِ کربلا کی روانگی شام

امام حسینؑ کا سر نیزہ پر رکھ کر کوفہ کی تمام گلیوں اور کوچوں میں تشہیر کرا کے اگلے دن مع ان کے ہمراہیوں کے سروں کے زحر بن قیس کے ساتھ شام کی طرف روانہ کیا تھا۔ ان دونوں میں سے جو رہے ہوں ان کے ہمراہ ایک دستہ فوج کا بھی تھا۔ عورتیں اونٹوں پر بغیر محمل کے سوار کرائی گئیں اور امام زین العابدین کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں زنجیر ڈال دی گئی۔ آپ نہ تو ہتھکڑی بیڑی اور طوق پہناتے ہوئے کچھ بولے اور نہ اثناء راہ میں کچھ ان

لوگوں سے ہم کلام ہوئے یہاں تک کہ شام پہنچ گئے۔

ابو مخنفؒ سے مروی ہے کہ ابن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن الضبابی اور خولی بن یزید الاصبحی کو بلایا۔ پندرہ سو گھڑ سواران کے ہمراہ کئے اور حکم دیا حرم رسولؐ کو قیدی بنا کر سروں کے ساتھ دمشق لے جاؤ اور تمام شہروں میں اس کی تشہیر کرو۔ قافلے کا پہلا مقام قادسیہ کے مقام پر ہوا۔

1- قادسیہ

کوفہ سے نکلنے کے بعد قادسیہ پہلی منزل تھی۔ قادسیہ اور کوفہ کے درمیان پندرہ فرسخ کا فاصلہ ہے۔

ابن عینیہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قادسیہ کے پاس سے گزرے وہاں پھول ایک عورت کو دیکھا جس نے اپنے سر کو دھویا تھا' آپؑ نے فرمایا ''قدست من ارض''تو نے زمین کو مقدس و پاکیزہ کیا ہے جس وجہ سے اس کا نام ''قادسیہ'' پڑ گیا۔ اس قادسیہ کے مقام پر 16 ھ میں عمرؓ بن خطاب کے زمانہ خلافت میں سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں مسلمانوں نے ایرانیوں سے جنگ کی اور فتح حاصل کی۔ جسے تاریخ میں بہت شہرت حاصل ہے۔

ابو مخنفؒ کہتے ہیں پھر قافلہ سَروں کے ساتھ قادسیہ سے ''جصاصہ'' کے مشرق میں گیا' جصاصہ شہر کا معجم البلدان کی کتب میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

2- تکریت

قادسیہ سے قافلے نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر تکریت شہر آباد تھا۔ صاحب المنجد کے بقول تکریت دریائے دجلہ کے دائیں کنارے اور سامرہ کے شمال میں واقع ہے۔ یہ جگہ صلاح الدین ایوبی کی جائے پیدائش ہے۔ یہاں پر گرجے اور کلیسے کافی تعداد میں ہیں۔

یاقوت نے اپنی معجم میں لکھا کہ تکریت بغداد اور موصل کے درمیان مشہور شہر ہے۔ بغداد اور تکریت کے درمیان تیس فرسخ کا فاصلہ ہے۔ وہاں دجلہ کے بالائی حصہ کی طرف مضبوط قلعہ ہے۔ سب سے پہلے جس نے یہ قلعہ بنایا تھا وہ سابور ابن بابک لما نزل المدتھا۔

اہل تکریت کے قول کے مطابق مرزبان فارس نے اس قلعہ کو بنایا جو وہاں کے عیسائی قبیلہ کے سردار کی لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ اپنے مذہب مجوسی کو ان کی شرط پر چھوڑ کر عیسائی ہوا اور اور اس لڑکی سے شادی کی جس لڑکی سے شادی کی اس کا نام ''تکریت'' تھا۔ لہٰذا اس کے نام پر اس نے اس قلعہ کا نام تکریت رکھا۔

تکریت کے بعد ملاعین قیدیوں اور سروں کو لے کر ''بر'' کے راستے ''اعمی'' گئے۔ یہ وہ مقام تھے جہاں پر قافلے رکا کرتے' یہ شہر تھے یا بستیاں تھیں یا مشہور کنویں تھے۔ معجم البلدان کی کتب میں کوئی ذکر موجود نہیں۔

3-دیر، عروہ، صلوتا

پھر ''اعمی'' سے دیر عروہ کی طرف گئے اس مقام کے بارے میں بھی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ پھر وہاں سے ''صلیتا'' پہنچے۔ صاحب منجد کے مطابق یہ سوریا کے ضلع لاذقیہ کا شہر ہے اس کو ''صافتیا'' بھی کہا گیا جس شہر کو سلطان بیبرس نے 1271ھ میں فتح کیا۔

حموی نے اپنی معجم میں ذکر کیا ہے کہ موصل کے قریب ایک شہر ہے جس کا نام ''دیر صلوبا'' ہے اس کو ''دیر صلیبا'' بھی کہا گیا ہے۔

4-وادی نخلہ

ابومخنفؒ نے کہا کہ پھر سوار اور قیدی سروں کے ساتھ ''صلیتا'' سے چلے اور ایک وادی میں داخل ہوئے جس کو ''وادی نخلہ'' کہا جاتا ہے۔ اس مقام کا بھی معجم میں ذکر نہیں۔ لیکن مازندرانی نے اپنی کتاب معالی السبطین اور علامہ دربندی نے اسرار الشہادت میں ذکر کیا ہے کہ یہاں پر قافلے والے رکے اور رات بسر کی تھی۔ جب رات چھا گئی تھی تو قوم ''جن'' کی عورتوں کو امام حسین علیہ السلام پر روتے ہوئے سنا گیا جو نوحہ پڑھ رہی تھیں' یہاں سے کوچ کر کے ''لینا'' شہر کے راستے پر ہو لئے۔ بعض معاجم نے اسے نجد کا شہر ذکر کیا ہے۔

5-لینا

سکونی کا کہنا ہے کہ مکہ سے واسط کی طرف جانے والوں کے لئے یہ چوتھی منزل ہے

یہاں بہت زیادہ سواروں والی زمین ہے جہاں کا پانی پاکیزہ ہے۔ حضرت سلیمانؑ جب بیت المقدس سے یمن جارہے تھے تو لشکر کے ساتھ جب لینا پہنچے تو شدت پیاس سے لشکر کی بری حالت تھی' شیطان حضرت سلیمانؑ کے پاس کھڑا ہنس رہا تھا' سلیمانؑ نے کہا کہ کیوں ہنس رہا ہے کہا تیرے لشکر کی پیاس کی وجہ سے جبکہ وہ سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں...... حضرت سلیمانؑ نے شیاطین کو حکم دیا کہ وہ اپنے عصا ماریں اور پانی نکالیں...... جس پر پانی نکلا' لینا لوگوں سے بھرپور آباد جگہ تھی اور جب شہداء کے سر اور اسیران کربلا کا قافلہ وہاں سے گذرا تو بوڑھے' جوان' عورتیں سب گھروں سے نکل آئے اور امام حسین علیہ السلام کے سر کو دیکھنے لگے امام حسینؑ اور ان کے نانا اور بابا پر صلوٰت اور درود وسلام پڑھنے لگے جبکہ ان کے قاتلوں پر لعنت کرنے لگے۔ وہ کہتے ہیں ''اے انبیاءؑ کی اولاد کو قتل کرنے والو ہمارے شہر سے نکل جاؤ'' اس کے بعد یزیدی لشکر نے راستے بدل لئے۔

علامہ دربندی کے بقول اسیران اس جگہ سے ''الکحیل'' شہر گئے جبکہ علامہ مازندرانی نے ''دمعہ ساکبہ'' سے نقل کیا ہے کہ اسیران ''عسقلان'' نامی شہر پہنچے۔

6- عسقلان

یہ عجمی نام ہے۔ یہ شہر فلسطین کے مضافات میں شام کا شہر ہے جو غزہ اور جبرین کے درمیان ساحل سمندر پر واقع ہے اس کو ''عروس الشام'' کہا جاتا ہے۔ اس شہر میں صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کافی عرصہ تک زندگی بسر کرتی رہی یہاں تک کہ 27 جمادی الثانی 548 ھ میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا جسے 583 ھ میں صلاح الدین ایوبی نے واپس لیا۔

علامہ مازندرانی کے بقول قافلہ حسینیؑ جب یہاں سے گزرا تھا اس وقت شہر کے امیر کا نام یعقوب عسقلانی تھا۔ یہ ان میں سے تھا جو حضرت امام حسینؑ کے خلاف جنگ کربلا میں موجود تھے۔ جب لشکر سروں اور عورتوں کے ساتھ یہاں پہنچا تو اس نے شہر کو سجانے کا حکم دیا' گانے بجانے والوں کو دعوت دی تاکہ وہ طنبور' بنسری اور دوسرے آلات لہو ولعب کے ساتھ ناچیں گائیں۔ حاکم خود محلات میں بیٹھے لہو ولعب اور شراب نوشی میں مصروف تھے

جب لشکر سروں اور عورتوں کو لے کر داخل ہوا۔ اس وقت زریر خزاعی نامی تاجر کھڑا ہو کر لوگوں کو دیکھ رہا تھا اس نے بعض سے پوچھا اس خوشی سرور اور بازاروں کو سجانے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم مسافر معلوم ہوتے ہو اس نے کہا ہاں میں مسافر ہوں۔ انہوں نے کہا عراق میں ایک شخص نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یزید کے حکم کی مخالفت کی ہے اور اس کی بیعت نہیں کی' یزید نے ان کی طرف لشکر بھیجا جس نے ان کو قتل کر دیا' یہ ان کے سر ہیں۔

اس نے کہا۔ کیا وہ کافر تھے یا مسلمان؟ انہوں نے کہا وہ اہل اسلام کے سردار تھے۔ پوچھا اس قوم کے سردار کا کیا نام تھا۔ تو انہوں نے کہا حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ اس کی ماں کا نام فاطمہ بنت رسولؐ اللہ اس کے بھائی کا نام حسن ابن علیؑ تھا۔

جب اس نے یہ سنا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی' زمین تنگ ہو گئی یہاں تک کہ قیدی قریب ہوئے تو اس نے حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کو دیکھا اور زور زور سے رویا چیخ چیخ کر گریہ کیا۔ امام علیہ السلام نے اس سے کہا میں تجھے روتا ہوا کیوں دیکھ رہا ہوں جبکہ سارے شہر والے جشن اور خوشیاں منا رہے ہیں؟ اس نے وہ خبر بتائی۔ امامؑ نے فرمایا۔ اے زریر اللہ آپ کو جزائے خیر دے میں نے تجھ میں ہمارے بارے میں محبت اور معرفت کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا مولاؑ میرے لئے کوئی حکم ہو میں اس کو پورا کروں۔ امامؑ نے فرمایا' ہاں میرے بابا حسینؑ کے سر کو اٹھانے والے سے کہو وہ سر کو عورتوں سے دور لے جائے تاکہ عورتوں کا پردہ محفوظ ہو جائے۔ اس نے کہا میں اس کے پاس گیا۔ میں نے سر حسینؑ اٹھانے والے کو ایک مثقال سونا دیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ سر کو عورتوں سے آگے لے جائے۔ اس طرح تھوڑی دیر کیلئے عورتوں نے دیکھنے والوں کی تماشائی آنکھوں سے آرام پایا۔

اس کا کہنا ہے میں امامؑ کی طرف لوٹ آیا اور عرض کی مولاؑ کوئی اور حکم ہو تو فرمائیں' آپؑ نے فرمایا ہاں اگر تیرے پاس ضرورت سے زیادہ کپڑے ہوں تو مجھے ان کی ضرورت ہے۔ میں گیا اور عورتوں کیلئے چادریں اور امام کیلئے عمامہ لیکر حاضر ہوا۔ یہاں تک کہ اونٹ اٹھ کھڑے ہوئے' بازار میں چیخ و پکار بلند ہوئی۔ میں نے دیکھا یہ شمر لعین ہے میری غیرت نے مجھے جھنجھوڑا میں اس کی طرف گیا' اس کو گالی دی اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر میں نے

کہا۔ اللہ تعالیٰ کی تجھ پر لعنت ہو یہ کس کا سر ہے جو تو نے نیزے پر بلند کر رکھا ہے اور قیدی عورتیں کون ہیں جن بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کو بے پالان اونٹوں پر سوار کر رکھا ہے۔ اللہ تیرے ہاتھ پاؤں کو کاٹے تیرے دل اور آنکھوں کو اندھا کرے۔ ملعون غصہ میں آ گیا اور اس کے ساتھیوں نے زریر کو بہت مارا اس پر پتھر برسائے۔ عسقلان میں ایک مقام ''مشہد راس الحسین'' کے نام سے ہے۔

7-الکحیل

علامہ دربندی کی روایت کے مطابق قافلہ نے لینا سے الکحیل کا راستہ لیا۔ یہ ایک جزیرہ کے ساتھ واقع ہے۔ احمد بن طیب فلسفی نے کہا کہ تکریت کے اوپر مغرب کی جانب دجلہ اور زابین کے درمیان ایک بڑا شہر ہے جس ''المعتضد'' کے سفرنامہ جنگ میں ذکر ملتا ہے۔ لیکن آج اس کا نام ونشان تک موجود نہیں۔

8-جہینہ

اس کے بعد جھینۃ آئے یہ موصل کے نواح میں بہت بڑی بستی ہے جو موصل سے بغداد جانا چاہے تو یہ پہلی منزل ہے۔ زمانہ رسولؐ کی جنگوں میں قبیلہ جھینۃ کا ذکر موجود ہے۔

9-الموصل

راویوں کا کہنا ہے کہ یزیدی لشکر جب قیدیوں اور سروں کو لے کر موصل کے قریب پہنچا تو عمر بن سعد یا دوسری روایت کے مطابق شمر نے والی موصل کو لکھا کہ وہ ملاقات کرے اور زادراہ اور جانوروں کیلئے چارہ مہیا کرے' والی خط ملتے ہی شہر میں نکلا اور اعلان کر دیا۔ جھنڈے لہراؤ شہر کو سجاؤ ہر طرف سے لوگوں کو بلاؤ والی ان کے استقبال کیلئے شہر سے چھ میل باہر تک گیا۔

علامہ مازندرانی کے مطابق والی نے شہر کی بڑی بڑی شخصیات کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ کیا ان کے سامنے خط رکھا۔ شہریوں نے اس لشکر والوں کو شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی اور یہ پوچھا وہ سروں کے ساتھ اس شہر میں کیوں داخل ہونا چاہتے ہیں' ان کو کہا گیا یہ

گروہ خوارج کے سر ہیں جنہوں نے امیر یزید کے خلاف خروج کیا۔ عبیداللہ ابن زیاد نے ان کو قتل کر دیا اور اب ان کے سروں کو یزید کی طرف روانہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا نہیں ہر گز نہیں یہ سر تو حسین ابن رسولؐ اللہ کا ہے۔ ان سب نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ وہ ان لوگوں کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ لہٰذا اس نے شمر کو لکھ بھیجا کہ:

''شہر والے علی ابن ابیطالبؑ کے محبّ ہیں مجھے خطرہ ہے کہ اگر تم شہر میں داخل ہوئے تو فتنہ کھڑا ہو جائے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم شہر کے باہر پڑاؤ ڈال لو اور ہم زادراہ اور چارہ لے کر وہاں آپ سے ملاقات کریں گے۔''

شمر نے یہ بات قبول کی اور موصل سے ایک فرسخ کے فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈالا، بچوں عورتوں اور سروں کو اتارا، امام حسین علیہ السلام کے سر کو نیزے کی انی سے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیا اس پتھر پر آپ کے خون اقدس کا قطرہ گر گیا، جو ہر سال دسویں محرم کو اُبل پڑتا ہے۔ زائرین ہر سال روز عاشور اس کے گرد اکٹھے ہوتے ہیں وہاں پر مجلس عزا اور ماتم کرتے ہیں۔

یہ پتھر عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک وہاں رہا اس نے اس پتھر کو منتقل کرنے کا حکم دیا اس کے بعد وہ پتھر نہیں دیکھا گیا۔ لیکن اس مقام پر ایک گنبد قبہ بنا دیا گیا جس کو ''مشہد النقطہ'' کہا جاتا ہے۔

حلب سوریا میں مشہد نقطہ کی زیارت ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جہاں پچھتّر سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ وہ پتھر تقریباً 30x20 سینٹی میٹر ہوگا۔ جس پر شہید کے سر کے خون کی سُرخی واضح دکھائی دیتی ہے۔

موصل عراق کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ جہاں سے خراسان، ایران، اذربائیجان اور دنیا کے دیگر شہروں کی طرف راستہ نکلتا ہے۔ موصل کو موصل اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دریائے دجلہ اور فرات کو ملاتا ہے۔ اس کے مشرق میں نینویٰ موجود ہے۔ وسط شہر میں حضرت جرجیس نبی خداؑ کی قبر ہے۔ راویوں کا کہنا ہے جب یزیدی لشکریوں نے موصل کے لوگوں کے تیور دیکھے تو شہر میں داخل نہ ہوئے اور تلعفر شہر کے راستے پر ہو لئے۔

10- تلعفر

عمرؓ بن خطاب کے دور خلافت میں عیاض ابن غنم نے اس شہر کو فتح کیا جب حضرت امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے تو آپ کا سر اقدس اس شہر سے گزرا جس کو ابی مخنفؒ نے اپنی کتاب مقتل مطبوعہ نجف اشرف میں ذکر کیا ہے۔

تلعفر ایک تاریخی شہر ہے۔ جس میں ماقبل تاریخ کی عمارتیں اور مقامات موجود ہیں۔ میلاد مسیح سے پہلے ہزاریہ میں اشنوری سوم کے زمانہ میں اس کی اہمیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب مختلف اقوام اور قبائل نے آکر یہاں سکونت اختیار کی۔ تل عفر کا پرانا نام تل الرماح ہے۔ قافلہ اسیران آلؑ محمدؐ تلعفر کے بعد جبل سنجار میں لایا گیا۔

11- سنجار

سنجار نامی شہر عراق، شام اور مشرقی مصر میں موجود ہیں۔ عراقی شہر سرسبز شاداب تھا اور وجہ سے قافلے یہاں پڑاؤ ڈالتے تھے تاکہ چارہ اور زادراہ حاصل کرتے اور دوسری جگہوں سے آنے والے قافلوں سے ملاقات بھی ہو جاتی۔

مشہور ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جب اس مقام پر پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ ''سن جبل جار'' ہے جو بعد میں سنجار کے نام سے مشہور ہوا۔ نام کی اور بھی وجوہات ذکر ہوئی ہیں۔

یزیدی لشکر کی کوشش تھی، امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہلبیتؑ کی توہین کیلئے آباد اور کثیر آبادی والے شہروں سے گزارا جائے۔ لہٰذا یزیدی قافلہ آلؑ محمدؐ کو اس شہر سے بھی لے کر گزرے۔

12- نصیبین

اس مقام سے اسیران کربلا کا قافلہ جبل سنجار سے نصیبین پہنچا۔ موصل اور شام کے راستے پر واقع ہے۔ سنجار اور اس کے درمیان نو فرسخ کا فاصلہ ہے یہ ایک سرسبز و شاداب شہر ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ معراج کے سفر میں حضورؐ نے جبرائیل امین سے اس شہر کے بارے میں سوال کیا تھا اور آپؐ نے دعا کی اے اللہ اس شہر کو جلد فتح کر اور اس میں مسلمانوں کیلئے برکت عطا فرما۔

علامہ مازندرانی نے کامل بہائی سے نقل کیا ہے جب سروں کا قافلہ نصیبین کے قریب پہنچا تو اس شہر کے امیر منصور ابن الیاس کو خبر دی گئی' اس نے شہر کو سجانے اور خوشیاں منانے کا حکم دیا۔ جب شہر سجایا جا چکا اور ملاعین نے شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو وہ ملعون جس کے پاس امام حسینؑ کا سر تھا وہ شہر میں داخل ہونے لگا تو سر اقدس والے گھوڑے نے شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا' گھوڑا بدک گیا' وہ بھی نہ چلا کئی گھوڑے بدک گئے لیکن وہ شہر میں داخل نہ ہوئے اس دوران سر اقدس نیزے سے زمین پر گر پڑا۔ ابراہیم موصلی نے اس کو اٹھایا اور جب غور سے دیکھا اس کو پہچانا کہ یہ تو امام حسین علیہ السلام کا سر ہے' اس نے ان کو لعن طعن ملامت کی اس پر اہل شام نے حملہ کر کے اسے شہید کر دیا' مجبوراً سر اقدس کو شہر کے باہر ہی رکھنا پڑا۔

ابو مخنفؒ کا کہنا ہے پھر وہ نصیبین میں اترے' قیدیوں اور سروں کا تماشا کرایا جب جناب زینب علیہا السلام نے یہ بدترین منظر دیکھا' کہ لوگوں کا ہجوم آپ کی سواری کے گرد خوشیاں منا رہا تھا تو بی بی نے یہ اشعار پڑھے......!

''کیا تم ہماری تشہیر کر رہے ہو جبکہ ہمارے جد پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی......تم نے عرش کے پروردگار کی نافرمانی کی اور پھر اس کے نبیؐ کی نافرمانی گویا کہ تمہارے زمانے میں رسولؐ آئے ہی نہیں۔''

13- عین الورد

علامہ دربندی نے ابی مخنفؒ سے نقل کیا ہے کہ پھر قیدیوں کو عین الورد کے مقام پر لایا گیا۔ جب قافلہ ''دعوات'' کے مقام پر پہنچا تو دعوات کے والی کو یزیدی لشکر کے سربراہ نے خط لکھا کہ ہمارے ساتھ ملاقات کرو کیونکہ ہمارے پاس امام حسینؑ کا سر ہے۔ جب اس نے خط پڑھا تو نقارچیوں کو نقارے بجانے کا حکم دیا اور خوشیاں مناتے ہوئے ان کا استقبال کیا' سروں کو نیزوں پر بلند کیا گیا اور ''باب الاربعین'' سے داخل ہوئے۔ رحبہ نامی مقام پر آرام کرنے کیلئے سر اقدس والے نیزے کو نصب کر دیا۔ زوال ظہر سے نماز عصر تک یہاں قیام کیا' شہر کا ایک گروہ گریہ کرتا جبکہ دوسرا گروہ ہنستا اور خوشیاں مناتا اور اعلان کرتا یہ خارجی ہے جس

نے امیر یزید بن معاویہ کے خلاف خروج کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رحبہ کے جس مقام پر آپؑ کا سر اقدس رکھا گیا' وہاں کوئی بھی صاحب حاجت آ کر دعا کرے تو یقیناً دعا قبول ہوتی ہے اور روز قیامت تک قبول ہوتی رہے گی۔

14- قنسرین

ابو مخنفؒ نے کہا کہ قافلے کی اگلی منزل قنسرین تھی جو ایک آباد بستی تھی جب یہاں کے باشندوں تک قافلے کی آمد کی خبر پہنچی تو انہوں نے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور ان پر لعنت کرتے ہوئے پتھر مارنے شروع کر دیئے اور کہنے لگے اے انبیاء کی اولاد کے قاتلو! اے فاسقو! اے فاجرو! خدا کی قسم ہم آپ کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضرت اُم کلثومؑ نے یہ منظر دیکھا تو رونے لگیں اور یہ اشعار پڑھے......!

''تم نے ہمیں بے پالان اونٹوں پر سوار کیا' گویا ہم ملک روم کی قیدی عورتیں تمہارے شہر میں ہیں...... کیا ہمارے نانا اللہ کے رسولؐ نہیں' تم پر ہلاکت ہو اے بدترین تم پر اللہ کا عذاب ہو۔''

بحار الانوار میں مناقب سے منقول ہے صاحب مناقب نے الخصائص سے نقل کیا ہے جب وہ لوگ امام حسین علیہ السلام کے سر کے ساتھ یہاں پہنچے اور پڑاؤ کیا اس منزل کو قنسرین کہتے ہیں' ایک راہب نے اپنے کلیسا سے سر اقدس کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نور ہے جو سر اقدس سے نکل کر آسمانوں کی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے یزیدیوں کو دس ہزار درہم دے کر سر مبارک کو رات اپنے پاس رکھنے کیلئے کلیسا میں داخل ہوا۔ اس نے کسی کی آواز کو سنا لیکن آواز دینے والے کو نہ دیکھ سکا۔ جو یہ کہہ رہا تھا تیرے لئے خوشخبری ہو' خوشخبری ہے اس کیلئے جس نے تیرے حق اور تیری حرمت کو پہچانا' راہب نے سر کو اٹھا لیا اور کہا اے میرے پروردگار تجھے حق عیسیٰؑ کا واسطہ اس سر کو میرے ساتھ کلام کرنے کا حکم دے' سر اقدس سے آواز آئی......!

اے راہب کیا چاہتے ہو؟ پوچھا تم کون ہو؟ فرمایا میں محمد المصطفیٰؐ کا بیٹا ہوں' میں علی مرتضیٰؑ کا بیٹا ہوں' میں فاطمۃ الزہراؑ کا بیٹا ہوں' میں کربلا کا مقتول ہوں' میں مظلوم ہوں' میں

پیاسا ہوں‘ یہ کہا اور چپ ہو گیا۔ راہب نے اپنے چہرے کو سر اقدس کے چہرے پر رکھ دیا اور کہا میں اس وقت تک سر نہیں اٹھاؤں گا جب تک تو یہ نہ کہے کہ روز قیامت میں تیری شفاعت کروں گا۔ سر سے آواز بلند ہوئی۔ تم میرے نانا کے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ راہب نے کہا ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ“ آپؑ نے اس کی شفاعت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ جب صبح ہوئی تو یزیدیوں نے اس سے سر اور درہم لے لئے جب وادی میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام درہم اللہ کے حکم سے پتھر بن چکے ہیں۔

قنسرین میں ایک پہاڑ ہے جہاں پر حضرت صالح نبی کی قبر ہے اور اسی پہاڑ پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی کے پاؤں کے نقش بھی موجود ہیں۔ یاقوت کے قول کے مطابق حضرت صالحؑ کی قبر یمن میں ہے۔ بعض کے قول کے مطابق مکہ مکرمہ میں جب کہ صحیح قول کے مطابق نجف اشرف میں ہے۔ جس کا تذکرہ حضرت علی علیہ السلام کی زیارت کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ”السلام علیکم وعلی ضجیعیک آدم ونوح وعلی جاریک ھود وصالح“ آپ پر سلام ہو آپ کے پہلوؤں میں دفن حضرت آدمؑ اور نوحؑ پر سلام ہو اور آپ کے پڑوسی حضرت ہودؑ اور صالحؑ پر سلام ہو۔“

حموی کے قول کے مطابق خبر مشہور ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو وحی کی کہ ان تین شہروں میں سے کسی ایک کی طرف ہجرت کر جاؤ مدینہ‘ بحرین یا قنسرین۔ اس شہر کو شام کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔

15- معرۃ النعمان

علامہ دربندی کے بقول یزیدی لشکر قیدیوں اور سروں کو لے کر قنسرین سے معرۃ النعمان پہنچا۔ یہاں پر ان کا استقبال کیا گیا ان کیلئے دروازے کھول دیئے گئے۔ کھانے پینے کو پیش کیا گیا اور باقی دن وہ یہیں رہے۔ اس کے قریب ہی دیوار شہر کے پاس حضرت یوشع بن نون نبی خدا کی قبر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی قبر اردن کے شہر نابلس میں ہے۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ عبداللہ ابن عمار ابن یاسر کی قبر بھی ہے۔ یہ شہر حلب‘ حمص اور حماۃ کے قریب مشہور اور پرانا شہر ہے۔ جس کو نعمان الملقب ساطع بن عدی بن غطفان کے نام پر

نعمان رکھا گیا تھا۔

16-المعری

مشہور و معروف فلسفی، طبیب، ادیب اور شاعر ابو العلاء احمد ابن عبداللہ ابن سلیمان معریٰ کے نام سے یہ شہر موسوم ہے۔ جس کے بارے میں مختلف متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ جس کے علم و فضل کی وجہ سے دوست اور دشمن بہت زیادہ تھے۔ فرزند زہراؑ کے سر اقدس اور قیدیوں کو اس شہر میں لایا گیا۔

17- شیزر

یہ سوریا کا ایک پرانا شہر ہے جس کو 38ھ میں ابو عبیدہ بن جراح نے فتح کیا تھا۔ راویوں کے بقول قافلہ آلِ محمدؐ اور سروں کو یزیدی لشکر معریٰ بن نعمان سے شیزر لے کر آئے۔ اس شہر میں ایک بہت ہی بزرگ شخص رہتے تھے جس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم یہ حسینؑ کا سر ہے۔ جب لوگوں نے یہ سنا تو انہوں نے قسم کھائی کہ سروں کو اٹھانے والے ملعونوں کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ سب نے مل کر ایک دوسرے کی مدد کی اور ان کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔

18- کفر طاب

یہ حلب اور معرۃ کے درمیان شہر ہے جہاں کے لوگ بارشوں کا پانی جمع کر کے پیتے تھے کیونکہ اس جگہ پانی نہ تھا۔ کہا گیا کہ یزیدی لشکر شیزر سے کفر طاب پہنچا۔ علامہ دربندی کے بقول یہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا، شہر والوں نے یزیدیوں کیلئے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ خولی ملعون ان کے پاس گیا اور کہا کیا تم ہماری اطاعت میں نہیں ہو، ہمیں پانی پلاؤ تو انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم آپ کو ایک قطرہ بھی پانی نہیں دیں گے تم نے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کیا تھا۔ کچھ دیر بعد یزیدی فوج وہاں سے چل پڑی۔

19- سیبور

مورخین کے قول کے مطابق یزیدی فوج قیدیوں اور سروں کو لے کر سیبوں شہر پہنچی۔

علامہ مازندرانی کے قول کے مطابق شہر والوں نے یزیدی لشکریوں پر اپنے شہر کے دروازے بند کر دیئے۔ شہر کے ایک بزرگ نے شہر کے بزرگوں اور نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور کہا اے میری قوم اللہ تعالیٰ فتنہ وفساد کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سر تمام شہروں سے گزرا ہے اور کسی ایک نے بھی رکاوٹ نہیں ڈالی تم ان کو شہر سے گزرنے دو' نوجوانوں نے کہا خدا کی قسم ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ پھر نوجوان تلواریں سونت کر نکلے۔ خولی ملعون نے کہا تمہاری طرف سے ہم پر حملہ؟ یہ کہنا تھا کہ نوجوانوں نے اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا دونوں طرفوں سے شدید جنگ ہوئی۔ طرفین کے بہت سے لوگ مارے گئے حضرت اُم کلثوم علیہا السلام نے پوچھا اس شہر کا کیا نام ہے۔ بتایا گیا ''سیبور'' بی بی نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے پانیوں کو میٹھا کرے۔ ان کیلئے چیزوں کو سستا کرے' ظالموں کو ان سے دور رکھے۔ اگر ساری دنیا بھی ظلم وجور سے بھر جائے پھر بھی انہیں عدل وانصاف میسر رہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام جب اس شہر میں داخل ہوئے تو یہ شعر پڑھ رہے تھے......!

''اے لوگو! اس سے بڑھ کر اور زمانہ کیا آئے گا۔ کیا یہی عجیب بات ہے کہ اس سے کوئی عجیب تر نہیں کہ آلِ رسولؐ تو اونٹوں پر ننگے سَر ہے اور آل مروان پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔''

20-حماۃ

سوریا کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر جس کو تاریخی اور جغرافیائی طور پر مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں پر اسماعیلی فرقے کے لوگ کافی ہیں۔

یزیدی لشکر سیبور سے حماۃ پہنچا۔ علامہ مازندرانی نے اپنی کتاب معالی السبطین میں ذکر کیا کہ جب قافلہ حماۃ پہنچا تو شہر والوں نے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور فصیل پر چڑھ گئے اور کہا خدا کی قسم جب تک ہم میں آخری شخص بھی زندہ ہے تم کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ جب ملعونوں نے یہ سنا تو وہاں سے آگے کوچ کر گئے۔

بعض ارباب مقاتل کے بقول حماۃ کے باغات میں سے ایک باغ میں ایک دیوار پر

پردے آویزاں ہیں۔ جہاں پر ایک پتھر نصب ہے جس پر خون کے نشان ہیں جو کہ جما ہوا ہے۔جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب قافلہ یہاں سے گزرا تھا تو امام حسینؑ کے سر اقدس کو اس پتھر پر رکھا گیا تھا۔ دمشق جانے والے لوگوں نے اس کو دیوار میں نصب کر دیا۔

21- حمص

ابو مخنفؒ کے بقول اسیروں کا قافلہ حماۃ سے حمص پہنچا۔ والی حمص کو یزیدی سپاہ کے امیر نے خط بھیجا کہ ہمارے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا سَر ہے۔اس وقت کے والی کا نام خالد بن نشیط تھا۔ جب اس نے خط پڑھا تو اس نے جھنڈے لہرانے کا حکم دیا۔ شہر کو سجانے اور اطراف شہر سے بھی لوگوں کو بلانے کا حکم دیا۔ خود اس نے شہر سے باہر تین میل جا کر ان کا استقبال کیا۔ سروں کو بلند کیا گیا۔ قیدیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے اعلان کیا گیا۔ جب وہ قافلے والوں کو خوشی و سرور کے ساتھ لے کر حمص کے دروازے پر پہنچے تو دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا جبکہ بعض اہل حمص ان کو پتھر مار رہے تھے یہاں تک کہ شہر کے دروازے پر چھبیس گھڑ سوار مارے گئے' شہر کے لوگوں نے لشکریوں پر شہر کے دروازے بند کر دیئے اور ان سے کہنے لگے کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو' یا ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہو گئے ہو۔ وہ شہر سے نکلے اور کنیسہ قسیس کے پاس کھڑے ہو گئے ۔ جو خالد بن نشیط اور اس کے ساتھیوں کا گھر تھا۔ وہاں انہوں نے قسم کھائی کہ وہ خولی ملعون کو قتل کر کے اس سے امام حسین علیہ السلام کا سَر اقدس چھین لیں تا کہ قیامت تک ان کیلئے یہ بات باعث فخر بن جائے جب یزیدیوں تک اس منصوبے کی خبر پہنچی تو وہ وہاں سے گئے۔

حمص شہر میں چند ایک مشہور مزارات ہیں جن میں مشہد امام علی ابن ابی طالبؑ جس میں ایک ستون پر حضرت علی علیہ السلام کی انگلی کا نشان ہے۔جس کے بارے میں کہا گیا کہ بعض نے آپ کو نیند کی حالت میں یہاں دیکھا تھا۔

یہاں پر خالد بن ولید کی قبر بھی بتائی جاتی ہے۔ یہاں پر رسول اکرمؐ کے غلام ''سنینہ'' کی قبر بھی ہے۔جس کا نام بہران بھی بتایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت علی علیہ السلام کے غلام جناب قنبرؓ کی قبر بھی ہے جبکہ

دوسری روایت کے مطابق جناب قنبرؑ اور ان کے بیٹے جن کو حجاج بن یوسف نے شہید کیا تھا اور میثم تمار کو بھی اسی نے شہید کیا تھا' کی قبور کوفہ میں ہیں۔

یہاں پر حضرت جعفر طیار ابن ابی طالبؑ کی اولاد کی قبریں بھی ہیں۔ یہاں پر مقام کعب الاحبار' مشہد ابی درداء' مشہد ابی ذر' یونان نامی شخص کی بھی قبر موجود ہے۔

یہ شہر امویوں کے حامیوں اور موالیوں کا شہر تھا۔ یہاں کے لوگ علیؑ ابن ابی طالبؑ کی دشمنی میں بہت سخت تھے۔ وہ جنگ صفین میں معاویہ کے مددگار تھے جن میں سے اکثر کو آپؑ کے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔ لیکن جب یہ جنگیں ختم ہو گئیں اور زمانے گزر گئے تو یہاں کے لوگ غالی شیعہ بن گئے اور بہت سے لوگ نصیری نظریہ کے پیروکار بن گئے۔

22-ابوفراس

یہ شہر ابوفراس حمدانی جو ناصر الدولہ اور سیف الدولہ ابن حمدان کے چچا کا بیٹا تھا کے نام پر موسوم ہے۔ یہ شخص وحید دہر' شمس الزمان تھا علم ادب وفضل' بلاغت' شجاعت' فہم و فراست حلاوۃ اور خوش بیانی میں نابغہ روزگار تھا۔ بادشاہان وقت اس کی عزت و تکریم کیا کرتے تھے اس کے مختلف موضوعات پر ہزاروں اشعار ہیں۔ جس کو جمادی الثانی 357ھ میں ایک جنگ کے دوران قتل کر دیا گیا تھا۔

علامہ دربندی نے شعبی سے روایت کی ہے کہ جب قیدیوں اور سَروں کو حمص لے جایا گیا اور وہاں کے لوگوں نے ان کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی' تو یہ لوگ سَر اقدس کے ساتھ باب الرستن سے داخل ہوئے اور جرجلن راہب کے کلیسا میں پہنچے وہاں پر انہوں نے رات بسر کی۔

لوط ابن یحییٰ نے کہا مجھے اس شہر کے کسی رہنے والے نے بتایا تھا کہ جن لوگوں نے ان یزیدیوں کے خلاف تلواریں نیاموں سے باہر نکال کر مقابلہ کرنا چاہا ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ خولی ملعون اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے ان سے سَر اقدس کو چھین کر اپنے شہر میں دفن کر دیں گے تا کہ یہ چیز دوسروں کے مقابلہ میں ہمارے لئے باعث فخر بن جائے۔

جب یہ خبر خولی ملعون تک پہنچی تو وہ وہاں سے بھاگ کر صحرا کی طرف چل پڑا۔

23۔بعلبک

قافلہ کی اگلی منزل بعلبک بیان ہوتی ہے۔ یزیدی سپہ سالار نے بعلبک کے گورنر کو خط لکھا کہ وہ شہر سے باہر نکل کر خارجی یعنی (نعوذ باللہ) حسینؑ ابن علیؑ کے سَر کو دیکھے۔

گورنر بعلبک نے لونڈیوں کو حکم دیا کہ وہ دف بجائیں' جھنڈے لہرائے جائیں باجے بجائے جائیں' خوشی اور سرور کی محفلیں سجائی جائیں۔ اپنے آپ کو آراستہ کر کے سَروں کو زعفران سے آلودہ کرو' اس نے اس حالت میں شہر سے باہر چھ میل نکل کر قافلہ کا استقبال کیا' ان کو پانی' شراب' آب جو پلایا' نشہ کی حالت میں رقص کیا' گانے گائے ایک دوسرے سے ملتے اور مستی کی حالت میں رات بسر کی۔

حضرت اُم کلثوم بنت علی علیہ السلام نے پوچھا اس شہر کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا اس کو بعلبک کہتے ہیں۔ بی بی نے بددعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اے اللہ! ان کی کثرت کو اور کھیتوں کو تباہ و برباد کر دے۔ اللہ ان کے پانیوں کو میٹھا نہ فرما' اور نہ ان کو ظلم سے چھٹکارا دے۔ جب پوری دنیا عدل وانصاف سے بھر جائے تب بھی ان کے نصیب میں ظلم و جور ہی قرار دے' جب صبح کو کوچ کرنے لگے تو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے یہ اشعار پڑھے۔

''کہاں وہ زمانہ جب شرفاء اور صاحبان عزت لوگوں کے عجائب ختم نہ ہوئے تھے اور آج ان کے مصائب ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ ہائے کب تک ہمیں کھینچا جائے گا۔ اور کب تک ہمیں اسی طرح ذلت کے ساتھ پھرایا جائے گا۔ ہمیں بے پالاں اونٹوں پر سوار کرایا گیا ہے جبکہ ہمارے غلاموں کی اولاد پردوں میں ہے۔ ہم گویا روم کی قیدی عورتیں ہیں جو کچھ حکمران نے کہا ہے وہ جھوٹا ہے اے بدترین امت تم پر ہلاکت ہو تمہارے تمام راستے بند ہوں تم نے اللہ کے رسولؐ کا انکار کیا ہے۔

علامہ دربندی ایک روایت میں فرماتے ہیں لشکر نے بعلبک میں کھانا کھانے' شراب پینے اور رقص و سرور میں مصروف صبح تک رات بسر کی اور پھر ''حی'' کے راستے پر چلتے ہوئے

مغرب کے قریب ایک راہب کے کلیسا کے قریب پہنچے اور وہاں پڑاؤ کیا اور سَر اقدس کو اس گرجا گھر کے ساتھ رکھ دیا۔

علامہ دربندی اپنی کتاب منتخب طوتیحی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے سَر حسینؑ والے نیزہ کو گرجا کی اس جانب رکھا جو اس گرجا کے راہب کے قریب تھا۔ انہوں نے ایک ہاتف غائب آواز سنی جو حسینؑ پر نوحہ کر رہا تھا۔ یہ آواز سن کر ان کے دل کانپنے لگ گئے۔ اور انہوں نے اپنے آپ سے کہا ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہم جہنمی ہیں اور ہمارے جہنمی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ جب رات چھا گئی راہب نے اپنے گرجا سے سَر اقدس کو دیکھا' کیا دیکھتا ہے اس جگہ سے ایک نور پھوٹ رہا تھا جو آسمان تک بلند ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جب دروازہ کی طرف دیکھا جو آسمان سے کھلا جس سے فرشتے اترنا شروع ہوئے۔ جو بلند آواز سے کہہ رہے تھے۔ "السلام علیکم یا ابا عبداللہ" راہب یہ منظر دیکھ کر چیخ اٹھا جب صبح ہوئی اور انہوں نے چلنے کا ارادہ کیا تو راہب نے ان سے کہا تمہارے پاس کیا ہے۔ انہوں نے کہا حسین ابن علیؑ کا سَر ہمارے پاس ہے۔ پوچھا اس کی ماں کون ہے؟ انہوں نے بتایا محمد مصطفیؐ کی بیٹی فاطمہؑ اس کی ماں ہے' راہب یہ سن کر ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہے۔

"لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" احبار نے جو کچھ کہا وہ سچ کہا تھا' انہوں نے اس سے پوچھا احبار نے کیا کہا تھا؟ کیا انہوں نے کہا تھا کہ جب یہ شخص قتل ہوگا تو آسمان سے خون کی بارش برسے گی' کیونکہ آسمان سوائے نبی یا وصی یا اولاد نبی کے کسی پر گریہ نہیں کرتا۔ پھر کہا کتنا تعجب اس پر جس نے نبی کی بیٹی کے بیٹے اور نبی کے وصی کے بیٹے کو قتل کر دیا پھر وہ اس ملعون کے پاس گیا جس کے پاس سَر اقدس تھا۔ اس سے کہا مجھے سَر دکھاؤ۔ اس ملعون نے کہا ہم سوائے یزید کے وہ بھی انعام کیلئے کسی کے سامنے اس کو ظاہر نہیں کریں گے۔ راہب نے کہا میرے پاس دس ہزار درہم کی تھیلی ہے' تمہیں دس ہزار درہم دوں گا اور اس کو میرے پاس لے آؤ۔ راہب نے درہم دے کر سر لے لیا' اور سَر کو لے کر گود میں رکھ لیا۔ سَر اقدس کے دانت مبارک ظاہر ہوئے۔ وہ اس سَر اقدس پر جھک گیا اور چومنے لگا روتے ہوئے کہتا ہے اے ابا عبداللہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے سامنے

آپؑ کے قدموں پر قربان کیوں نہیں ہوا' لیکن پھر بھی کل جب اپنے نانا کے حضورؐ پہنچو تو میری طرف سے گواہی دے دینا کہ ''گواہی دیتا ہوں سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سَر کو ظالموں کی طرف لوٹا دیا۔ قافلے والے ملعون وہاں سے چلے گئے ایک جگہ جب بیٹھ کر درہم تقسیم کرنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں وہ ٹھیکری کی صورت میں تبدیل ہو چکے ہیں اور ان پر قرآن کی آیات لکھی ہوئی ہیں......!

''وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون''

سَر اقدس کے بارے میں اس قسم کے کئی واقعات کئی مرتبہ رونما ہوئے۔ صاحب العوالم نے روایت کی ہے جب سَر حسینؑ کو شام کی طرف لے جایا جا رہا تھا' راستے میں رات چھا گئی' قافلے والوں نے یہودیوں کی عبادت گاہ کے قریب پڑاؤ کیا اور شراب پی کر مست ہو گئے۔ جب انہیں نشے نے مدہوش کر دیا تو کہنے لگے ہمارے پاس حسینؑ کا سَر ہے تو انہوں نے کہا ہمیں دکھاؤ انہوں نے دکھایا وہ جس صندوق میں تھا اس سے ایک نور آسمان کی بلندیوں تک بلند ہو رہا تھا' یہودی یہ دیکھ کر تعجب کرنے لگے' اور ان کو سَر واپس لوٹا دیا۔ اور یہودی راہب نے سَر سے کہا...... ''اپنے نانا کے حضور میری شفاعت کرنا' اللہ تعالیٰ کے حکم سے سَر اقدس سے آواز بلند ہوئی میری شفاعت امت محمدؐ کیلئے ہے اور تم محمدی نہیں ہو۔ یہودی نے یہ سن کر اپنے اہل و عیال کو اکٹھا کیا' سَر کو لے کر ایک طشت میں لے کر اس پر عطر گلاب پھینکا' کافور مشک اور عنبر کی خوشبو سے معطر کیا' اور اپنی اولاد اور رشتہ داروں سے کہا کہ محمد مصطفیٰؐ کی بیٹی کا بیٹا ہے پھر کہا ہائے افسوس ہائے افسوس میں آپ سے زندگی میں ملاقات کرتا تا کہ تیرے ہاتھوں پر اسلام قبول کرتا' اور تیرے سامنے آپ کے قدموں پر اپنی جان قربان کر دیتا۔ میں اب اسلام لے آیا ہوں۔ روز قیامت میری شفاعت فرمانا اللہ تعالیٰ کے حکم سے سَر اقدس سے فصیح و بلیغ آواز آئی اگر تم نے اسلام قبول کر لیا ہے تو میں تیری شفاعت کروں گا یہ تین مرتبہ فرمایا اور پھر خاموش ہو گئے۔ وہ شخص اور اس کے تمام رشتہ دار اسلام لے آئے۔

اس قسم کی مختلف الفاظ میں بہت سی روایات ذکر ہوئی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راستے میں بہت سے کلیسے اور عبادت گاہیں تھیں جن میں یہود و نصاریٰ کے راہب یہ مناظر دیکھ رہے تھے جو خود بھی عالم تھے جس کی بعض یزیدی لشکریوں نے بھی تائید کی ہے۔

بحار الانوار میں خرائج سے سلیمان بن مہران اعمش سے نقل کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ میں حج کے موسم میں طواف کعبہ کرنے میں مشغول تھا میں نے ایک شخص کو دعا مانگتے دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا ''اے اللہ میرے گناہ معاف فرما دے بے شک میں یہ جانتا ہوں کہ تو مجھے معاف نہیں فرمائے گا'' یہ سن کر میں کانپ گیا اور اس کے قریب گیا میں نے کہا ''اے شخص یہ حرم خدا ہے حرم رسولؐ ہے یہ دن بھی حرمت والے ہیں یہ مہینہ بھی حرمت والا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس نے کہا اے شخص میرا گناہ بہت بڑا ہے' میں نے کہا تھا تہامہ پہاڑ سے بھی بڑا ہے اس نے کہا ہاں' کیا وہ رواسی کے پہاڑوں کے ہم وزن ہے اس نے کہا ہاں' اگر تو جاننا چاہتا ہے تو میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔ میں نے کہا مجھے بتاؤ' اس نے کہا میرے ساتھ حرم سے باہر نکلو' ہم حرم سے باہر نکل آئے' اس نے بتانا شروع کیا میں لشکر یزید کے ان بد بخت سپاہیوں میں سے ہوں جو قتل حسینؑ کے وقت عمر ابن سعد کے ساتھ تھا میں ان چالیس میں سے ایک تھا جو امام حسینؑ کا کوفہ سے سَر اٹھا کر یزید لعنتی کے پاس لے کر گئے تھے جب ہم سَر اٹھا کر شام کے راستے پر سفر کر رہے تھے' تو ہم نے عیسائیوں کے ایک کلیسا کے پاس پڑاؤ کیا' سَر ہمارے اس ہی نیزے کے اوپر بلند تھا جس کے پاس ایک پہرے دار بھی موجود تھا۔ ہم نے کھانا دستر خوان پر چنا اور جب کھانا کھانا شروع کیا تو کیا دیکھتے ہیں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس نے کلیسے کی دیوار پر یہ کلمہ لکھا۔

''کیا تم لوگ امام حسینؑ کو قتل کرنے کے باوجود اس کے نانا سے روز قیامت شفاعت کی امید رکھتے ہو؟''

اس نے کہا ہم شدت سے رو پڑے ہم میں سے بعض جلدی سے آگے بڑھے تاکہ اس ہاتھ کو پکڑ لیں لیکن ہاتھ غائب ہو گیا۔ ہمارا ساتھی دوبارہ کھانے کے دستر خوان پر آیا تو پھر ایک مرتبہ وہی ہاتھ ظاہر ہوا اور اس نے کلیسا کی دیوار پر لکھنا شروع کیا۔

''خدا کی قسم روز قیامت وہ لوگ عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ان کا کوئی بھی شفاعت کرنے والا نہ ہوگا۔''

ہمارے ساتھی پھر اٹھے لیکن وہ ہاتھ پھر غائب ہو گیا وہ پھر کھانے کی طرف لوٹ آئے۔

وہی ہاتھ دوبارہ ظاہر ہوا اور اسی نے لکھنا شروع کیا۔ ظلم وستم کے حکم سے انہوں نے حسینؑ کو قتل کیا اور انہوں نے خداوند کریم کے حکم قرآن کی مخالفت کی۔

میں نے کھانے سے ہاتھ ہٹالیا اور ایک لقمہ بھی مزید نہ کھا سکا۔

اتنے میں کلیسا کے راہب نمودار ہوئے اس نے سَر اقدس سے ایک نور کو نکلتے دیکھا راہب نے پوچھا تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ کہا ہم عراق سے آرہے ہیں اور ہم نے حسینؑ کے ساتھ جنگ کی ہے۔ راہب نے کہا کیا وہ حسینؑ جو تمہارے نبی کی بیٹی فاطمہؑ کا بیٹا ہے' اور تمہارے نبی کے چچا کے بیٹے کا بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں! اس نے کہا تم برباد ہو جاؤ۔ خدا کی قسم اگر عیسیٰؑ کا کوئی بیٹا ہوتا تو ہم اس کو اپنی گردنوں پر اٹھائے پھرتے ...... لیکن تم سے میرا ایک سوال ہے۔ انہوں نے کہا' سوال کیا ہے۔ اپنے سردار سے کہو مجھے وراثت میں دس ہزار درہم ملے ہیں وہ مجھ سے لے لو اور جب تک تم یہاں موجود ہو یہ سَر اتنی دیر کیلئے مجھے دے دو' کوچ کے وقت میں یہ سَر تمہیں لوٹا دوں گا۔ انہوں نے عمر ابن سعد کو بتایا اس نے کہا اس کو سَر دیدو اور درہم لے لو وہ راہب کے پاس آئے اور کہا درہم لاؤ اور یہ سَر لے جاؤ اس نے دو تھیلیاں ان کے حوالے کیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ ہزار درہم تھے۔ عمر ابن سعد نے خزانچی اور وزن کرنے والے کو بلایا انہوں نے ان کو گنا اور وزن کر کے سنبھال لیا اور سَر ان کے حوالے کر دیا۔ راہب وہ سَر لے کر گھر گیا اسے غسل دیا صاف کیا اور مشک اور کافور سے معطر کیا پھر اسے ریشم کے کپڑے میں لپیٹا اور اپنی گود میں رکھ کر روتا رہا اور نوحہ پڑھتا رہا' یہاں تک کہ انہوں نے اس کو بلایا اور سَر واپس لے لیا۔ اس نے سَر واپس کرتے وقت سَر کو مخاطب کر کے کہا اے سَر میں سوائے اپنی جان کے کسی شے کا مالک نہیں ہوں جب کل روز قیامت ہو تو اپنے نانا محمدؐ کو گواہی دینا کہ ''بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے

اللہ کے کوئی لائق عبادت نہیں اور بے شک محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، میں آپ کے سامنے اسلام کو قبول کرتا ہوں میں آپ کا غلام اور نوکر ہوں۔"

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا میں تمہارے سردار سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں اور اسے سر واپس کرنا چاہتا ہوں، عمر ابن سعد نے اس کو بلایا اور اس سے کہا" "میں تجھ سے اللہ کے واسطے سوال کرتا ہوں محمدؐ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو کچھ تم نے پہلے اس سر پر ظلم کیا ہے وہ دوبارہ نہ کرنا اور سر کو اس صندوق سے باہر نہ نکالنا، عمر ابن سعد لعین نے اس سے کہا میں کروں گا، راہب نے سر کو واپس کیا، راہب کلیسا سے نکلا اور کسی پہاڑ کے دامن میں جا کر اللہ کی عبادت کرنے میں مصروف ہو گیا۔

عمر ابن سعد ملعون نے سر اقدس کے ساتھ دوبارہ وہی ظلم کیا جو پہلے کیا تھا۔ جب دمشق کے قریب پہنچے تو عمر ابن سعد نے اپنے سپاہیوں سے کہا یہاں قیام کرو، پھر خزانچی کو بلایا اور کہا وہ دونوں تھیلیاں لے آؤ، اس نے وہ تھیلیاں اس کے سامنے پیش کر دیں۔ عمر نے مہر دیکھی پھر اس کو کھولنے کا حکم دیا کیا دیکھتے ہیں کہ وہ دینار ٹھیکری کی صورت میں بدل چکے ہیں، جب ان کو دیکھا تو ان کی ایک جانب قرآن کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی......!

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" اور دوسری طرف لکھا ہوا تھا

"ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یفعل الظالمون"

اس نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون، خسرت الدنیا و الاخرۃ" پھر نوکروں سے کہا ان کو اٹھا کر نہر میں پھینک دو۔

سیرت کی کتب میں مورخین نے قیدیوں اور سروں کے کوفہ سے شام تک راستے کے بارے میں مختلف روایات نقل کی ہیں۔ بعض نے لشکر کے سپہ سالار کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو ان کے ہمراہ شام تک تھا، بعض نے کہا کہ وہ عمر ابن سعد تھا بعض نے کہا وہ خولی بن یزید ملعون تھا، بعض نے کہا سپہ سالار زحر بن قیس تھا۔ بعض کے بقول محفر بن ثعلبہ تھا۔ جہاں تک عمر ابن سعد کا تعلق ہے اس کے بارے میں علامہ دربندی نے روایت کی ہے کہ وہ کوفہ تک ہمراہ تھا لیکن کوفہ کے بعد قافلے کے ہمراہ تو نہ تھا لیکن ان کے پیچھے پیچھے

آخر وقت تک رہا اور لشکر کی سالاری کرتا رہا۔ ابن زیاد کی جانب سے محضر بن ثعلبہ اور زحر اور کچھ لوگ سَر حسینؑ کی حفاظت پر مامور تھے۔ جو سَر کو اٹھائے ہوئے تھے۔ اہل بیت رسولؐ پر ظلم کرنے والوں میں خولی ملعون بھی شامل تھا۔

جہاں تک بعلبک کی تاریخ کا تعلق ہے تو معاجم کی کتب میں بعلبک کے بارے میں حموی نے یوں لکھا ہے کہ وہ ایک بہت ہی پرانا شہر جس میں بہت ہی عجیب وغریب آثار قدیمہ موجود ہیں۔ جس میں بڑے بڑے محلات اور قصور ہیں۔ جن میں سے بعض شیشے کے بنے ہوئے ہیں جن کی دنیا میں کوئی مثال موجود نہیں۔ بعلبک اور دمشق کے درمیان تین دن کا سفر ہے ساحل سمندر کی طرف سے بارہ فرسخ کا سفر ذکر کیا گیا ہے۔

بعلبک کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ملکہ سبا بلقیس کے حق مہر میں شامل تھا جہاں پر سلیمان نبی کا محل تھا جو شیشہ سے بنایا گیا تھا...... یہاں پر ہی ملکہ سبا کا تخت ہوتا تھا جس کے بارے میں قرآن مجید میں یوں ذکر ہوا ہے......!

"واوتیت من کل شئی ولھا عرش عظیم"

اسی تخت کے سامنے سرخ یاقوت سبز زمرد اس کے پیچھے چاندی جس میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے تھے اس کے چار پائے تھے جن میں سے ایک سرخ یاقوت دوسرا سبز یاقوت، تیسرا سبز زمرد اور چوتھا زرد زمرد کا تھا۔ جس کا طول عرض اسی مربع ذرائع تھا۔

اسی بعلبک میں قوم بنی اسرائیل کی طرف حضرت الیاس نبی کو بھیجا گیا۔ جن کے بارے میں قرآن میں ذکر ہوا......!

"وان الیاس لمن المرسلین اذقال لقومه الا تتقون"

"بے شک الیاس رسولوں میں سے ہیں، جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔"

24- حلب

حلب ایک بہت بڑا عظیم اور وسیع شہر ہے جس کی آب وہوا بہت ہی عمدہ ہے اس نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں زجاجی کا قول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہر جمعہ کو اپنی بکریوں کا دودھ دوہنے کے بعد فقیروں میں تقسیم کر دیتے خیرات کر دیتے۔ وہ فقراء جب دودھ مانگتے تو

حلب حلب کہتے یعنی دودھ دودھ اسی مناسبت سے اس شہر کا نام حلب پڑ گیا۔

علمائے تاریخ بلدان کے بقول حلب، حمص اور برزعہ، بنی عملیق کے قبیلہ کے تین بھائی تھے۔ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے نام سے شہر آباد کیا تھا۔

کوفہ وشام کے راستے میں رونما ہونے والے واقعات کے سیاق وسباق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس راستے میں شہدائے کربلا کے سروں اور قیدیوں کا سامنا کرنے والے بعض قبائل اور شہر ایسے بھی تھے جنہوں نے آل نبیؐ کی نہ تو توہین کی اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم میں شرکت کی، اور نہ ہی یزید اور اس کے پیروکاروں کی کسی قسم کی مدد کی۔ بعض روایات کو علامہ مازندرانیؒ اور علامہ دربندیؒ نے اپنی کتاب میں نقل کیا کہ خولی ملعون نے حلب کے والی سے اسیران اہلبیتؑ اور شہدائے کربلا کے سروں کی واپسی کیلئے مدد طلب کی تھی کیونکہ ایک گروہ نے سر اقدس کو سپاہِ یزید سے چھین لیا تھا۔

حلب کے قریب جوشن نامی پہاڑ ہے۔ جو حلب کے مغرب میں واقع ہے جہاں پر شیعوں کی قبریں ہیں۔المناقب کتاب کے مولف ابن شہر آشوب کی قبر بھی وہیں موجود ہے اس پہاڑ میں سرخ تانبے کی کان بھی ہوا کرتی تھی۔اسی پہاڑ کے ایک پہلو میں ایک مقام کو مشہد السقط کہتے ہیں۔ جب اسیران حسینؑ کا قافلہ اس جگہ سے گزرا تو ان قیدی عورتوں میں ایک خاتون امام حسینؑ کی زوجہ تھی جو آپؑ کے ایک فرزند جس کا نام آپ نے محسنؑ رکھا تھا سے حاملہ تھی اور یہ حمل وہاں پر سقط ہوا جو وہاں دفن کیا گیا، اسی لئے اسے مشہد سقط کہتے ہیں۔

علامہ دربندی نے اپنی کتاب اسرار الشہادت میں ذکر کیا ہے جب خولی ملعون کو اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ وہ محاصرے میں ہیں تو انہوں نے حلب کے امیر سے مدد کیلئے فوج طلب کی اور اسے لکھا حسینؑ کا سر ان کے پاس ہے جب یہ خط والی حلب کو پہنچا اور اس بات کا علم عبداللہ ابن عمر انصاری کو ہوا یا علامہ دربندی کی روایت کے مطابق ابوالاسود والی اسے اس بات کا بہت دکھ ہوا۔ وہ بہت زیادہ روئے اور ان کے غم وحزن میں بہت اضافہ ہوا۔ کیونکہ یہ وہ شخص تھے جو زمانہ رسولؐ میں رسولؐ اللہ کیلئے تحفے تحائف لے کر مدینہ جایا کرتے تھے، اور جب تک مدینہ رہتے حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو اپنے سے دور نہ کرتے۔

اور انہیں جب یہ خبر پہنچی کہ امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا اور ان کے سَر کو یزید کے پاس لے جانے والا قافلہ حلب پہنچنے والا ہے۔ اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ جسم میں پہ لرزہ طاری تھا۔ زار و قطار رو رہے تھے ان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام درۃ صدف تھا۔ جب اس نے اپنے بابا کو اس حالت میں دیکھا تو کہتی ہے' بابا آپ کو کیا ہو گیا' کیا زمانے نے تجھ پر ظلم کیا ہے یا تیری قوم پر عذاب نازل ہوا ہے مجھے اپنی حالت کے بارے میں بتایئے تو انہوں نے اپنی بیٹی کو بتایا۔ اے بیٹی! ظالموں' بدبختوں نے امام حسینؑ کو قتل کر دیا ان کے اہلبیتؑ کو قیدی بنالیا اور اب وہ ملعون انہیں لے کر یزید ملعون کی طرف جا رہے ہیں اس کے بعد انہوں نے روتے ہوئے یہ مرثیہ کہا۔

''عزاداری کا حق ادا نہیں ہوا...... اور آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے ...... مصیبت کی وجہ سے دل اور جگر...... خون کے آنسو رو رہے ہیں...... انہوں نے حسینؑ کو قتل کر دیا...... اور حرم رسولؐ کی عورتوں کو قیدی بنالیا...... شہروں میں پھرا رہے ہیں۔ انہوں نے کربلا میں فرات کا پانی ان پر بند کر دیا اور شیطانوں نے ان پر سختی کی اور ظلم کیا۔ انہوں نے ان کے عمامہ اور قمیص کو چھین لیا اور ان کے سَر اقدس کو نیزوں پر بلند کر دیا۔''

اس کی بیٹی نے کہا اے بابا ان ہادیان راہ خدا کے قتل ہو جانے کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں خدا کی قسم اگر حالات نے ساتھ دیا تو ان کے سَروں اور قیدیوں کو آزاد کراؤں گی اور اس سَر اقدس کو چھین کر اپنے گھر میں دفن کروں گی اور پورے اہل زمین پر فخر کروں گی۔

درۃ الصدف کے ساتھ قبیلہ انصار اور قبیلہ حمیر کی ستر خواتین' حنظلہ' ابوالاسود دولی اور کچھ شامل ہوئے جنہوں نے یزیدی لشکر سے جنگ کر کے شہدائے کے سر حاصل کر لئے۔ کچھ دیر بعد جب ہر طرف سے فوج نے گھیرا ڈالا اور دوبارہ لڑائی شروع ہوئی تو درہ الصدف سمیت دیگر ساتھ شہید ہوئے اور فوجِ یزید نے کربلا کے شہداء کے سروں کو دوبارہ چھین کر دمشق کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

شام

شام اموی حکومت کا دارالخلافہ ہے جس میں قصر خلافت اور قصر معاویہ موجود تھا

جہاں پر علی ابن ابیطالبؑ کی شہادت کے بعد شیعہ زعماء ذلت کی زندگی بسر کرتے رہے۔
کفعمی کاشانی نے روایت کی ہے کہ شہیدوں کے سَر اور قیدی ماہ صفر کی پہلی تاریخ کوشام میں داخل ہوئے بنی امیہ کے نزدیک یہ عید کا دن تھا قیدیوں اور سروں کوشام کے دروازے پر تین دن تک رکنا پڑا یہاں تک کہ شہر کو آراستہ کیا گیا اس کے بازاروں کو ایسے سجایا گیا۔ جس کو آنکھ نے کبھی نہ دیکھا تھا شام کے مردوں اور عورتوں اور بچوں نے قسم وقسم کے فاخرہ لباس پہن کر سرمے اور خضاب لگا کر دف اور طبل بجا کر گانے گا کر سرکاری تقریب میں شریک تھے۔

(ماخوذ ماہنامہ رسالہ منہاج الحسین بابت جنوری تا مارچ 2004 مرتبہ علامہ محمد حسین اکبر)

شعار و ملفوظات

اب ہم سیدنا امام حسینؑ کے حوالے سے عاشور کے شعار اور رجز کے متعلق گفتگو کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ پہلے ہم لفظ شعار کا لغوی اور تاریخی پس منظر دیکھتے ہیں۔ شعار کا مطلب چلن، طریقہ، طور اور روش ہے۔ یہ لفظ کسی دیگر لفظ کے ساتھ مل کر مرکب بھی بن جاتا ہے جیسے وفا شعار یا ستم شعار۔ عادت اور طریقہ کے لحاظ سے شعار کا مطلب وہ نعرہ یا شعر ہے جو میدان جنگ میں اترتے وقت جانباز بلند کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ متحارب دستوں کے جنگجو اپنے جسم پر زرہ پہنتے تھے اور سر منہ کو آہنی خود سے ڈھانپ لیا کرتے تھے۔ سپاہی کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ چونکہ فریق مخالف کی صرف آنکھ ہی نظر آتی تھی لہٰذا فرد کی شناخت ممکن نہ ہو جاتی تھی کیونکہ نہ تو اس وقت ایک جیسی وردیوں کا رواج تھا اور نہ ہی ایک جیسی زرہ بکتر بنانے والی فیکٹریاں موجود تھیں۔ حالت جنگ میں اپنی فوج کے آدمیوں کی پہچان بھی مشکل تھی۔ اس وجہ سے ہر لشکر اپنا مخصوص نعرہ یا شعار رکھتا تھا اور سپاہی لڑتے وقت ان جملوں کو استعمال کرتے رہتے تھے تاکہ پہچانے جا سکیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کچھ بہادر لوگ دوکا یعنی DUAL شروع کرنے سے پہلے باقاعدہ اپنا تعارف کراتے۔ عرب چونکہ شعر گوئی میں ایک خاص مقام رکھتے تھے لہٰذا ہر بہادر عسکری عام طور پر ایک رباعی پڑھتا اور اشعار کے ذریعہ اپنا تعارف اور اپنے مقصد کا تعارف کرواتے ہوئے مبارزہ طلب کرتا۔ ان اشعار کو رجز کہتے ہیں۔ یہ رجز فریق اول کی طرف سے پیشگی اطلاع یعنی لڑنے کا نوٹس بھی ہوتا تھا تاکہ فریق مخالف فیصلہ کرلے کہ اسے جنگ کرنا ہے کہ نہیں۔

مدینہ کی تاریخ میں جنگ خندق کا واقع بہت اہم ہے جبکہ کفار مکہ کے بہت بڑے لشکر کے حملہ سے بچنے کیلئے مدینہ کے باہر خندق کھودی گئی تھی تا کہ مسلمانوں کو کفار کی یلغار سے محفوظ رکھا جا سکے۔ کفار میں عمرو بن عبدود بہت معروف بہادر جنگجو تھا جس کی اپنی زندگی ہی میں اس کی شجاعت نے افسانوی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ عبدود خندق عبور کرنے میں کامیاب ہوا اور اس نے مسلمانوں کے لشکر کے سامنے للکارا مارا: الا رجل الارحل یعنی کیا تم میں کوئی مرد ہے۔ اس کے شعار کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ماسوا بیس سالہ نوجوان علیؑ کے اور کسی نے جواب نہ دیا۔ اس پر عمرو بن عبدود نے یہ رجز پڑھی۔

ولقد بھھت من النداء بجمعکم ھل من مبارز ووقفت از وقعت المشیع موقف القرن المناجز۔

یعنی میں تمہیں پکار پکار کر تھک گیا ہوں اور میرا گلا ھل من مبارز (کیا کوئی جنگ کے لئے تیار ہے) کہتے کہتے درد کرنے لگا ہے اور تمہارے درمیان ایک مرد بھی نہیں ہے؟

اس لمحے حضورؐ نے حضرت علیؑ کو اجازت دی۔ علیؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس رجز کی بحر میں شعار بلند کیا۔

ولد اتاک مجیب صوتک نجیر عاجز

یعنی تیری آواز کا جواب دینے والا آ گیا ہے جو عاجز نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ علی کی ایک ضرب سے شجاعت کا پیکر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ''کل کفر کے سامنے کل ایمان جا رہا ہے'': اس قول رسولؐ کا فوری ثبوت علیؑ کی ضربت نے مہیا کر دیا۔

حسینؑ اسی طرز فکر اور قربانی کے جذبہ کا وارث تھا۔ حسینؑ نے بھی میدان جنگ میں شعار اور رجز بلند کئے۔ حسینؑ کے اہل بیت اور اصحاب نے بھی رجز پڑھے۔ ان نعروں اور اشعار میں حسینی مشن کے مقاصد کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہ شعار اور رجز حربی ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔

یوم عاشورا دو نوعیت کے شعار دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک تو خود شخصی تعارف ہے اس

کے علاوہ کچھ نہیں لیکن دوسرا اشعار فکر کی پہچان، احساس کی پہچان، نظریہ کی پہچان۔ ابا عبداللہ کا شعار خود ایک مفصل داستان ہے۔

ابا عبداللہ الحسینؑ عاشورا کے دن علیؑ مرتضیٰ پر زیادہ افتخار کرتے ہیں۔ البتہ نواسۂ رسولؐ ہونے پر بھی فخر کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ سامنے سب دشمنان علیؑ ہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ امت پیغمبرؐ ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

الموت اولی من رکوب العار

والعار اولی من دخول النار

کتاب ''عوالم'' کے مصنف ''ابن نما'' نے لکھا ہے کہ حسین ابن علیؑ دشمن کی صفوں پر حملہ کرتے ہوئے یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوبِ الْعَارِ — وَالْعَارُ اَوْلٰی مِنْ دُخُولِ النَّار
اَنَا الْحُسَیْنُ بْنُ عَلِیٍّ — آلَیْتُ اَنْ لَاۤ اَنْثَنِی
اَحْمِی عِیَالَاتِ اَبِی — اَمْضِی عَلٰی دِیْنِ النَّبِی

(ترجمہ) ''موت ذلت قبول کرنے سے بہتر ہے اور ذلت قبول کر لینا آتش جہنم میں جانے سے بہتر ہے۔ میں حسین ابن علی ہوں، میں نے قسم کھائی ہے کہ دشمن کے سامنے ہرگز سر نہ جھکاؤں گا۔ میں اپنے والد کے اہل وعیال کی حفاظت کروں گا اور نبیؐ کے دین کی راہ میں مارا جاؤں گا۔''

خوارزمی کہتے ہیں کہ: حسین ابن علیؑ اس حال میں دشمن کے مقابل آئے کہ آپؑ گھوڑے پر سوار تھے، آپؑ کے ہاتھ میں تلوار تھی، آپؑ کو اپنی زندگی کی کوئی پروا نہ تھی اور آپؑ موت وشہادت کا پکا عزم کئے ہوئے تھے اور یہ اشعار پڑھتے ہوئے آپؑ نے دشمن کی صفوں پر حملہ کیا۔

انا ابْنُ علیِّ الْخیرِ منْ آل ہاشمٍ — کفانی بھذا مفخرا حین افخرُ
وجدّی رسُولُ اللّٰہ أکرمُ منْ مضی — ونحنُ سراجُ اللّٰہ فی الْارْض نزھرُ
وفاطمۃُ امّی ابنۃُ اطْھر احمد — وعمّی یُدعیٰ ذُوالجناحین جعفرُ

وَفِينَا كِتَابُ اللّٰه اُنْزِلَ صَادِعًا   وَفِينَا الْهُدىٰ وَالْوَحْیُ بِالْخَيرِ يُذْكَرُ
وَنَحْنُ اَمَانُ اللّٰهِ فِی الْخَلْقِ كُلِّهِمْ   نَسِرُّ بِهٰذَا فِی الْاَنَامِ وَنَجْهَرُ
وَنَحْنُ وُلَاةُ الْحَوْضِ نَسْقِی مُحِبَّنَا   بِكَاْسٍ وَذَاكَ الْحَوْضُ لِلسَقِی كَوْثَرُ
فَيَسْعَدُ فِينَا فِی الْقِيَامِ مُحِبَّنَا   وَمُبْغِضُنَا يَوْمُ الْقِيٰمَةِ يَخْسَرُ

(ترجمہ) میں علی کا بیٹا ہوں جو آلِ ہاشم کی خیر میں سے ہیں اور یہی میرے لئے سب سے بڑا افتخار ہے۔ میرے جدامجد رسولِ خدا ہیں جو تاریخ کی بہترین شخصیت ہیں اور ہم اللہ کے وہ چراغ ہیں جو زمین پر روشن رہتے ہیں۔ میری ماں فاطمہؑ ہیں جو احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ بیٹی ہیں اور میرے چچا جعفر ہیں جو ذوالجناحین کے لقب سے مشہور ہیں۔ اللہ کی کتاب ہمارے پاس ہے' وہ کتاب جو ہدایت ورہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اور وحی اور ہدایت ہمارے پاس ہے جسے اچھے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم تمام مخلوقات کے لئے اللہ کی طرف سے پناہ گاہ ہیں' یہ وہ حقیقت ہے' جس کا کبھی ہم کھل کر اعلان کرتے ہیں اور کبھی پوشیدہ طور سے بتاتے ہیں۔ ہم حوض کے ساقی ہیں اور قیامت کے دن اپنے چاہنے والوں کو خاص پیالوں سے سیراب کریں گے' اور یہ حوض وہی حوضِ کوثر ہے۔ قیامت کے دن ہمارے چاہنے والے ہمارے ذریعے سعادت و کامیابی پائیں گے اور ہمارے دشمن اس دن نقصان اٹھائیں گے۔

خوارزمی مزید لکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام حملہ کرتے ہوئے یہ اشعار بھی پڑھ رہے تھے:

كَفَرَ الْقَوْمُ وَقِدْماً رَغِبُوا   عَنْ ثَوَابِ اللّٰه رَبِّ الثَّقَلَيْنِ
قَتَلُوا قِدْمًا عَلِيًّا وَابْنَهُ   حَسَنَ الخَيْرِ وَجَاءَ وَالِلْحُسَيْنِ
خيرَةُ اللّٰه مِنَ الْخَلْقِ أَبِی   بَعْدَ جَدِّی وَاَنَا ابْنُ الْخِيرَتَيْنِ

(ترجمہ) ان لوگوں نے کفر اختیار کیا اور پہلے بھی ان لوگوں نے جن

وانس کے پروردگار کے ثواب سے اپنے آپ کو دور رکھا تھا۔ پہلے بھی (ان لوگوں نے) علیؑ اوران کے نیک سیرت بیٹے حسنؑ کو قتل کیا تھا اور اب حسینؑ کو قتل کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ میرے جد امجد (رسولِ کریمؐ) کے بعد میرے والد (علی مرتضٰی) اللہ کی بہترین مخلوق تھے اور میں ان دونوں ہستیوں کا فرزند ہوں۔

شیخ طوسی اور سید ابن طاؤس لکھتے ہیں کہ امام نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے پروردگار سے ان الفاظ میں التجا کی:

"اَللّٰهُمَّ مُتَعَالَى الْمَكَانِ عَظِيْمُ" (ترجمہ) اے خدا' اے صاحب عظمت اور بلند مرتبت' اے شدید غضب والے! تیری قدرت ہر قدرت سے بڑھ کر ہے۔ تو اپنی ہر مخلوق سے بے نیاز ہے اور تیری بڑائی ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ تو قادر ہے کہ جو چاہے انجام دے۔ تیری رحمت اپنے بندوں سے نزدیک ہے۔ تیرا وعدہ سچا ہے' تیری نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ تیرے امتحان میں خوبصورتی ہے۔ اپنے ان بندوں سے تو نزدیک تر ہے جو تجھے پکارتے ہیں۔ اپنی مخلوقات پر تیری مکمل گرفت ہے۔ جو کوئی توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ تو جو بھی ارادہ کرے اسے انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے اور جو چاہے حاصل کرسکتا ہے۔ جب تیرا شکر ادا کیا جاتا ہے تو' تو شکریہ قبول کرتا ہے اور جب تیرا ذکر ہو تو تو ذکر کرنے والے کو یاد رکھتا ہے۔ میں تجھے اس حالت میں پکار رہا ہوں کہ تیری مدد کی مجھے ضرورت ہے' اور اس حالت میں تیری جانب میری توجہ ہے کہ سخت ضرورت میں ہوں۔ اس خوف کے عالم میں' میں تجھے پکار رہا ہوں اور تیرے سامنے اپنے درد وغم کے لئے گریہ وزاری کرتا ہوں اور اپنی کمزوری کے عالم میں تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں اور تجھ ہی پر میرا انحصار ہے اور تو میرے لئے کافی ہے۔

بارِ الٰہا! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان تو ہی فیصلہ کر دے۔
انہوں نے ہمیں دھوکا دیا، ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا' اور ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی۔ انہوں نے ہمیں قتل کیا جبکہ ہم تیرے نبیؐ کی عترت اور تیرے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد ہیں۔ وہ محمدؐ جنہیں تو نے اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا اور اپنی وحی کا امانت دار بنایا۔

پس اے پروردگار! ہمارے لئے مدد اور راہِ نجات نازل فرما' اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے۔"

امامؑ نے ان جملات پر اپنی مناجات ختم کی کہ:

"...... صَبراً عَلٰی قَضائِکَ یا رَب" (ترجمہ) بارِالٰہا! ہم تیری قضاو قدر کے سامنے صابر و شاکر ہیں' تیرے سوا کوئی معبود نہیں' اے فریاد کرنے والوں کے فریاد رس' تیرے سوا میرا کوئی پالنے والا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معبود ہے' میں تیرے حکم پر صبر کرنے والا ہوں۔ اے اس کی مدد کرنے والے جس کا کوئی مددگار نہ ہو' اے ہمیشہ زندہ رہنے والے جس کا کوئی اختتام نہیں ہے' اے مُردوں کو زندہ کرنے والے اور ہر ایک کے اعمال کے مطابق اس کا حساب کرنے والے' تو ہی میرے اور ان (لوگوں) کے درمیان فیصلہ فرما اور تو ہی فیصلہ کرنے والوں میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔"

پھر جب خاک پر اپنا چہرہ رکھا تو فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَفِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ (خطبات' فرمودات و مکتوبات حسین ابن علی مدینہ میں کربلا تا لیف محمد صادق نجمی۔ ترجمہ سید علی مرتضی زیدی ناشر دار الثقلین کراچی)

اپنے اعزا و اقربا و احباب و انصار کی چند گھنٹوں کے اندر اندر شہادتوں کے بعد' جب کہ ایسی صورتحال کے پیش نظر کوئی بھی جری، شجاع، سورما انسان صدموں سے نڈھال ہو سکتا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ امام کے پائے استقامت میں لغزش نہیں۔ دل چھلنی ہو چکا تھا اور جب

اس حالت میں اپنی شہادت سے پہلے امام پر اپنے اہل بیت کو الوداع کہنے کا منظر امام عالی مقام پر کتنا گراں گذرا ہوگا۔ اس المیہ کا تصور ہی دل کو ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔ امام کی جانب سے صبر و استقامت کا ردعمل ایک ایسا انسانی عمل ہے جس کی مثال انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ بیسیوں عزیزوں کی شہادت کا رنج، جسمانی تکان اور چند گھنٹے بعد خواتین اور بچے جس طویل شام غریباں کی اذیت سے گذر کر جس طویل جانگسل سفر کے بعد مدینہ پہنچیں گے، ایسے عوامل تھے جو کسی بہادر شخص کا حوصلہ توڑنے کیلئے کافی تھے لیکن استقامت اور صبر کا پیکر حسینؑ رضا الٰہی کے آخری مقام پر کھڑا اپنے دکھ درد پر فتح حاصل کر کے سرخرو ہو چکا تھا۔ امام بھی جانتے تھے اور سیدزادیاں بھی جانتی تھیں کہ اس ملاقات کے بعد مصیبتوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑے گا لیکن آل رسولؐ نے اس امتحان میں کامیاب ہو کر ذبح عظیم کے قرآنی فرمان کو پورا کرنا تھا اور یہ فرمان سیدنا اسمٰعیلؑ ہی کی اولاد کے ذریعہ پورا ہونا تھا۔ یہ بھی ایک اعزاز تھا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کا فرمان اسی خانوادہ کے ایک جلیل القدر فرزند کے ہاتھوں پورا ہو۔ اس مقام پر امام کا فرمان وصیت کی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

امام نے اہل بیت کو صبر و بردباری اور آنے والی مشکل گھڑیوں میں حوصلہ برقرار رکھنے کی تلقین کی۔ آپ نے دعا دی کہ اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو اور یقین دلایا کہ بہت جلد اللہ تمہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ کرے گا اور دشمنوں کو سخت عذاب ہوگا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ نہ تو گلہ شکوہ کرنا اور نہ کوئی ایسی بات کرنا جو تمہاری قدر و منزلت کو کم کرے۔ آپ نے یہ دعا بھی دی کہ ان مصائب کے بدلے اللہ تمہیں بیش بہا نعمتیں عطا کرے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ تھی کہ آپ نے اہل بیت کی خواتین کو خصوصی طور پر اپنے لباس کے متعلق بہت تاکید کی۔ آپ نے لباس ازر کا ذکر کیا۔ ازروہ چادر یا اوڑھنی ہوتی ہے جو پہننے والے کپڑوں کے اوپر لی جاتی ہے۔ یہ لباس سفر اور قیام دونوں وقت استعمال ہوتا ہے لیکن آپ کی تاکید سے مترشح ہوتا ہے کہ اہل بیت طاہرین کو بتایا جا رہا تھا کہ اب طویل سفر اور قید کا وقت شروع ہونے والا ہے لہٰذا تمہارے لباس سے بھی معلوم ہو جائے کہ تم کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہو اور باوقار طریقے سے چلنے پھرنے سے کسی پریشانی کا اظہار نہ

ہو۔ دشمن تو چاہے گا کہ قیدی خواتین نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ہو جائیں تا کہ ان کی بدحالی کی کیفیت سے دشمن لطف اندوز ہو سکے۔ لباس کی تاکید سے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ حسینؑ کا لٹا ہوا قافلہ ہر طرح کی تکلیف و مصیبت کے باوجود زندہ و سلامت مدینہ پہنچے گا لہٰذا حسینؑ کے اس باقی ماندہ خاندان ہی کو حسینی مشن کو آگے بڑھانا ہوگا اور یہ کام بہت کٹھن ہے کیونکہ دشمن کی چالوں اور ان کی فتح کی خبروں کا دلیل، ہوش، عقل، بردباری اور قوت ایمانی سے دینا ہوگا۔ دراصل امام کی یہ آخری ملاقات یعنی وصیت اسی مشن اور مقصد کا تسلسل تھا جس کو لے کر امام مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔

اس ملاقات کا تیسرا جزو امام حسینؑ کا امام زین العابدینؑ سے علیحدگی میں بات چیت کرنا تھا۔ ان باتوں کے متعلق امام زین العابدینؑ ہی نے آنے والی نسلوں کو آگاہ کیا ہے۔

اس آخری ملاقات کے واحد گواہ امام زین العابدین ہی تھے جنہوں نے امام کی باتوں میں سے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی بات کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا اور التجا سے ہے۔ یاد رہے کہ اس نازک، جذباتی اور تاریخی لمحے پر بھی ایک امام شہادت سے پہلے دوسرے امام کو توحید خالص، محبت و اطاعت رسولؐ اور اللہ تبارک تعالیٰ کے سامنے حاجات پیش کرنے کی وصیت فرما رہے ہیں۔

1- پروردگار کے حضور توبہ

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: جس دن میرے والد شہید ہوئے، انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگایا، جبکہ خون آپؑ کے تمام بدن سے بہہ رہا تھا، اور فرمایا: اے میرے بیٹے! یہ دعا مجھ سے سیکھ لو۔ بوقت ضرورت، کسی اہم کام، کسی پریشانی، کسی مصیبت یا انتہائی مشکل حوادث کے موقع پر اس کے ذریعے خدا کو پکارنا۔ یہ وہ دعا ہے جسے مجھے حضرت فاطمہؑ نے اور انہیں یہ دعا نبی اکرمؐ نے تعلیم فرمائی تھی اور انہوں نے اسے جبرئیل سے حاصل کیا تھا۔ پھر فرمایا:

"بحق یس والقرآن الحکیم وبحق طه و" (ترجمہ) اے وہ جو مانگنے والوں کی حاجتوں سے باخبر ہے، اے وہ جو باطن میں چھپے امور سے

مطلع ہے' اے غم واندوہ میں مبتلا لوگوں کو تسلی دینے والے' اے پریشانیوں سے دوچار لوگوں کو نجات دلانے والے' اے وہ جو عمر رسیدہ اور ضعیف افراد پر رحم کرتا ہے اور چھوٹے بچوں کو ان کا رزق دیتا ہے' اے وہ جسے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں' محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیج اور میری مشکل کو اور میرے لئے یوں' (اس موقع پر اپنی حاجت کا ذکر کرے) کر دے۔

2-بدترین ظلم سے بچو

دوسری بات کو ابوحمزہ ثمالی نے امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے والد گرامی امام سجادؑ نے اپنی وفات کے وقت مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: میں تمہیں وہی وصیت کر رہا ہوں جو میرے والد (حسین ابن علیؑ) نے اپنی وفات وشہادت کے موقع پر مجھ سے کی تھی۔ اس موقع پر ان کی وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ:

"یا بنی ایاک و ظلم من لایجد علیک ناصرا الا اللہ."

"اے میرے بیٹے! اس شخص پر ظلم کرنے سے خوف کھانا جس کا خدا کے سوا کوئی اور مددگار نہ ہو۔"

اب جبکہ ہم امام کے روز عاشور کے شعار اور رجز کا جائزہ لے رہے ہیں تو مناسب ہوگا کہ ہم ان اقوال کا احاطہ بھی کرتے جائیں جو ان کی طرف منسوب ہیں یعنی یہ وہ شعائر ہیں جن پر آپ زندگی بھر قائم رہے۔ یقیناً ان اقوال میں کچھ ایسے بھی ہونگے جو احادیث ہی کا اعادہ ہوں کیونکہ آپ نے نبی ہی کے گھرانے اور انہی کی گود میں میں آنکھ کھولی تھی اور انہیں اپنے نانا محترم سے خصوصی تعلق بھی تھا۔

1- ان اللہ یحب المعالی الامور ویبغض سفساھا۔ یعنی اللہ تبارک تعالیٰ بلند واعلیٰ کاموں کو پسند کرتا ہے اور پس وحقیر کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں جن کے راوی امام حسینؑ بتائے جاتے ہیں۔

2- الناس عبیدالدنیا و الدین لعق علی السنتھم فاذا محصو بالبلاء قل

الدیانون۔ یعنی لوگ دنیا کے بندے (غلام) ہیں اور دین انکار زبانی جمع خرچ ہے۔ جب ان پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو بہت کم دیندار نظر آتے ہیں۔

-3 ''وہ تمام اشیاء جن پر مشارق اور مغارب میں سورج چمکتا ہے، تمام دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے سمندر، خشکی، پہاڑ، میدان غرض سب کچھ اس شخص کے نزدیک کہ جس نے اللہ کی عظمت کو سمجھ لیا اور خدا کی درگاہ میں خود کو سپرد کر دیا، ایک سائے کی طرح سے ہے۔'' مزید فرمایا: ''کیا کوئی ایسا آزاد مرد پیدا نہیں ہوا جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو؟ اے لوگو! جنت کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اتنی قیمت ہو کہ تم اس کے لئے اپنی جان اور ذات بھی بیچ ڈالو۔ پس جو لوگ خدا سے فقط اس دنیا کے ملنے پر راضی ہوئے وہ پست چیز پر راضی ہو گئے۔

-4 ''علمی مذاکرے اور مباحثے معرفت میں اضافہ کرتے ہیں اور زیادہ تجربے عقل کی زیادتی کا سبب بنتے ہیں۔

-5 لایامن الامن خاف اللہ: یعنی کوئی امان نہیں سوائے اس کے جو اللہ (کے قانونِ مکافات عمل کے جاری ہونے) سے ڈرے۔

-7 القدرہ تذھب الحفیظة: یعنی قدرت انسان کی غلامی کو ختم کر دیتی ہے اور اسے بے باک بنا دیتی ہے۔

-8 اس امت کی بلاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ جب میں ان کو دعوت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتے اور جب چھوڑ دیتا ہوں تو میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سے ہدایت نہیں پاتے۔

-9 میں ذلیل و خوار ہو کر کسی کو ہاتھ دینے کو تیار ہوں (یعنی بیعت کرنے کو) اور نہ ہی غلام بن کر فرار ہونا چاہتا ہوں۔

-10 لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل ولا اقر فرار العبید۔ یعنی نہ میں ذلیل و خوار ہو کر کسی کو ہاتھ دینے کو تیار ہوں (بیعت کرنے کو) ارو نہ ہی غلام بن کر فرار ہونا چاہتا ہوں۔

11- موت جوانمردوں کیلئے کوئی عار نہیں۔ شرط یہ کہ انسان اپنے ارادہ سے حق پر ہو اور دین کی راہ میں آمادہ ہو۔

12- وعلی الاسلام السلام اذقد بلیت الامة براع مثل یزید۔ یعنی جب امت یزید جیسے کی بیعت میں مبتلا ہو تو اسلام پر میرا اسلام ہو۔

13- انی اکرہ ان ابدائھم بالقتال۔ یعنی مجھے پسند نہیں کہ میں ان لوگوں سے جنگ کرنے میں پہل کروں۔

14- تمہارے لئے بہشت کے علاوہ کوئی اور قیمت نہیں ہے۔ پس اپنے آپ کو بہشت کے علاوہ کسی اور چیز کے عوض نہ بیچو۔ جو بھی خدا سے اس دنیا کو حاصل کرنے پر راضی ہو گیا وہ پست چیز پر راضی ہوا۔

15- میرے نزدیک موت ذلت و پستی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور ذلت و پستی نار جہنم بہتر ہے۔

امام کا یہ شعار' آزادی' عزت' شرافت اور کرامت کا شعار تھا۔ امام کے شعار سے عزت نفس' عزت ایمان اور عزت یقین ٹپکتی ہے۔ امام فرماتے ہیں:

الاوان الدعی بن الرعی قدر کزبین اثنتین بین السلة والذلة یاب اللہ ذالک لنا ورسولہ والمومنون وحجور طابت وطہرت۔

(ترجمہ) امام کے مشن کی حقانیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ (ہر قسم کے ظلم و ستم کے باوجود) آپ کے مختصر لشکر میں سے ایک بھی شخص بے سروں مانی کی کیفیت سے گھبرا کر دشمن کی طرف نہیں گیا جبکہ دشمن کے لشکر سے کمانڈر حر کے علاوہ تقریباً تیس افراد امام کی تقاریر اور موقف سے متاثر ہو کر لشکر حسینی میں شامل ہو کر شہادت کے مقام پر فائز ہوئے۔

16- اے لوگو خدا نے اپنی مخلوق کو پیدا نہیں کیا مگر اس لئے کہ وہ خدا کو پہچانیں پس جب وہ خدا کو پہچان لیں گے تو اس کی عبادت کریں گے۔ اور اس کی عبادت کرنے سے

غیر کی عبادت کرنے سے غیر کی عبادت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

سید رضا علی موسوی نے کتاب خطبات امام حسینؑ میں 17 اشعار نقل کیے ہیں جن کے متعلق روایت ہے کہ امام نے یوم عاشور بطور جز پڑھے تھے۔ اس کے علاوہ امام سے منسوب بعض کلمات بھی درج کیے گئے جنہیں ہم قارئین کرام کی سہولت کیلئے پیش کر رہے ہیں۔

1- یہ قوم کافر ہو چکی ہے اور کچھ عرصہ پہلے سے یہ خداوند عالم کی رحمت سے دور ہو چکی ہے جو خدا جو جن و انس کا خدا ہے۔

2- اس گروہ نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کو اور حسنؑ ابن علیؑ کو شہید کیا وہ حسنؑ جو ماں باپ دونوں کی طرف سے کریم ہے۔

3- اور دل میں موجود بغض و عناد کے سبب سے وہ لوگ اکٹھے ہوئے تا کہ مجھ حسینؑ ابن علیؑ پر حملہ کریں۔

4- اے بندگان خدا! اے ملت اسلام! میری امداد کرو کہ میں گھٹیا لوگوں میں گھر گیا ہوں جو مجھ اہل حرمین (فرزند کعبہ اور مسجد حرام) سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

5- اس کے بعد وہ سب لوگ دو کافر اور بے دین لوگوں کی (یزید اور عبداللہ بن زیاد) خوشنودی کی خاطر مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ میں لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ وہ عقل وخرد سے کام لیں۔

6- مگر وہ ایک فاجروں کی اولاد عبداللہ بن زیاد کی خوشنودی کی خاطر وہ عبداللہ جو دو باپوں کا بیٹا ہے، قتل کرنے پر آمادہ ہیں اور اللہ سے نہیں ڈرتے۔

7- ابن سعد اپنا لشکر جرار لیکر مجھ پر اس طرح حملہ کرنا چاہتا ہے جس طرح طوفانی بارش برستی ہے اور وہ مجھے تیروں کی بارش کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔

8- ان کی مجھ سے یہ دشمنی میرے کسی جرم کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اُس وجہ سے میرے مخالف ہیں کہ میرا تعلق آسمانی عصمت کے دو درخشاں ستاروں سے ہے۔

9- ان دو ستاروں میں ایک ستارہ ''علیؑ ہیں اور دوسرے رسولؐ خدا ہیں جو عالی نصب و

ذی حسب ہیں۔

10- لوگو! خدا کے نزدیک پسندیدہ فرد میرے والد معظم ہیں۔ ان کے بعد میری والدہ ماجدہ ہیں۔ یوں میں خدا کی دو پسندیدہ ہستیوں کا فرزند ہوں اور بلند مرتبہ ہوں۔

11- میں وہ چاندی ہوں جو سونے سے لی گئی ہوں اس طرح میں وہ چاندی ہوں جو دو سونوں سے ماخوذ ہوں۔

12- جہاں بنی میں کون ہے جس کا نانا میرے نانےؐ جیسا ہو اور کون ہے وہ جس کا استاد اور تربیت دینے والا میرے باپ علیؑ جیسا ہو۔ یوں میں شمس و قمر کی تابناک کرن ہوں۔

13- فاطمۃ الزہراءؑ میری ماں ہے اور میرے والد باطل شکن ہیں۔ جنہوں نے بدر و حنین میں اپنے جوہر دکھائے۔

14- اور واقعہ احد میں میرے والد محترم کیلئے ایک نا قابل فراموش اعزاز ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے والد نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے لشکر کفار کو میدان جنگ میں ذلت و رسوائی سے دوچار کیا اور مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دیا۔

15- اس طرح غزوہ احزاب اور فتح مکہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب موت مسلمانوں پر بجلی بن کر چمک رہی تھی اور مسلم بددل ہو رہے تھے تو علی ابن ابی طالبؑ نے بہترین حکمت عملی سے دشمنوں کو شکست دے کر مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

16- یہ تمام کام میرے والد ذی وقار نے فی سبیل اللہ انجام دیئے تو اب یہ بدفطرت بدکردار امت عترت و اہل بیتؑ اطہار کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے۔ کیا یہی اجر رسالت ہے؟

17- ہمارا تعلق ایک طرف تو محمد مصطفیؐ جیسے محبوب خدا سے ہے تو دوسری طرف علی ابن ابی طالبؑ مجسمہ شجاعت سے ہے اور علیؑ وہ ہیں کہ جو لوگوں کے چہرے خوف کی وجہ سے زرد ہو جاتے تھے تو علیؑ کا چہرہ سرخ پھول کی مانند تر و تازہ ہوتا تھا۔ (کشف الغمہ، ص 139، احتجاج طبرسی، ج 2، ص 25، 26، طبع نجف اشرف، نفس المہموم، ص 218)

عبداللہ بن عمار بن یغوث کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام حسینؑ کے علاوہ کوئی بھی ایسا مغلوب نہیں دیکھا کہ جس پر بہت بھاری کثرت کے ساتھ لوگوں نے حملہ کیا ہو اور اس کے تمام اہل و عیال اور اصحاب شہید ہو چکے ہوں لیکن اس کا دل مطمئن ہو اور اس کی رفتار محکم ہو اور اس کے پاؤں میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی ہو۔ اس حال میں بھی آپ لشکر کے قلب پر حملہ کرتے تھے اور دشمن کے سپاہی تتر بتر ہو جاتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی میدان میں نہ ٹھہرتا تھا۔ عمر بن سعد نے اپنے لشکر سے کہا: ''یہ علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے۔ عربوں کے قاتل کا فرزند ہے۔ اس کو ہر طرف سے گھیر کر اس پر حملہ کرو۔ چار ہزار تیر انداز آپ پر حملہ آور ہوئے جو آپ کے اور خیام اہل بیت کے درمیان حائل ہوئے۔ تب حضرت امام حسینؑ نے فرمایا:

اے آل ابی سفیان کے شیعہ! اگر تمہارا کوئی دین نہیں۔ اگر تم آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتے تو (کم از کم) اس دُنیا میں تو آزاد رہو اور اپنے حسب کی طرف پلٹ جاؤ اگر تم عرب ہو جیسا کہ تمہارا خیال ہے۔ (جواں مردی سے کام لو)

شمر نے کہا! اے فاطمہؑ کے بیٹے تم کیا کہتے ہو حضرت امامؑ نے فرمایا تیرے ساتھ میری جنگ ہے۔ خواتین اس میں ملوث نہیں جب تک میں زندہ ہوں اپنی باغی فوج کو میرے حرم سے دور رکھو۔

حضرت امامؑ نے فرمایا:

میرے خاندان پر حملہ نہ کرو۔ بلکہ جس نے جنگ کرنی ہے وہ میرے ساتھ جنگ کرے۔ میری شہادت کا وقت نزدیک ہے اور اس کے آثار اور علامات ظاہر ہو چکے ہیں۔

شمر نے کہا۔ آپ کی اس درخواست کو قبول کرتا ہوں اور اس طرح یزیدی لشکر کے تمام فوجی جو خیام اہل بیتؑ پر حملہ کرنے والے تھے۔ انہوں نے حضرتؑ کے مقابلے میں صفیں باندھیں اور جنگ میں انتہائی شدت پیدا ہوگئی۔ حضرتؑ کی پیاس بھی بہت شدت

اختیار کر گئی۔ آپ خیام میں الوداع کہنے کیلئے تشریف لائے۔ حرم اہل بیتؑ کو الوداع کہا اور پھر دوبارہ میدان جنگ کی طرف لوٹے اور آپ کی زبان مبارک پر بار بار اس جملے کا ورد تھا۔

لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ

خدا کے سوائے کوئی بھی طاقت وقدرت نہیں ہے

ابوالحنوف جعفی نے آپ کی پیشانی پر تیر امارا۔ حضرت امامؑ نے اس تیر کو باہر کھینچا تو چہرہ مبارک پر خون جاری ہو گیا اور پھر آپ نے فرمایا۔

پروردگار! تو دیکھ رہا ہے کہ میں تیرے نافرمان بندوں میں گھر گیا ہوں۔ پروردگار تو ان میں سے ہر ایک کو چن لے اور تو انہیں جدا جدا کر کے ہلاک کر دے ان میں سے کسی ایک کو بھی زمین پر نہ چھوڑ اور انہیں کبھی بھی معاف نہ کر۔

کوفیوں پر حضرت کی نفرین

اے بدبخت و بدسرشت امت تم نے اہل بیت محمدؐ سے بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ تمہارے دامن پر بدنما داغ ہے۔ آگاہ رہو میرے قتل کے بعد تمہارے لئے کسی اور کا قتل چنداں مشکل نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی کے قتل سے خوف زدہ ہوں گے کیونکہ قتل نے تمہارے تمام مسائل حل کر دیئے ہیں قسم بخدا میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے شرف شہادت سے مشرف فرمائے اور مجھ پر تمہاری طرف سے ڈھائے جانے والے مصائب کا انتقام خدا تم سے لے گا۔

جب امامؑ نے یہ گفتگو ختم کی تو حصین نے پوچھا۔ اے فرزند فاطمہؑ خدا کس طرح ہم سے تمہارا انتقال لے گا۔ امام نے فرمایا خدا تم میں اختلاف پیدا کر دے گا اور تم ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر دو گے۔ گفتگو جاری تھی کہ ایک ظالم نے پیشانی مبارک پر پتھر مارا۔ امامؑ عالی مقام خون صاف کر رہے تھے کہ ایک ظالم نے سینہ مقدس پر تیر

مارا امام خاک پر گر گئے اور گرتے ہی فرزند رسولؐ نے خدا کے حضور التجا کی:

بنام خدا اور رسولِ اعظم کی ملت اور آئین پر یہ دن بہت بھاری ہے۔ (پھر اپنا سر آسماں کی طرف اٹھایا اور فرمایا) اے خدا تو بہتر جانتا ہے یہ ایک ایسے شخص کو قتل کرنے پر آمادہ ہیں جس کا روئے زمین پر کوئی ثانی نہیں۔

ہم نے امام حسینؑ کے اقوال کو یکجا کرنے کی کوشش میں جن کتب سے استفادہ حاصل کیا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

1- حماسہ حسینی، آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری
2- صحیفہ پنجتن، علامہ حسن رضا غدیری
3- خطبات، فرمودات ومکتوباتِ حسین ابن علی، محمد صادق نجمی
4- خطبات امام حسین، سید رضا علی موسوی

ان کے علاوہ بھی متعدد کتب سے مواد حاصل کر کے اکٹھا کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا اقوال کے علاوہ جنہیں ہم یہاں درج کرر ہے ہیں امام کی فکر سے آگاہی دینے میں ہماری مدد کریں گے۔ امام نے ابن زیاد کے لشکر کو کربلا میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''لوگ دُنیا کے بندے ہیں اور دین ان کے وردِ زبان ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ ان کی مادّی زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ لیکن آزمائش اور مصیبت کے وقت دین دار کم ہی ہوتے ہیں۔''

اقوالِ امام حسینؑ

1- جو شخص خدا کی عبادت بجالائے اور اس کی پرستش کا پورا حق ادا کرے خدا اسے اس کی ضرورت اور طلب سے کہیں زیادہ عطا کرتا ہے۔
2- جو شخص حضرت پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اہل بیتؑ کی معرفت حاصل کر کے ان کی اطاعت کا صحیح حق ادا کرے تو قیامت کے دن اسے خوشخبری دی جائے گی کہ بہشت میں جو جگہ تو چاہے تجھے اختیار ہے!

3- خدا کی عبادت کرنے والوں کی تین قسمیں:

(i) کچھ لوگ خدا کی عبادت اس کی نعمتوں اور بہشت کی طمع ولالچ میں کرتے ہیں یہ ''تاجروں'' والی عبادت ہے۔

(ii) کچھ لوگ خدا کی عبادت اس کے عذاب کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں۔ یہ ''غلاموں'' والی عبادت ہے۔

(iii) کچھ لوگ خدا کی عبادت اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بجالاتے ہیں یہ ''حریت شعار'' لوگوں کی عبادت ہے اور یہی سب سے افضل عبادت ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے لالچ یا ڈر سے خالی ہے۔

4- اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو ابن آدم کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتا: فقر و احتیاج' بیماری اور موت۔

5- حق کی راہ میں آنے والے ہر نا گوار امر پر صبر کرو اور ہدایت کا راستہ دکھانے والے ہر کام میں ہر قسم کی سختی و محرومیت کو برداشت کرو تا کہ تم خدا کے پسندیدہ بندے قرار پاؤ۔

6- قرآن مجید چار چیزوں پر مشتمل ہے: عبادات' اشارات' لطائف' حقائق: عبادات عوام الناس کے لئے' اشارات خواص کے لئے' لطائف اولیاء کے لئے اور حقائق انبیاءؑ کے لئے ہیں۔

7- اے ابن آدم! تو ایام (دنوں کے مجموعے) کی طرح ہے کہ جب ایک دن گزر جائے تو گویا تجھ میں کمی آ گئی۔

8- دنیا میں سب سے زیادہ قدر و منزلت اسے حاصل ہوتی ہے جو دنیا کے مال کی پرواہ نہ کرے خواہ وہ کسی کے بھی ہاتھ میں ہو۔

نوٹ: (ملاحظہ فرمائیں مذمت دُنیا کی نہیں کی گئی کیونکہ دُنیا ہی وہ چیز ہے جہاں نیک اعمال کمائے جاسکتے ہیں اور یہی نیک اور صالح اعمال یوم حساب سکہ رائج الوقت بنیں گے۔ یہ دُنیا وہ جگہ ہے جہاں عمل کرنے کی آزادی اور اختیار ہے لیکن حساب

نہیں ہے جبکہ قیامت کے روز صرف حساب ہوگا اور عمل نہیں ہو سکے گا۔ امام نے اس قول میں یہ کہا ہے کہ دُنیا کے لالچ سے پرہیز کرو اور اس سے وہ شے یعنی مال طلب نہ کرو جو تمہارا زادِ راہ نہیں بن سکتا۔)

-9 تین لوگوں کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرو: دین دار' اہل مروت' خاندانی بزرگی وشرافت کا مالک۔

-10 جو شخص خدا کی معصیت ونافرمانی کرتے ہوئے کوئی کام کرنا چاہے وہ اپنے مقصود و مطلوب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اور جس چیز سے وہ خوفزدہ تھا وہ اس پر آپڑے گی۔

-11 سب سے زیادہ بہتر مال و دولت وہ ہے جو انسان کی عزت و حیثیت کی حفاظت کرے۔

-12 خدا سب سے بہتر امان دینے والا ہے' جو شخص دنیا میں خدا کا خوف دل میں نہ رکھے وہ آخرت میں کیونکر اس کی امان میں آسکتا ہے۔

-13 جو شخص لوگوں کو خدا اور رسول خداؐ کی اطاعت اور اعمال صالحہ بجالانے کی دعوت دے وہی حقیقی معنی میں ''مسلمان'' کہا جا سکتا ہے اور جو سچا مسلمان ہو وہ کبھی خدا کی معصیت کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

-14 جو شخص ہر کام میں رضائے الٰہی کے حصول کا خواہاں ہو خواہ لوگ اس سے ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں خدا اسے لوگوں کے معاملات میں کفایت فرمائے گا اور جو شخص لوگوں کی رضا وخوشنودی کا طالب ہو خواہ اسے خدا کا غضب و ناراضگی ہی کیوں نہ مول لینی پڑے ایسے شخص کو خدا انہی لوگوں کا محتاج اور ان کے رحم وکرم کا اسیر بنا دے گا' انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اعمال میں صرف اور صرف خدا کی رضا وخوشنودی کو ملحوظ رکھے تاکہ خدا اسے بندوں سے بے نیاز کردے۔

نوٹ (یہ قول سورہ الزمر 24/39/36 کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ اس آیت مبارک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی نہیں؟ قرآن نے مومنین کے سامنے سوال رکھ دیا ہے اور اس سوال کو قرآن کے ذریعہ قیامت تک

محفوظ کر دیا ہے۔ امام حسینؑ کی زندگی اسی سوال کا روشن جواب ہے کہ میرے لئے بے شک اللہ تبارک تعالیٰ ہی کافی ہے)

15- قیامت کے دن کے حساب و کتاب کو ہمیشہ یاد رکھو اور جان لو کہ خدا کے ہاں تمہارا اعمال نامہ موجود و محفوظ ہے اور اس میں ہر چھوٹا اور بڑا عمل درج ہے اور خدا تمہارے کسی عمل کو نہیں بھول سکتا۔

16- دین سے دوری اختیار کرنے والا اپنی تباہی کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

17- لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر امانت میں خیانت نہ کرو۔

18- خوشامدیوں، چاپلوسی کرنے والوں' چلغوروں اور فتنہ پرور لوگوں سے دور رہنا چاہئے ورنہ وہ تمہیں بھی اپنا شکار کرلیں گے کیونکہ ایسے لوگ حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

19- ظالموں' بے دینوں' ملحدوں' ستمگروں' بدزبانی کرنے والوں' بدگوئی کرنے والوں' بدکار لوگوں اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی محفلوں میں نہ بیٹھو کیونکہ یہ سب شیطان کے پیروکار اور اس کے گروہ کے افراد ہیں۔

20- عہد و پیمان کو توڑنا انسانی شرافت کی دھجیاں اڑانے کے برابر ہے جو شخص وعدہ خلافی اور بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنی قدر خود کھو بیٹھتا ہے۔

نوٹ: (امام کا یہ قول احکام قرآن کی تفسیر ہے۔ سورہ المائدہ 06/05/01 کی پہلی آیت ہی میں اللہ تبارک تعالیٰ عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل 15/17/34 میں بھی عہد و پیمان کے وفا کا حکم ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ قول و قرار کی باز پرس ہوگی۔ ان احکام کی روشنی میں امام کا فرمان قابل غور ہے۔

21- کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا تین حالتوں کے سوا جائز نہیں: نقصان و خسارت کی حالت میں' فقر و ناداری کی شدت میں' دشواری و ناچاری کی کیفیت میں!

22- عقلا کے پاس بیٹھنا حق کو قبول کرنے کی علامت ہے۔

23- اہل کفر کے علاوہ کسی کے ساتھ تندروئی نہ کرو۔ ورنہ جاہل کہلاؤ گے۔

24- اپنی بات کو حرف آخر نہ سمجھ کر فکر ونظر کے حقائق سے آگاہ ہونا اہل علم ہونے کا ثبوت ہے۔

25- پانچ کام سب سے زیادہ برے ہیں: بوڑھے آدمی کا برے اعمال کرنا' حاکم کا رعایا کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا' شریف النفس آدمی کا جھوٹ بولنا' مالدار کا بخیل ہونا ' عالم کا مال دنیا میں حریص ہونا۔

26- سچائی عزت اور جھوٹ بولنا ناتوانی کا ثبوت ہے۔

27- رازداری ایک قسم کی امانت ہے۔

28- ہمسائیگی قرابت داری کی بہترین قسم ہے۔

29- کسی کی مدد کرنا پاک دل ہونے کی نشانی ہے۔

30- عمل تجربہ دلاتا ہے۔

31- حسن خلق عبادت ہے۔

32- خاموشی زینت ہے۔

33- طمع ولالچ، حقیقی معنی میں فقر و بے چارگی ہے۔

34- سخاوت بے نیازی عطا کرتی ہے۔

35- مدارات، عقل مندی ہے۔

36- اس شخص پر زیادتی نہ کرو جو تمہارے سامنے خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں رکھتا۔

36-A- اے فرزند! اس شخص پر ظلم کرنے سے خوف کھانا جس کا خدا کے سوا کوئی اور مددگار نہ ہو۔

37- ایسا کام ہی نہ کرو جس سے بعد میں تمہیں معذرت کرنی پڑے کیونکہ یہ مومن کا شیوہ نہیں۔

38- جو شخص خدا کی خوشنودی کے لئے ہمیں دوست رکھے تو روز قیامت وہ اور ہم دونوں

رسول خداؐ کے حضور حاضر ہوں گے اور جو شخص دنیا کی خاطر ہماری محبت دل میں رکھے تو اسے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا نیک اور برے دونوں کو مل سکتی ہے۔

39- اگر پانچ کام کر سکتے ہو تو جتنا جی چاہے گناہ کرتے رہو:

(i) خدا کا دیا ہوا رزق نہ کھاؤ اور اس کی نعمتوں سے استفادہ نہ کرو۔

(ii) خدا کے دائرہ حکومت و اختیار سے باہر چلے جاؤ' وہاں چلے جاؤ جہاں خدا نہ ہو۔

(iii) ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں خدا تمہیں نہ دیکھ سکے۔

(iv) جب عزرائیل روح قبض کرنے آئے تو اسے روح قبض نہ کرنے دو۔

(v) قیامت کے دن جب تمہیں جہنم میں ڈالا جا رہا ہو تو اس میں داخل نہ ہو۔

40- علم و دانش کی تدریس' معرفت کے بلند مرتبے کو پا لینے کے برابر ہے اور تجربات کا زیادہ ہونا عقل کو زیادہ کرتا ہے۔

41- بزرگی' تقویٰ و پرہیز گاری سے ملتی ہے اور قناعت آرام جاں فراہم کرتی ہے۔

42- جو شخص تجھے برائی سے روکے وہی حقیقت میں تیرا دوست ہے اور جو شخص تجھے غلط کاموں کی ترغیب دلائے وہ تیرا سب سے بڑا دشمن ہے اسی معیار پر دوست اور دشمن کی پہچان کرو۔

43- جب کسی عقلمند پر کوئی مصیبت و پریشانی آجائے تو وہ حزن و غم کو قوت قلب کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور اپنی عقل کو مشکلات کے حل کے لئے بروئے کار لاتا ہے۔

44- جو تیرا عطیہ قبول کر لے گا گویا اس نے تیری صفت سخاوت میں تیری مدد کی۔

45- ہمارا شیعہ وہ ہے جس کا دل ابراہیم خلیل اللہ کی طرح پاک ہو اور اس میں کسی قسم کا نفاق' کینہ و خیانت نہ پائی جائے۔

46- حقیقی معنوں میں دولت مند وہ ہے جو آرزوؤں و خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہ ہو اور خدا کے دیئے ہوئے مال پر قناعت کرے۔

47- اس سے برا کوئی نہیں جو خدا کو ناراض کر کے بندوں کو راضی کرتا پھرے۔

48- انسان کی ایک خوبی یہ ہے کہ جو کام اس سے مربوط نہ ہو اس میں مداخلت نہ کرے۔

49- قرآن مجید ظاہر میں دلکش، باطن میں عمیق اور حقائق کا خزینہ ہے۔

50- آزاد انساں چیزوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے جو اس کے اہل ہوں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کائنات کی ہر چیز جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے، خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، فنا پذیر ہے۔

51- یاد رکھو، تمہارے نفوس کی قیمت جنت سے کم نہیں۔ تم انہیں اس سے کم قیمت پر نہ بیچو۔

نوٹ (امام نے اس قول کے ذریعہ مومنین کو سورہ توبہ 10/09/111 کی طرف متوجہ کیا ہے جہاں جنت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک خاص فضل و کرم کا بیان ہے کہ اس نے مومنوں کو ان کے جان و مال کے عوض، جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیے، جنت عطا فرمادی، جب کہ یہ جان اور مال بھی اللہ عزوجل ہی کا عطیہ ہے پھر قیمت اور معاوضہ بھی عطا کیا یعنی جنت جو بہت ہی بیش قیمت شے ہے۔

52- جو شخص دنیاوی نعمتوں پر راضی ہو گیا گویا اس نے ایک معمولی شئے سے دل لگا لیا۔

53- عظمت الٰہی کا تصور دل میں لا کر آنسو بہانا جہنم کی آگ سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔

54- خوف خدا سے آنکھوں کا اشکبار ہونا اور دلوں کا لرزنا خدا کی رحمت کی نشانیاں ہیں۔

55- سابقہ نعمتوں کا شکر ادا کرنا آئندہ نعمتوں کی راہ ہموار کرتا ہے۔

56- جو شخص ہمارے غم میں اشک بہائے خداوند عالم ان آنسوؤں کے سبب اس کی آنکھوں کو روشنی عطا فرمائے گا اور اسے جنت میں جگہ عطا کرے گا۔

57- اے خدا کے بندو! خدا سے ڈرو' تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو' دنیا کے دھوکہ و فریب میں نہ آؤ کیونکہ اگر دنیا کسی سے وفا کرتی یا کوئی اس دنیا میں ہمیشہ رہ سکتا تو یقیناً انبیاءؑ دوسروں سے زیادہ اس کے حقدار تھے کیونکہ وہ خدا کے ہر فیصلے پر راضی اور قضاوقدرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں سب سے آگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا نے دنیا کو دارِ امتحان قرار دیا ہے اور اہل دنیا کو اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ ان کا انجام فنا کے سوا کچھ بھی نہیں۔

58- دنیا کی تازگی اور جدت رو بہ زوال ہے' اس کی نعمتیں مضمحل و نابود ہونے والی ہیں' اس کی خوشیاں اور مسرتیں غم واندوہ میں تبدیل ہونے والی ہیں اور اس کا ٹھکانہ عارضی و ناپائیدار ہے' دنیا ایسا بے ثبات گھر ہے جس کی بنیادیں ہمیشہ متزلزل رہتی ہیں لہٰذا تم اس میں رہتے ہوئے آخرت کا زادِ راہ اکٹھا کرو اور یاد رکھو کہ تقویٰ سے بہتر کوئی چیز زادِ راہ اور سامان سفر نہیں ہو سکتی اس لئے تقوائے الٰہی اختیار کرو تاکہ فلاح و کامیابی کی منزل پر فائز ہو جاؤ۔

59- دنیا کی تلخیوں پر صبر کرو تاکہ آخرت میں امن وسکون کی نعمت پا سکو۔

60- موت اہل ایمان کے لئے ایک ''پل'' کی طرح ہے جو انہیں سختیوں' پریشانیوں اور مشکلات سے نکال کر بہشت بریں اور ابدی نعمتوں کی سمت لے جانے کا ذریعہ ہے لہٰذا دنیا سے دل لگانے کے بجائے آخرت کی فکر کرو اور اس کے لئے زادِ راہ تیار کرو۔

61- حقیقی معنی میں دھوکہ کھانے والا شخص وہ ہے جو دنیا کے دھوکے میں آجائے اور شقی و بدبخت ہے وہ جو دنیا کی فتنہ پروریوں کا شکار ہو جائے لہٰذا دنیا کے دھوکے میں آنے سے ہوشیار رہو کیونکہ وہ اس کی امیدیں پوری نہیں ہونے دیتی جو اس پر سہارا کرے اور اس کی آس پر اپنی آخرت داؤ پر لگائے' اسے جاننا چاہئے کہ اس نے انسانی عظمت کو پامال کر دیا کیونکہ جو اس کے ساتھ دل لگائے وہ اس کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

-62 شیطان کے غلبے سے بچو کیونکہ وہ ورغلا کر انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے اور اس کے دل سے خدا کی یاد محو کر دیتا ہے۔

-63 میں موت کو سعادت وخوش بختی اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو ذلت سمجھتا ہو۔

-64 خدا اور رسول خداؐ کے دین کی نصرت وحمایت میں کوتاہی نہ کرو اور عترت واہل بیت رسولؐ کی اطاعت کا حق ادا کرو اسی میں تمہاری بہتری اور کامیابی ہے۔

-65 اگر قضاء وقدر اس کے مطابق ہوں جو ہم چاہتے ہیں تو ہم خدا کی عنایات پر اس کی حمد بجالاتے ہیں، اور اگر اس کے فیصلے ہماری مرضی وخواہش کے مطابق نہ ہوں تو جو شخص خالص نیت اور پاک ارادہ رکھتا ہو یعنی اس کا مطمح نظر صرف خدا کی رضا ہو تو وہ خدا کے ہر فیصلے پر راضی ہو کر صبر اختیار کرتا ہے اور یہی سچے مومن کی نشانی ہے۔

-66 اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور حق کو اہل حق کے لئے پہچان لو تو یہ بات تمہارے لئے خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث ہوگی اور وہ تم پر اپنی نعمتیں نچھاور کر دے گا۔

-67 جو کسی پر ظلم کرے خدا اسے ذلیل وخوار کرے گا اور اپنے قہر وغضب کا نشانہ بنائے گا کسی ایسے کو اس پر مسلط کر دے گا جو اسے ذلت ورسوائی سے دوچار کر دے۔

-68 جو لوگ ہم اہل بیتؑ کے حق سے انکار کریں وہ قیامت کے دن پیغمبر اسلام سے اس حالت میں ملیں گے جب کہ آنحضرتؐ ان پر غضب ناک ہوں گے اور خدا کا عذاب بھی ان پر چھایا ہوگا۔

-69 معاشرے کی باگ ڈور اور احکام الٰہی کا اجراء ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے جو خدا کے حلال وحرام کئے ہوئے تمام امور سے مکمل آگاہ اور ان پر امین ہوں۔

نوٹ: ملاحظہ ہو سورہ الحج 17/22/41 جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ تبارک تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح سورہ نور 18/24/55 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جب مومنین کو اس زمین میں

حکومت ملتی ہے تو وہ خوف وخطر کو امن کی حالت میں بدل دیتے ہیں۔

70- شہوت رانیوں اور غلط کاموں میں سرگرم و منہمک رہنے والوں کو اپنا حاکم نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہیں خدا کی اطاعت و پیروی کی بجائے شیطان کا پیروکار بنا دیں گے۔

71- ظالم و ستمگر حکام کے مقابلے میں حق کا دفاع کرنے پر ڈٹ جاؤ اور انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہ دو کہ وہ معاشرے میں لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنا اقتدار پختہ کرلیں۔

72- اپنے عہد و پیمان پر سختی سے پابند رہو اور وعدہ خلافی سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے معاشرتی عزت و وقار مجروح ہوتا ہے۔

73- اے لوگو! پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے ظالم حکمران کو دیکھے جو خدا کے حرام کاموں کو حلال اور حلال کو حرام کر رہا ہے' عہد الٰہی کو توڑ رہا ہو' سنت رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہو اور خلق خدا کے درمیان گناہ اور معصیت کا ارتکاب کرنے میں مصروف ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں قیام کرے اور اگر وہ اپنے قول و فعل کے ذریعے اس کے خلاف جہاد نہ کرے اور کوئی عملی اقدام نہ کرے تو خدا کا حق بنتا ہے کہ اسے اس ظالم و ستمگر کے ساتھ عذاب میں برابر کا شریک بنا دے اور اس کا انجام وہی ہو جو اس ظالم کا ہے۔

74- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک فریضہ الٰہی ہے کہ اگر اس فریضے پر عمل کیا جائے تو باقی تمام فرائض خواہ آسان ہوں یا مشکل سب کے سب پورے ہو جائیں گے۔

75- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر درحقیقت ایک پاکیزہ دعوت اسلام ہے بشرطیکہ مظالم کو دور کرنے اور ظالم و ستمگر لوگوں کے خلاف قیام کی صورت میں ہو۔

76- حق کی عظمتوں کا دفاع' احیاء و تحفظ اور بدعتوں کا قلع قمع کرنا ہر اہل دین کا فریضہ ہے جو شخص اس پر عمل پیرا ہو وہ ہدایت و کامیابی کی راہ پائے گا۔

77- کچھ کلمات ایسے ہیں کہ اگر انہیں وردِ زبان کیا جائے تو جنوں اور انسانوں میں سے کسی کا خوف دل میں پیدا نہیں ہوگا اور وہ یہ ہیں:

"بسم اللّٰه و باللّٰه وفی سبیل اللّٰه وعلی ملة رسول اللّٰه اللهم اکفنی بقوتک وحولک وقدرتک من شر کل الختال وکید الفجار فانی احب الابرار واولی الاخیار وصلی اللّٰه علی محمد واله وسلم"

پروردگار! مجھے اپنی قوت وقدرت کے ساتھ ہر دھوکہ باز' بدکار و بدکردار اور درندہ صفت شخص کے شر سے محفوظ رکھ' میں نیک وصالح اور پاک باز لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور درود ہو محمد وآل محمد پر!

78- میں شہید جور و جفا ہوں جب بھی کوئی مومن میرا ذکر کرے گا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں گے۔ مظلوم پر آنسو بہانے سے خدا کی رضا وخوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

79- ایمان اور یقین کے درمیان چار انگلیوں کے برابر فاصلہ ہوتا ہے' ایمان وہ ہے جو ہم نے کان سے سنا اور یقین وہ ہے جو ہم نے آنکھ سے دیکھا اور کان اور آگ کے درمیان چار انگلیوں کے برابر فاصلہ ہے۔

80- انسان کی عزت لوگوں سے بے نیاز ہونے میں ہے۔

81- اپنی زبان کو قابو میں رکھنا اور دوسروں پر احسان کرنا ہی فضیلت ہے۔

82- جو چیز مفید نہ ہو اس کے حصول کی کوشش کرنا بہت بڑا نقص ہے۔

83- بردباری بہترین زیور ہے' وفائے عہد اصل میں مردانگی ہے۔

84- صلہ رحمی رحمت اور سچی دوستی نعمت ہے۔

85- تکبر ناپسندیدہ صفت اور جلد بازی حماقت ہے۔

86- بلند پروازی تباہی لاتی ہے۔

87- فاسق وبدکار لوگوں کے پاس بیٹھنا تہمت لگنے کا سبب بنتا ہے۔

88- فضیلتوں کے حصول میں کوشاں رہو اور رزق حلال کمانے کی طرف قدم بڑھاؤ۔

89- کسی کا تمہارے سامنے دست نیاز دراز کرنا درحقیقت تم پر خدا کی نعمت ہے۔

90- سب سے بڑا سخی وہ ہے جو اس شخص پر احسان کرے جس کو اس سے کوئی امید نہ ہو۔

91- سب سے زیادہ عفوو درگزر کرنے والا وہ ہے جو طاقت کے باوجود معاف کردے۔

92- جو شخص کسی مومن کے کرب و پریشانی میں اس کا آسرا بنے تو خدا اس سے دنیا و آخرت کی پریشانی دور کردے گا اور اسے اپنی عنایتوں سے بہرہ ور فرمائے گا۔

93- جب کوئی شخص کسی کی غیبت، توہین اور ہتک کرنے میں مصروف ہو تو کوشش کر کے اپنے آپ کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کرلو کیونکہ اس وقت سب سے زیادہ انہی لوگوں کی عزت خطرے میں ہوتی ہے جنہیں وہ پہچانتا ہے۔

94- غیبت کرنا، سننا اور اس پر خوش ہونا ایسے گناہ ہیں جس میں سارے (سننے والے بھی) شریک ہو جاتے ہیں۔

95- سب سے بڑا جہاد، جہاد نفس ہے یعنی اپنے آپ کو خدا کی نافرمانی سے بچانا۔

96- ذلت کے ساتھ زندہ رہنے سے عزت کے ساتھ مر جانا بہتر ہے۔

97- ہر قسم کی بڑائی و کبریائی خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتی۔

98- جو چیز آپ کے لئے فائدہ مند نہ ہو اس کی بابت گفتگو ہی نہ کریں کیونکہ ممکن ہے کہ اس کا ذکر آپ کے لئے بار خاطر اور رنج و ملال کا باعث بن جائے۔

99- جب تک بات کرنے کا مناسب موقعہ نہ مل جائے اس وقت تک کچھ کہنے سے پرہیز کریں کیونکہ اکثر بے جا بات کرنے والے اگرچہ حق بات ہی کیوں نہ کر رہے ہوں معیوب لگتے ہیں۔

100- اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنا ذلت کا باعث بنتا ہے۔

101- اس شخص کے ساتھ دشمنی مول لینا جو نقصان پہنچانے پر قادر ہو نہایت بیوقوفی ہے۔

102- ارباب اقتدار کی بری عادات یہ ہیں: دشمنوں سے خوف، ضعیف و ناتوان لوگوں کے ساتھ سنگدلی اور کسی پر احسان کرنے میں بخل سے کام لینا۔

103- جس کام کے کرنے سے عاجز ہو اسے اپنے ذمے لینے سے اجتناب کرو۔

-104 جس چیز کا حصول تمہارے بس میں نہ ہو اس کی بابت کوشش ہی نہ کرو۔

-105 جس سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہو اس سے لڑائی مول نہ لو۔

-106 اپنے اعمال سے زیادہ اجر و جزا کے طلب گار نہ بنو۔

-107 خدا کی اطاعت کی توفیق کے حصول کے علاوہ کسی چیز پر خوش نہ ہو۔

-108 اپنے آپ کو جس کام کا اہل سمجھتے ہو اس کے علاوہ کچھ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

-109 سلام کرنے کی ستر نیکیاں ہیں ان میں سے 69 ابتداء کرنے والے کے لئے جواب دینے والے کیلئے ایک ہے۔

-110 حاجت مند تیرے سامنے دست سوال دراز کر کے اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے لیکن تو اسے منفی جواب دے کر اپنی شخصیت کو داغ دار نہ کر۔

-111 امانت دار آدمی ہمیشہ امن و امان میں رہتا ہے۔

-112 پاک دل دلیر ہوتا ہے۔

-113 خطا کار ہمیشہ مضطرب و پریشان رہتا ہے۔

-114 جو شخص مسئلہ ''قدر'' پر ایمان رکھتے ہوئے اس کے خیر و شر کو قبول نہ کرے گویا اس نے کفر اختیار کیا اور جو شخص اپنے گناہوں کی ذمہ داری خدا پر ڈالے اس نے ذات پروردگار پر سخت جھوٹ و افتراء باندھا۔

-115 خدا کی اطاعت جبر و اکراہ سے نہیں کی جاتی اور نہ ہی اس کی معصیت کسی قہر و غلبہ کے سبب انجام دی جاتی ہے لیکن خدا نے اپنے بندوں کو حکمت و دانائی اور فکر و عمل میں بالکل آزاد اور بے لگام نہیں چھوڑا ہے بلکہ وہ ان کے تمام امور کا مالک اور مدبر ہے اور جن امور میں اس نے اپنے بندوں کو طاقت بخشی ہے ان کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے' خدا نے لوگوں کو حق و باطل اور ثواب و عذاب کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں اور دلیل و برہان کے ذریعے ہر بات واضح طور پر سمجھا کر اتمام حجت کر دیا ہے' خدا نے لوگوں کو اپنی اطاعت و بندگی کی ترغیب اور معصیت اور نافرمانی سے دور رہنے کی تاکید کی اور انہیں اس بات کی طاقت بھی عطا فرمائی کہ وہ اس کے

احکام وفرامین کے مطابق اس کے اوامر کا امتثال اور ان کے نواہی سے اجتناب کریں اور خدا اس بات پر حمد وثناء اور ستائش کا سزاوار ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اپنے اوامر کے امتثال کی پوری طاقت عطا کی اور اسی قوت کے سہارے انہیں اپنے نواہی سے اجتناب کی صلاحیت بھی بخشی اور پھر ان افراد سے عذر قبول کرنے کا وعدہ بھی کیا جو امتثال اوامر اور اجتناب نواہی پر قادر نہ ہوں' خدا اپنی ان عنایات پر شکر کا سزاوار ہے اور اس کی نعمتوں پر جتنا شکر ادا کیا جائے' کم ہے!

116- قرآن کے معانی ومفاہیم میں علم ودانش کے بغیر بحث نہ کرو کیونکہ میں نے اپنے نانا رسول خداؐ سے سنا ہے کہ جو شخص قرآن کے بارے میں علم و دانش کے بغیر اپنے نظریات کی بنیاد پر سوچے اور قرآن کے معانی کو اپنی آراء پر ڈھالے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم ہی میں سمجھے۔

117- موت' اولاد آدم کے گلے میں اس خوبصورت ہار کی طرح ہے جو نوجوان لڑکیوں کے گلے میں ''زینت'' ہوا کرتا ہے۔

118- موت کے ڈر سے ذلت کو برداشت کرنا عزت نفس' بلند ارادے اور جوان جذبے کے سراسر منافی ہے۔

119- حق کے دفاع اور انسانیت کی پاسداری کے لئے موت کو سینے سے لگانا اور اس کی ہولناکیوں کی پرواہ نہ کرنا ہی جوانمردی ہے۔

120- حق کی خاطر قربان ہونا فضیلت اور حق سے منہ موڑنا ذلت وخواری ہے۔

121- صبر واستقامت کے ساتھ ہر مرحلے کو نمٹانا چاہئے اور باطل کی نام نہاد طاقت سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے' خدا حق کی حمایت کرنے والوں کو درست رکھتا ہے۔

122- ہر کام میں خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی طاقت سہارا نہیں دے سکتی اور جسے خدا کا سہارا مل جائے وہ ہر دوسرے سہارے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

123- تمام امور خدا کے ہاتھ میں ہیں اگر وہ چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے اور اگر چاہے تو درگزر کر دے' اس کی قدرت واختیار میں کسی کا دخل نہیں۔

124- انسان کس قدر عاجز و ناتواں ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ اسے نہیں ملتا اور جو کچھ اسے ناپسند ہے وہ اسے اپنے سے دور کرنے پر قادر نہیں۔

125- قیامت کے دن کوئی شخص امن و امان میں نہ ہو گا سوائے اس کے کہ جو دنیا میں خوف خدا دل میں رکھتا ہو۔

126- زیادہ قسمیں کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ عام طور پر کوئی شخص ان وجوہات کی بناء پر قسم ھاتا ہے:

1- احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی شخصیت میں نقص و کمی محسوس کرتا ہے تو عاجزی و انکساری کے ساتھ قسموں کا سہارا لے کر اپنے بارے میں لوگوں کو اطمینان دلاتا ہے۔

2- اظہار خیال میں کمزوری و ناتوائی کا شکار ہو کر قسموں کے ذریعے اپنے بیان کو پختہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

3- لوگوں کے درمیان الزام و تہمت کی وجہ سے بدنام ہو کر اپنی برائت و صفائی کے لئے قسموں کا سہارا لیتا ہے۔

127- قیامت کے دن آواز دی جائے گی کہ اے لوگو! جو شخص خدا کے پاس اپنا اجر رکھتا ہو وہ کھڑا ہو جائے تو سوائے نیک اعمال کرنے والوں کے کوئی بھی نہیں کھڑا ہو گا۔

128- دنیا ڈھل جانے والے سائے کی طرح ہے جو اس کا سہارا لے وہ احمق ہے۔

129- اے دنیا کی لذتوں سے دل لگانے والوں! جان لو کہ اس کی آسائشیں فنا پذیر ہیں۔

130- لوگ دنیا کے زرخرید غلام بن کر رہتے ہیں اور ''دین'' ان کی زبانوں پر شہد کی طرح ہے لہٰذا وہ اپنے کام اور معاش کی حد تک دین سے وابستہ رہتے ہیں اور جب کوئی کٹھن اور دشوار مرحلہ آئے تو دین سے منہ موڑ لیتے ہیں اور یہ نہایت افسوس ناک بات ہے۔

131- حق کی پیروی کے بغیر عقل کو کمال حاصل نہیں۔

132- غیبت سے اجتناب کرو کیونکہ یہ جہنم کے کتوں کی غذا ہے۔

133- بخیل وہ ہے جو ''سلام'' کرنے میں بخل کرے۔

134- کوئی بات کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہئے اور کسی کو اس وقت تک گفتگو کی اجازت نہ دو جب تک وہ سلام نہ کر لے۔

135- دنیا کا گھر آباد کرنے کے لئے آخرت کا گھر برباد کرنا عقلمندی نہیں اور ایسا کرنے والا کبھی سکون نہیں پا سکتا۔

136- کسی حسد کرنے والے شخص سے دوستی نہ کرو کیونکہ وہ ملعون ہے۔

137- ایسے شخص سے بھائی چارہ قائم نہ کرو جو خود پسندی میں مبتلا ہو۔

138- مومن اپنے کردار سے نفس کی پاکی کا تحفظ کرتا ہے۔

139- خدا کی نافرمانی کرنے والے شخص سے بھلائی کی امید نہ رکھو۔

140- خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرنا اہل ایمان ہونے کی نشانی ہے۔

141- یادرکھو! تم پر آنے والی مصیبت درحقیقت تمہارے اپنے ہی عمل و کردار کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن خدا پھر بھی تم سے درگزر کرتا ہے۔

نوٹ: (اسی مضمون کو مولانا روم نے اس طرح باندھا ہے

ہر کہ آید بر تواز ظلماتِ غم

آں زبیبا کی و گستاخیت ہم

یعنی جو بھی غم ہم کو ملتے ہیں وہ دراصل ہماری اپنی بے باکی اور گستاخی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

142- کسی کی عیب جوئی نہ کرو ورنہ تمہارے عیوب بھی پوشیدہ نہیں رہیں گے۔

143- کسی سے دشمنی مول لینا اپنا امن وامان تباہ کرنے کے برابر ہے۔

144- اگر تمہیں اپنے دین کے بارے میں ٹھوس معلومات نہیں ہیں تو جتنی جلد ہو سکے اس کے لئے اقدام کرو۔

145- جو شخص صدق دل سے ہماری پیروی کرے وہ ہم اہل بیتؑ میں سے ہو گیا۔

146- گونگے' بہرے' مفلوج اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرو تا کہ خدا تمہاری مدد کرے۔

147- اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ فضیلتوں کے حصول کی کوشش کرو۔

148- یاد رکھو! خوف اور ڈر موت کے آنے میں تاخیر پیدا نہیں کرسکتا۔

149- جب تک زندہ ہو اپنے صحیح و سالم جسم و جان کے ساتھ نیک اعمال بجالانے کی جلدی کرو اور جان لو کہ تم موت کے ناگہانی حملے کی زد میں ہو۔

150- اے لوگو! ہماری اطاعت کرو' ہمارے کردار کو اپناؤ اور ہماری نصیحتوں پر عمل کرو' کیونکہ ہم ہی خدا کی وہ جماعت ہیں جو حقیقی معنی میں کامیاب ہیں اور ہماری پیروی دراصل حضرت پیغمبر اکرمؐ کی پیروی ہے اور خدا نے تم سب کو ہماری اطاعت کا حکم دیا ہے۔

151- لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین صرف ان کی زبانوں پر رہتا ہے۔ یہ بس اس وقت تک دین کے حامی ہیں جب تک ان کی زندگی آرام و آسائش سے گذرے اور جب امتحان میں ڈالے جائیں تو دیندار بہت کم رہ جاتے ہیں۔

152- میں جانبازی اور شجاعت کی موت کو ایک سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی گذارنا میرے نزدیک ذلت اور حقارت ہے۔

153- ان اللہ یحب معالی الامور ویبغض سفساسھا یعنی اللہ تبارک تعالیٰ بلند اور قابل قدر کاموں کو پسند کرتا ہے جبکہ وہ پست' فضول' ناکارہ اور گندے کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ (تاریخ یعقوبی)

154- الناس عبیدالدنیا والدین لعق علی السنتھم فی محصو بالبلاء قل الدیانون: یعنی لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین ان کا زبانی جمع خرچ ہے یعنی بہت قلیل مقدار کا ہے اور جب لوگ بلا میں گرفتار ہوتے ہیں تو پھر دیندار بہت کم نظر آتے ہیں۔ (تحف العقول)

155- دراسۃ العلم لقاح المعرفۃ' وطول التجارب زیارۃ فی العقل یعنی علمی مباحثے و مذاکرے معرفت میں اضافہ کرتے ہیں اور زیادہ تجربے عقل کی زیادتی کا

سبب بنتے ہیں۔

156- **لو ترکوا لجهاد لا تاهم العذاب** یعنی جہاد کو ترک کرنے سے عذاب نازل ہوتا ہے۔

157- **لایا من الامن اخاف اللہ** یعنی کوئی امان میں نہیں ہے سوائے اس کے جو خدا سے ڈرے۔

158- **القدره تذهب الحفیظة** یعنی قدرت (طاقت اور اختیار) انسان کی غلامی کو ختم کر دیتی ہے اور اسے بے باک بنا دیتی ہے۔

159- ''حضرت موسیٰ بن جعفرؑ نے ہشام کے لئے جو وصیت تحریر کی تھی اس میں آیا ہے کہ امام حسینؑ بن علیؑ نے فرمایا: ''وہ تمام اشیاء جن پر مشارق اور مغارب میں سورج چمکتا ہے، تمام دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے سمندر، خشکی، پہاڑ، میدان، غرض سب کچھ اس شخص کے نزدیک کہ جس نے اللہ کی عظمت کو سمجھ لیا اور خدا کی درگاہ میں خود کو سپرد کر دیا، ایک سائے کی طرح سے ہے۔ پھر فرمایا: کیا کوئی ایسا آزاد مرد پیدا نہیں ہوا جو دنیا و مافیھا سے بے نیاز ہو؟ (لماظہ یعنی وہ ریشہ جو کھانا کھانے کے بعد دانتوں میں پھنس جاتا ہے)۔ اے لوگو! جنت کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اتنی قیمت ہو کہ تم اس کے لئے اپنی جان اور ذات بھی بیچ دو۔ پست جو لوگ خدا سے فقط اس دنیا کے ملنے پر راضی ہوئے وہ پست چیز پر راضی ہو گئے۔''

160- ''لوترکو الجهاد لاتاهم العذاب۔'' ''جہاد کو ترک کرنے سے عذاب نازل ہوتا ہے۔''

161- ''لایامن الامن خاف اللہ۔'' کوئی امان میں نہیں ہے سوائے اس کے جو خدا سے ڈرے۔''

162- عراق کے باشندو! میری جان کی قسم، امام اور پیشوا وہی ہو سکتا ہے جو خود دین کا پابند ہو اور عدالت و انصاف قائم کرے اور خدا کی رضا کے مقابل اپنے نفس کی پیروی نہ کرے۔

نسب نامہ

امام حسینؑ پر لکھی جانے والی اس کتاب میں آپ کے نسب نامہ کا ذکر بوجوہ ضروری ہے۔امام حسینؑ کا نسب گرامی سیدنا اسماعیلؑ کے حوالے سے ابوالانبیاء سیدنا ابراہیمؑ سے ملتا ہے۔ماہرین انساب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد عدنان کا نسب سیدنا اسماعیلؑ تک صحیح ہے البتہ درمیان میں آباؤاجداد کی تعداد میں اختلاف ہے۔عدنان تک حضورؐ نے اپنا نسب خود بیان فرمایا ہے جو اس طرح ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ، سیدنا اسمٰعیلؑ، عدنان، معد، نزار، مُضر، الیاس،
مُدرکۃ، خزیمہ، کنانۃ، النضر، مالک، فہر، غالب، لُوئی، کعب، مُرّۃ،
کلاب، قصی، عبدمناف

عبدمناف کی اولاد کا نقشہ درج ذیل ہے۔

عبدمناف

ہاشم　　　مطلب　　　عبدالشمس

عبدالشمس کا بیٹا امیہ جنکا بیٹا حرب اور اس کا بیٹا ابوسفیان جن کے بیٹے امیر معاویہؓ اور ان کا بیٹا یزید جس کا بیٹا معاویہ ثانی جس نے یزید کی وفات کے بعد ظلم پر قائم ہونے والی حکومت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور چند دنوں کے اندر جواناں موت مر گیا اور اس طرح یزید کی نسل صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔عبدمناف کے دوسرے صاحبزادے ہاشم کی اولاد کا نقشہ حسب ذیل ہے۔

ہاشم

عبدالمطلب

عبداللہ　　　ابوطالب .... فاطمہ (زوجہ ابوطالب)　　　(اسد)

محمدؐ

فاطمہؑ (زوجہ علی ابن ابی طالب)

حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ، اُم کلثومؑ

علیؑ، جعفرؓ، عقیلؓ، طالبؓ

جعفر بن ابو طالب کے دو بیٹے تھے۔ عبداللہ کی شادی زینب بنت علیؑ سے ہوئی جبکہ محمد ابن جعفر کی شادی اُم کلثوم بنت علیؑ سے ہوئی۔

امام حسینؑ کی نسل امام زین العابدین کی معرفت آگے بڑھی۔ آپ شدید بیماری کی وجہ سے کربلا میں موجودگی کے باوجود جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ اس میں اللہ کی مصلحت تھی کیونکہ سورہ الکوثر کی آیت کہ اے رسولؐ تجھے اولاد کے حوالے سے کثرت عطا کر دی ہے اور تیرے دشمنوں کی نسل ختم ہو جائے گی کی عملی تعبیر بھی ہونا تھی۔ امام حسنؑ کی نسل زید اور حسن مثنیٰ سے آگے چلتی ہے۔ ایک قول کے مطابق امام حسنؑ کے تین فرزند، کربلا میں شہید ہوئے عبداللہ، قاسم اور عمرو۔ حسن مثنیٰ کی شادی امام حسین کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی تھی۔ آپ کربلا میں شریک جہاد تھے اور زخمی حالت میں لاشوں کے نیچے دب گئے تھے۔ آپ کے ماموں ابوحسان نے انہیں اس حالت میں عمر سعد سے لے لیا تھا۔ بہر حال آپ کو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے 97 ہجری میں زہر دے کر شہید کر دیا تھا۔

امام حسینؑ ایک عظیم ورثے کے امین بھی تھے۔ یہ ورثہ انہیں اپنے دودھیال اور اپنی نانی کی طرف سے ملا تھا۔ جناب عبدالمطلب، جناب ابو طالب، جناب علی مرتضیٰؑ اور سیدہ خدیجۃ الکبریٰ نے ذات محمدؐ اور محمدؐ کے مشن کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ سیدنا عبدالمطلب اور سیدنا ابو طالب نے جناب رسالتمابؐ کی جان کے تحفظ میں مثال قائم کر دی۔ عرب کی رئیس دولتمند خاتون تاجر سیدہ خدیجۃ الکبری نے اپنی ساری دولت اسلام کی راہ میں قربان کر دی تھی۔ آپ کی اور جناب ابو طالب کی وفات کے سال کو حضورؐ نے عام الحزن یعنی غموں کا سال قرار دیا تھا اور ان دونوں کی وفات کے بعد آپ کا مکہ میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا اور آپ نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔

جنگ بدر میں علیؑ کی کمال جراُت وشجاعت کا مظاہرہ، جنگ اُحد میں حضورؐ کی جان بچانے کا عمل، جنگ خندق میں عبدود جیسے بہادر دشمن رسولؐ پر غلبہ حاصل کرنا اور جنگ خیبر میں فیصلہ کن معرکہ وہ باتیں ہیں جن کے ذکر سے تاریخ کا باب روشن ہے لیکن ہمارے خیال میں حضرت علیؑ کا یہ احسان بھی کم نہ تھا کہ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ نے پہلے، دوسرے

اور تیسرے خلفیہ کے چناؤ کے وقت تلوار نہ اُٹھائی۔ آپ کے استقلال اور صبر ہی کا نتیجہ تھا کہ اسلام آگے بڑھتا، پھلتا اور پھولتا رہا ورنہ اگر آپ ابوسفیان کی تحریک پر ثقفیہ بنی ساعدہ کے فیصلے کو تلوار کی نوک سے چیلنج کر دیتے تو حضورؐ کے وصال کے بعد اسلام یتیم ہو جاتا۔ امام حسینؑ تیسری پشت میں اسلام کے دفاع کیلئے آگے بڑھے تھے۔ دُنیا بھر کے انسانوں نے اسلام سے فائدے حاصل کئے لیکن آل ابوطالب، کا خاندان اس شرف میں منفرد ہے کہ اس نے اسلام کا دفاع کیا اور اسلام کو ان نسلوں کی وجہ سے تقویت حاصل ہوئی۔

تاریخ ابن خلدون حصہ دوم بعنوانِ خلافت معاویہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی میں صفحات 57 لغایت 60 کے مطابق اہل عراق و شام سے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کے بعد امیر معاویہؓ ایک ہزار سواروں کی جمعیت میں مدینہ منورہ پہنچے۔ حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہؓ ابن زبیر، عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر اور عبداللہؓ بن عمر اس خیال سے مکہ روانہ ہو گئے کہ امیر معاویہؓ ان کے کہنے پر عمل نہ کریں گے۔ (یعنی یزید کی ولیعہدی کی بیعت پر اصرار کریں گے) مدینہ میں حضرت عائشہؓ نے امیر معاویہؓ سے کہا کہ اُنہوں نے سنا ہے کہ تم نے ان چاروں کو قتل کی دھمکی دی ہے تو امیر معاویہؓ نے انکار کر دیا۔ مدینہ کے قیام کے دوران بیعت نہ ہوئی اور امیر معاویہؓ مکہ چلے گئے جہاں انہوں نے ان چاروں بزرگوں کی موجودگی میں اپنی پولیس کے رئیس کو حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اس کے بعد منبر پر جا کر امیر معاویہؓ نے اعلان کیا کہ ان چاروں احباب نے بھی یزید کی بیعت کر لی ہے۔ اہل مکہ اسی بات کے منتظر تھے اور انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ اس کے بعد امیر معاویہ پھر مدینہ آئے جہاں یزید کے حق میں بیعت ہو گئی۔ لوگوں کے سوال پر ان بزرگوں نے بتایا کہ انہوں نے یزید کے ولی عہد مقرر کئے جانے پر بیعت نہیں کی۔ اس سوال پر کہ انہوں نے امیر معاویہؓ کو روکا کیوں نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کی خونریزی کے خیال سے۔

بیشک بعض صاحبان علم نے اسلام پر احسانات کے حوالے سے ابوطالب اور اولاد ابوطالب کو سب سے اوپر شمار کیا ہے۔ جناب ابوطالب کی طرف سے جناب رسالتؐ مآب

کو مکمل تحفظ اور پناہ مہیا کرنا، شعب ابی طالب میں جناب ابوطالب کا کردار، دعوت ذی العشیرہ میں حضرت علیؑ کی اعانت، شب ہجرت بستر رسولؐ پر سونا، سب کچھ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

امام حسینؑ کے نسب نامہ اور حضرت علیؑ کی جملہ اولاد کا ذکر ضروری ہے کیونکہ امام حسین کے علاوہ امام علیؑ کی باقی اولاد نے بھی اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

جناب فاطمہ الزہرؑا کے بطن سے امام حسین 15 رمضان المبارک 3 ہجری اور 3 یا 5 شعبان 4 ہجری میں امام حسنؑ پیدا ہوئے۔ بڑی صاحبزادی سیدہ زینب کبریٰ تھیں جن کی شادی عبداللہ ابن جعفر کے ساتھ ہوئی۔ انہی کی اولاد کربلا کے سفر میں شہید بھی ہوئی۔ امام حسینؑ کی دوسری بہن جناب اُم کلثوم تھیں جن کا عقد محمد بن جعفر سے ہوا تھا۔ پہلے ہم امام علیؑ کی اولاد کو دیکھتے ہیں۔

امامہ بنت ابی العاص

حضرتؑ نے جناب سیدہؑ کی وصیت کے مطابق اِن سے عقد کیا۔ اِن کے بطن سے محمد الاوسط متولد ہوئے جو جنگ کربلا میں لڑ کر شہید ہوئے۔

اُم البنین بنت حزام کلابیہ

امیر المومنین نے اپنے بھائی عقیل سے کہا کہ آپ انساب عرب سے واقف ہیں۔ میرے لئے ایسی خاتون کا انتخاب کیجئے جو عرب کے شجاع و بہادر خاندان سے تعلق رکھتی ہو تا کہ اس سے جو اولاد ہو وہ بھی دلیر و شجاع ہو۔ عقیل نے کہا کہ آپ اُم البنین کلابیہ سے عقد کریں کیونکہ اُن کے آباؤ اجداد سب کے سب عرب کے مانے ہوئے دلیر اور شجاع گزرے ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ نے اُم البنین سے عقد کیا جن سے چار فرزند پیدا ہوئے: عباس، عبداللہ، عثمان اور جعفر۔ عباس 26ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ پھر عبداللہ پیدا ہوئے پھر عثمان جو عبداللہ سے دو برس چھوٹے تھے اور پھر جعفر جو عثمان سے دو برس چھوٹے تھے۔ یہ چاروں کے چاروں کربلا میں یزیدی لشکر کی خون آشام

تلواروں سے شہید ہوئے۔

لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ

ابن اثیر نے کامل میں اور ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان کے بطن سے دو صاحبزادے ابوبکر اور عبید اللہ پیدا ہوئے اور بعض نے اِن دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ شیخ عباس قمی نے منتھی الآمال میں تحریر کیا ہے کہ ان سے محمد الاصغر اور ابوبکر پیدا ہوئے۔ سید محسن امین نے اعیان الشیعہ میں لکھا ہے کہ بظاہر یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ محمد الاصغر نام ہے اور ابوبکر کنیت ہے۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی قرار دیا ہے۔ یہ بھی جنگ کربلا میں شہید ہوئے۔

اسماء بنت عمیس خثعمیہ

ابن اثیر نے کامل میں تحریر کیا ہے کہ محمد الاصغر انہی کے بطن سے متولد ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان سے یحیٰ اور عون پیدا ہوئے۔ یحیٰ حضرتؑ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے اور عون معرکۂ کربلا میں شہید ہوئے۔

ام حبیب صہبا بنت ربیعہ تغلبیہ

ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ عمر الاطرف اور ایک صاحبزادی کبریٰ جڑواں پیدا ہوئے۔ رقیہ کبریٰ، مسلم ابن عقیل سے بیاہی گئیں۔

خولہ بنت جعفر حنفیہ۔ ان کے بطن سے محمد پیدا ہوئے جو ابن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ 81ھ میں طائف میں وفات پائی۔

ام سعید بنت عروہ ثقفیہ

ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے کہ ان کے بطن سے نفیسہ، زینب صغریٰ اور رقیہ صغریٰ متولد ہوئیں اور سید محسن امین نے لکھا ہے کہ ان سے ام الحسن اور ام کلثوم صغریٰ پیدا ہوئیں بعض نے لکھا ہے کہ اُم کلثوم نفسیہ ہی کی کنیت تھی۔

اُم شعیب مخزومیہ

ابن شہر آشوب نے لکھا ہے کہ ام الحسن اور رملہ دو صاحبزادیاں ان سے پیدا

ہوئیں ۔بنوامیہ اور بنوعباس کا تقابل کرتے ہوئے محمد ابوزہرہ مصری اپنی تصنیف آثار امام شافعی میں لکھتے ہیں کہ دولت عباسیہ کی بنیاد نسبت و قرابت رسولؐ اللہ پر قائم تھی جبکہ دوالت امویہ کا دامن اس طرح کے دعوے سے خالی تھا۔اس لئے کہ اس حکومت کے بانی نے اس شخص یعنی سیدنا علیؑ سے جھگڑا کیا جواز روئے نسب رسولؐ اللہ سے سب سے زیادہ قریب تھا اور از روئے دین اس کا مقام اور مرتبہ سب پر بھاری تھا اور ظاہر ہے کہ بنی علیہ السلام کے بعد یہ خصوصیت علیؑ اور اولاد علیؑ ہی کو حاصل تھی (ترجمہ سید رئیس احمد جعفری ناشر شیخ غلام علیؑ اینڈ سنز صفحہ نمبر 107)

اس مقام پر مناسب ہوگا کہ قارئین کرام اسلام کے ابتدائی ایام کی مشکلات اور نبی ہاشم کی اسلام کی ترویج کیلئے قربانیوں اور حکمت عملیوں کا ایک جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں ۔اس سلسلہ میں ہم تاریخ طبری سے بعض اقتباسات پیش کررہے ہیں ۔

بنوعبدالمطلب کو دعوت اسلام

علیؑ بن ابی طالب سے مروی ہے کہ جب یہ آیت ''وانذر عشیرتا......والاقربین رسول اللہ پر نازل ہوئی ۔آپ نے مجھے بلایا اور کہا علی اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے قریبی کنبے والوں کو ہدایت کروں مگر میں اپنے کو اس سے عہدہ برآ ہونے میں مجبور پاتا ہوں کیونکہ جب میں ان کو دعوت دوں گا وہ مجھے تکلیف پہنچائیں گے ۔۔اس خوف سے میں اس حکم کی بجا آوری میں خاموش تھا کہ جبرائیل میرے پاس آئے اور کہا کہ محمدؐ اگر تم اللہ کے اس حکم کی بجاآوری نہ کروگے تمہارا ربّ تم کو عذاب دے گا اس لئے تم آدھ سیر تین پاؤ کا کھانا تیار کرو اس پر بکری کی ران بھون کر رکھ دینا اور دودھ سے بھر کر ایک کٹورا لادو، اس کے بعد تمام بنوعبدالمطلب کو میرے پاس بلالاؤ تاکہ میں ان سے گفتگو کروں اور اللہ کے حکم کو اُن تک پہنچادوں ۔میں نے رسولؐ اللہ کی فرمائش پوری کردی، اور پھر تمام بنوعبدالمطلب کو جو اس زمانے میں کم و بیش چالیس مرد تھے ۔آپؐ کے پاس بلا لایا۔ان میں آپ کے چچا ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب بھی تھے ۔سب کے جمع ہو جانے کے بعد رسولؐ اللہ نے مجھے اس کھانے کے لانے کا جو میں نے آپ کیلئے تیار کیا تھا حکم دیا۔میں نے اسے لاکر

رکھا۔ رسولؐ اللہ نے اس میں سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اسے اپنے دانتوں سے چیرا اور پھر اسے خوان کے کناروں پر رکھ دیا اور سب سے کہا۔ بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیجئے۔ تمام جماعت نے شکم سیر ہو کر کھانا کھا لیا، مجھے صرف ان کے ہاتھ چلتے دکھائی دیتے تھے اور قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں علی کی جان ہے کہ جتنا کھانا میں نے ان کیلئے تیار کیا تھا ان میں سے ہر شخص اس تمام کو کھا جاتا۔ کھانے کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا ان سب کو دودھ پلاؤ۔ میں نے وہ کٹورا لا کر ان کو دیا، اسے پی کر وہ سب سیر ہو گئے حالانکہ بخدا وہ صرف اتنا تھا کہ ان میں کا ہر شخص اسے پی جاتا۔ اس کے بعد رسولؐ اللہ نے چاہا کہ ان سے گفتگو کریں مگر آپ کے بولنے سے پہلے ابولہب نے کہا کہ ''عرصہ سے یہ تم پر جادو کرتا رہا ہے۔'' یہ سن کر تمام جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رسولؐ اللہ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مجھ سے کہا علی! تم نے دیکھا کہ اس شخص نے مجھے آج بات کرنے کا موقع نہیں دیا اور سب لوگ چلے گئے۔ کل پھر اسی قدر کھانے کا انتظام کرو اور ان سب کو میرے پاس بلاؤ۔

بنوعبدالمطلب کو مکرر دعوت اسلام

حسب الحکم دوسرے دن پھر میں نے اسی قدر کھانے اور دودھ کا انتظام کر کے سب کو رسولؐ اللہ کی خدمت میں جمع ہونے کی دعوت دی جب وہ آ گئے۔ آپ نے کل کی طرح مجھے کھانا لانے کا حکم دیا۔ میں کھانا لایا۔ آپ نے آج بھی وہی کیا جو کل کیا تھا اس کی برکت سے سب نے شکم سیر ہو کر کھا لیا۔ پھر آپ نے مجھ سے کہا کہ ان کو دودھ پلاؤ، میں اس کٹورے کو لے آیا اسی سے وہ سب سیر ہو گئے۔ اس سے فراغت کے بعد رسولؐ اللہ نے فرمایا اے بنوعبدالمطلب میں نہیں جانتا کہ کوئی عرب مجھ سے پہلے اس سے بہتر کوئی نعمت تمہارے پاس لیا ہو جو میں تمہارے لئے لایا ہوں، اس میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس بھلائی کی دعوت دوں، تم میں سے کون اس معاملہ میں میرا بوجھ بٹانے کیلئے آمادہ ہوتا ہے تا کہ وہ میرا بھائی بنے، میرا وصی ہو اور تم میں میرا جانشین ہو۔ اس دعوت میں سب کے سب ساکت و صامت رہے کسی نے حامی نہ بھری البتہ میں نے کہا حالانکہ میں اس جماعت میں سب سے کم عمر تھا، سب سے زیادہ چھوٹی

آنکھیں تھیں، پیٹ بڑا اور پنڈلیاں تپلی تپلی تھیں اے اللہ کے نبیؐ میں تمہارا وزیر بنتا ہوں۔ رسولؐ اللہ نے میری گردن تھام کر کہا یہ میرا بھائی ہے میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے تم اس کی بات کو سنو اور جو کہے اسے بجا لاؤ۔ اس پر ساری جماعت ہنسنے لگی اور انہوں نے ابوطالب سے کہا سنو تم کو حکم ہوا ہے کہ تم اپنے لڑکے کی اطاعت و فرمانبرداری کرو۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے علیؓ سے پوچھا امیر المومنین آپ اپنے چچازاد بھائی کے اپنے چچا کی موجودگی میں کیونکر وارث ہوئے؟ انہوں نے کہا سنو۔ اس پر تمام حاضرین گوش برآواز ہوئے کہ سنیں علیؓ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے تمام بنوعبدالمطلب کو پلاؤ اور چھاچھ کی دعوت دی، آپ نے ان کیلئے صرف ایک مُد کھانا پکوایا تھا تمام لوگوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور پھر بھی وہ کھانا جوں کا توں باقی بچ گیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اے بنوعبدالمطلب! اللہ نے مجھے خاص طور پر تمہاری طرف اور عام طور پر تمام انسانوں کیلئے مبعوث فرمایا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق جو کچھ ہے وہ تمہارا مشاہدہ ہے کون اس کیلئے میرے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی، دوست اور میرا وارث بنے۔ کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ میں آپؐ کے پاس گیا حالانکہ میں سب سے کم عمر تھا۔ مجھ سے آپؐ نے کہا بیٹھو۔ اس بات کو آپ نے تین مرتبہ فرمایا مگر ہر بار میں کھڑا ہو کر آپ کی طرف بڑھتا تھا۔ تیسری مرتبہ آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا۔ اس طرح میں اپنے چچازاد بھائی کا وارث ہوا اور میرے چچا نہ ہوئے۔

علانیہ تبلیغ

حسن بن ابی الحسن سے مروی ہے کہ جب یہ آیت ''وانذر عشیرتک الاقربین'' رسول اللہ پر نازل ہوئی آپؐ نے ابطح میں کھڑے ہو کر کہا ''اے بنی عبدالمطلب، اے بنی عبدمناف، اے بنی قصی، پھر آپ نے قریش کے تمام قبائل اور خاندانوں کو فرداً فرداً نام لے کر مخاطب کر کے کہا میں تم کو اللہ کی جانب بلاتا ہوں اور اُس کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔

عبدالرحمٰن بن القاسم اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا کہ جو پیام اللہ کی طرف سے ان کو ملا ہے اس کا وہ اعلان کریں، لوگوں کو اپنی تعلیم دیں اور اللہ کی

طرف دعوت دیں۔ نبی ہونے کے بعد تین سال تک آپ خفیہ طور پر اپنی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے بعد اب آپ کو علانیہ طور پر تبلیغ کا حکم ہوا۔

اہل بیت رسولؐ کے علاوہ بنی امیہ کا امہات المومنین سے سلوک بھی حیرت انگیز تھا تاریخ ابن خلدون حصہ دوم بعنوان خلافت معاویہ کے صفحہ 70 سے 75 تک ان مشاہیر و اصحاب کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے امیر معاویہ کی خلافت کے دوران وفات پائی۔ نفیس اکیڈمی کراچی کی اس کتاب کے صفحہ نمبر 74 پر حضرت ام المومنین عائشہؓ کا اسم گرامی لکھ کر وفات کا سال 58 ہجری بیان کیا ہے اور مزید حالات کے خانہ میں درج ذیل عبارت لکھی ہے۔

> آپ کو مروان اور اس کے خاندان والوں نے شہید کیا تھا اس وجہ سے کہ وہ اس کی مخالفت کرتی تھیں۔ اس نے دعوت کے بہانے سے (ام المومنینؓ کو) اپنے گھر بلایا اور پہلے ایک گڑھا عمیق کھود کر نیزے، تلواریں، چھریاں وغیرہ (گڑھے میں) رکھ دی تھیں اور اوپر سے ایک فرش بچھا دیا تھا۔ ام المومنین جب تشریف لائیں تو ان کو وہیں بٹھلایا۔ بیٹھنا تھا کہ نیچے گر پڑیں۔ معمر اور کمزور تھیں ایسی چوٹ آئی کہ پھر اس سے جاں بر نہ ہوئیں۔ رسول اللہ صلعم کی محبوب ترین ازواج سے ہیں۔ آپؐ پیار سے ان کو حمیرا فرمایا کرتے تھے۔

اسی کتاب کے صفحہ 57 پر یہ بھی لکھا ہے کہ جب امیر معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کیلئے مدینہ آئے تو ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ان سے شکایت کی کہ انہوں نے سنا ہے کہ حسین ابن علی اور ابن عمر کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔ صفحہ 70 پر امام حسنؑ کی شہادت کے متعلق لکھا ہے کہ اگرچہ اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت ام المومنین حضرت عائشہ نے دیدی تھی لیکن مروان بن الحکم نے اپنے اعزہ و اقربا کو اکٹھا کیا اور امام حسینؑ کی میت کو وہاں دفن نہ ہونے دیا۔ مروان کو

امیر معاویہؓ کے دور میں دوبار مدینہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ مروان ان کا یکجدی بھی تھا۔ حضرت عائشہؓ اور امام حسنؑ کے واقعات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنوامیہ کو جناب رسالتمآب کے اہل بیت سے کس حد تک دشمنی تھی اور کربلا کے واقعہ نے ال ابوسفیان کے عزائم کو آشکار کردیا تھا۔

بنوامیہ کے اس اندازفکر اور طرزعمل کو ہم اسلام کا نام تو نہیں دے سکتے۔ یہ طریقہ کار اسلامی تعلیمات کی ضد تھا۔ یہ عمل کھلم کھلا جاہلیت کے اندازہ فکر کا اظہار تھا۔ جاہلیت سے مراد وہ طریقہ کار، وہ رجحانات اور سوچ کے طریقے ہیں جن کی نفی اسلام نے اپنی تعلیمات میں واضح طور پر کردی ہے۔ جاہلیت میں تمام امور شامل ہوجاتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے حکم دیا ہے کہ ان سے اجتناب ہی افضل عمل ہے۔ اسلام ایک ترقی یافتہ اور متوازن معاشرہ قائم کرنے کیلئے آیا تھا۔ اسلام نے انسانی سوچ اور رویوں میں انقلابی تبدیلی پیدا کی تھی۔ اسلام انسان کو کامیابی کی راہوں پر چلانے کیلئے آیا تھا۔ اسلام ایک نظریاتی اساس سے کرآیا تھا جس بنیاد پر متوازن معاشرہ قائم ہونا تھا۔

جاہلیت کے زمانہ کا مطلب جہالت کا زمانہ نہیں ہے۔ دور جاہلیت سے مراد اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے یعنی زمانی لحاظ سے اسلام کی آمد سے وقت دوحصوں میں تقسیم ہوگیا: بعثت رسولؐ سے پہلے اور بعثت رسولؐ کے بعد۔ دونوں ادوار میں حدفاصل بعثت رسول قرار پائی کیونکہ اسلام اپنا ایک مخصوص نظام لے کر آیا تھا جس کی خبر نبی آخرالزماںؐ نے اعلان نبوت کے بعد دی۔

لغات القرآن کے مطابق الجہل کے معنی ہوتے ہیں جو امور واضح نہ ہوں ان کی واقفیت حاصل کئے بغیر ان میں پیش قدمی کرنا، راغب نے جہل کی تین قسمیں بیان کی ہیں (1) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا (2) کسی بات کے متعلق اس کی صحیح کیفیت کے خلاف اعتقاد رکھنا اور (3) کسی بات کو جس طرح کرنا چاہیے اس کے خلاف کرنا۔ ابن فارس کے نزدیک جہل کے بنیادی معنی (1) علم کی ضد (2) ہلکا پن اور بے اطمینانی کے ہیں۔

سورہ الاحزاب 33/33/22 میں تبرج الجاہلیۃ الاولی کی اصطلاح استعمال ہوتی

ہے۔اس آیت مبارک میں خواتین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ قدیم جاہلیت کے زمانہ کا بناؤ سنگھار مت کرو جس میں عورت کے جسم کے اعضاء لوگوں کو دعوت نظارہ دیں۔اس مقام پر ایک طرف سابقہ عرب رواج کی طرف اشارہ کر کے بناؤ سنگھار کر کے عورت کے باہر نکلنے کے رواج کو زمانہ جاہلیت کا خاصا قرار دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی اشارہ ہے کہ اسلام کے بعد جب بھی مسلمان عورت اس انداز سے گھر سے باہر قدم رکھے گی اس کا یہ عمل جاہلیت ہی شمار ہوگا۔یعنی جاہلیت ایک انداز فکر اور زندگی گزارنے کا طریقہ بھی ہے۔ایسا طریقہ جس کی تائید اسلامی تعلیمات سے نہ ہوتی ہو۔اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مراد علم حاصل ہو جانے کے باوجود اپنے سابقہ طرز عمل پر ڈٹے رہنا بھی ہوگا۔

قرآن پاک میں سورہ الفرقان 19/25/63 میں اللہ کے بندوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں یعنی عاجزی، انکساری اور خاکساری سے چلتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں تکبر نہیں ہوتا اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو یہ اہل ایمان ایسے موقع پر اہل جاہلیت سے الجھنے کی بجائے اعراض و گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور بے فائدہ بحث نہیں کرتے۔یعنی مومن امن و سلامتی کا پیامبر ہوتا ہے۔وسعت قلبی اسکا شعار ہوتا ہے۔اس مقام پر جاہلیت کا لفظ عصبیت، تفاخر، حمیت، انا پرستی، مفاخرت یا عقل و خرد سے بیگانگی یا اعلیٰ اقدار سے بے خبری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مندرجہ بالا پس منظر کرنے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر ہم حضورؐ کے اجداد کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔یہ مواد پیر کرم شاہ الازہری کی کتاب ضیاء النبی کی جلد اوّل کے صفحات 375 سے 465 تک سے حاصل کیا گیا ہے۔

ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم، سیدنا نوحؑ کی آٹھویں پشت میں نحود اور دسویں پشت میں سیدنا ابراہیمؑ کی ولادت نمرود کے زمانے میں بابل شہر میں بیان ہوئی ہے۔قرآنی شہادت کے مطابق آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے توحید کا علم بلند کیا جس کے نتیجہ میں نمرود نے آپ کو آگ میں پھینکنے کا حکم دیا۔آگ اللہ تبارک تعالیٰ کے حکم سے گلزار بن گئی۔آپ کی شادی حضرت سارا سے ہوئی جبکہ حضرت بی بی ہاجرہ آپ کی دوسری بیوی تھیں جن کے بطن

سے حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت ہوئی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ ہی کے ہاتھوں ہوئی اور اس کام میں حضرت حاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد شامل تھی۔ حضرت اسمعیلؑ کی پیاس بجھانے کیلئے اس ریگزار سے زم زم کا چشمہ پھوٹا اور یہ وہ پانی ہے جس کی تلاش کیلئے حضرت حاجرہ صفا اور مروا کی دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی رہیں اور یہ عمل اب سالانہ حج وعمرہ کا رکن بن چکا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ہی کو خواب آیا تھا کہ آپ حضرت اسمعیل کو ذبح کر رہے ہیں اور جب آپ خواب پورا کرنے لگے تو اللہ تبارک تعالیٰ نے ذبح عظیم کے بدلے حضرت اسمٰعیلؑ کی جان بخش دی تھی۔ امام حسینؑ اسی ذبح عظیم کا فدیہ ثابت ہوئے۔

حضرت لوط ابن حاران حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے بیان ہوتے ہیں۔ حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے جنہوں نے فلسطین وشام یعنی کنعان میں حکومت قائم کی۔ آپ بنی اسرائیلؑ کے پیغمبروں میں سے تھے۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسماعیلؑ کی پیدائش ہوئی جو بادیہ فاران میں جلوہ افروزہ ہوئے۔ آپ سیدنا محمد رسول اللہ کے جد امجد تھے جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے ایک اور فرزند مدیان کے نام سے مشہور ہوئے جو حضرت قطورا کے بطن سے متولد ہوئے۔ ان کا قیام حجاز کے قریب بحر احمر کے ساتھ کے پاس تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کا عہد 2200 قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کو اعزاز حاصل ہوا کہ آپ مطابق سورہ البقرہ 01/02/124 امام الناس قرار پائے اور امامت آپ کے خاندان کیلئے مختص ہوگئی۔

سیدنا اسماعیلؑ

قرآن پاک میں درج ہے کہ سیدنا اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے بارے میں سیدنا ابراہیمؑ کو ایک حلیم فرزند کی خوشخبری کو سنائی گئی۔ آپ میں حلیمی کی صفت غالب تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ جب ان کے والد محترم نے کہا کہ انہیں خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ ملا ہے تو اس کم سن حلیم بیٹے نے کہا: ابا جان آپ وہ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم ملا ہے۔ اسی لئے سیدنا اسمٰعیل کو ذبیح اللہ کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اپنے پدر بزرگوار سیدنا ابراہیمؑ سے مل کر آپ نے حکم الٰہی کے تابع

خانہ کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا۔سیدنا ابراہیمؑ نے تعمیر و تکمیل بیت اللہ کے بعد دُعا مانگی جسے قرآن پاک نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس دُعا کا نتیجہ تھا کہ سیدنا اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے فرمانبردار امت پیدا ہوئی ملاحظہ ہو سورہ البقرہ 01/02/129۔حضورؐ اسی دُعا کا نتیجہ ہیں۔ایک دفعہ حضورؐ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا۔

ان دعوۃ ابی ابراھیم

یعنی میں اپنے جد ابراہیمؑ کی دُعا (کا نتیجہ) ہوں

سیدنا اسمٰعیلؑ کے دو فرزند نابت اور قیدر کی اولاد میں بڑی برکت ہوئی اور عرب کے اکثر قبائل ان ہی کی نسل سے ہیں۔ویسے آپ کے لڑکوں کی تعداد بارہ بتائی جاتی ہے۔

واثلہ بن اسقعؓ سے امام مسلم نے اپنی صحیح اور امام ترمذی سے اپنی سنن میں جو حدیث روایت کی ہے اسکا عام فہم ترجمہ یوں ہے:

واثلہ بن اسقع کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

اللہ تبارک تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے اسمٰعیل کو چنا۔

اولاد اسمٰعیل سے کنانہ کو چنا اور بنی کنانہ سے قریش کو چنا

اور قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے چن لیا

اس طرح جو شجرہ طیبہ سامنے آتا ہے جو حسب ذیل ہے:

محمد رسول اللہ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر ابن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

عدنان

علامہ طبری اور ابن خلدون کی روایات کے مطابق سیدنا شعیبؑ کو شہید کرنے کے بعد بنی اسرائیل کے نبی ارمیاء اور ابرخیاءؑ کو وحی ہوئی کہ بخت نصر کو عرب پر چڑھائی کا حکم دیا جائے تا کہ سیدنا شعیبؑ کے خون کا بدلا لیا جائے لیکن عرب کے سردار عدندان کے نابالغ فرزند معد کو باحفاظت رکھا جائے کیونکہ اس کی پشت سے ایک عظیم الشان نبی پیدا ہوگا۔ایسا

ہی ہوااور عدنان وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خانہ کعبہ کو غلاف پہنایا۔

معد

بخت نصر کی وفات کے بعد معد پھر مکہ میں آباد ہوئے۔ ماوردی کے مطابق پہلا شخص جس نے بنی اسمٰعیل کے شرف و مجد بنیاد رکھی اور اس کا قلعہ تعمیر کیا وہ عدنان کے فرزند معد تھے۔ آپ نے تہامہ پر قبضہ کیا۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوتی۔ عرب کے مشہور شاعر مہلہل نے لکھا ہے کہ ہمارا علاقہ تہامہ اس وجہ سے خوشحال اور غنی ہو گیا کہ وہاں معد بن عدنان کی اولاد سکونت پذیر تھی۔

نزار

آپ کی پیدائش پر آپ کے والد نے ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا کیونکہ انہیں اس خوبصورت بچے کی آنکھوں میں (نور محمدیؐ) ایک ایسا نور نظر آیا جس کو دیکھ کر والدین بہت خوش ہوئے اور شکرانے کے طور پر بڑی دعوت کا بندوبست کیا۔ یہ بچہ بڑا خوش بخت تھا جہاں بھی جاتا احترام حاصل کرتا۔

مضر

نزار کے بیٹے مضر بھی بہت خوبصورت تھے۔ آپ سے بہت سے اقوال حکیمانہ منسوب ہیں مثلاً (۱) بہترین بھلائی وہ ہے جو فوری کی جائے (۲) اپنے نفسوں کو مشکل کاموں کا خوگر بناؤ اور ہوا و ہوس سے ان کا رُخ پھیرے رکھو (۳) صلاح اور فساد میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کسی شیر دار جانور کو دوبارہ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے۔ آپ خوش الحان بھی تھے اور حدی خوانی کا آغاز آپ ہی سے ہونا بیان ہوتا ہے۔

مضر اور ان کے بھائیوں کے متعلق بہت سی حکمت والی باتیں منسوب ہیں۔

الیاس

آپ عرب کے سردار تھے اور اہل عرب انہیں سید العشیر ہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ آپ ہی کا قول ہے کہ جو خیر کو بوتا ہے وہ خوشی کی فصل کاٹتا ہے اور جو بُرائی کی فصل بوتا ہے وہ ندامت کی فصل کاٹتا ہے۔ آپ نے بنی اسماعیل میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دور

کرنے میں اپنی جانب سے بھرپور کردار ادا کیا۔

مدرکہ

آپ کا اصل نام عمرو تھا اور آپ کی والدہ خندف کے لقب سے معروف تھیں۔

خزیمہ

آپ کی والدہ کا نام سلمی بنت اسلم تھا۔ آپ کے بیٹے کا نام کنانہ تھا۔

کنانہ

آپ کی والدہ کا نام عوانہ بنت سعد بن قیس بن عیلان تھا۔ کنانہ کا مطلب ترکش بتایا جاتا ہے اور جس طرح ترکش تیروں کو اپنے اندر چھپالیتا ہے اسی طرح آپ نے اپنی ساری قوم کو اپنے جودو کرم کے دامن سے چھپالیا تھا۔ اس لئے آپ اس نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالنضر تھی۔ ایک روز آپ حطیم میں سو رہے تھے کہ آپ کو خواب آیا کہ گھوڑے، اونٹ، تعمیرات اور دائمی عزت میں سے ایک چیز چن لو۔ آپ نے اپنے رب سے دُعا کی کہ یہ ساری نعمتیں انہیں عطا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا کی وجہ سے یہ ساری نعمتیں قریش کو عطا کیں۔

نضر

ان کا نام قیس تھا آپ بہت خوبصورت تھے۔ آپ کی والدہ کا نام برہ بنت مر بن اد بن طابخہ تھا۔

مالک

آپ کی والدہ کا نام عاتکہ تھا اور عکرشہ ان کا لقب تھا۔ آپ کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے جس کی مورخین کی کئی وجوہ بیان کی ہیں۔ نضر غریب پرور انسان تھے۔ آپ نے اپنے قبیلہ کے بکھرے ہوئے افراد اور خاندانوں کو مکہ میں اکٹھا کیا۔ اس وقت لوگوں نے کہا ''تقرش بنو نضر ای تجمعوا''یعنی نضر کی اولاد اکٹھی ہوگئی۔

فہر بن مالک

آپ کی والدہ کا نام جندلہ بنت عامر بن حارث بن مضاض الجرہمی تھا۔ حسان بن عبدالکلال الحمیری نے یمنی قبائل کے لشکر جرار کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی تاکہ خانہ کعبہ کو اکھاڑ کر یمن لے جائیں اور لوگوں کو یمن میں حج کرنے کا حکم دیں۔ فہر بن مالک قریش اور اہل عرب کے سپہ سالار تھے اور ان کی قیادت میں گھمسان کا رن پڑا اور حمیر یمنی کو شکست ہوئی۔

غالب

ان کی کنیت ابو تیم تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ تیم اور لوی بنو تیم انہی صاحبزادے کی اولاد ہے۔

لوی

آپ کی والدہ کا نام عاتکہ بنت یخلد بن نضر بن کنانہ تھا۔ تاریخ طبری میں ہے کہ لوی کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حلم اور حکمت سے نوازا تھا۔ بچپن ہی سے ایسے جملے آپ کی زبان پر جاری ہوتے جو ضرب المثل بن جایا کرتے تھے۔

کعب

آپ بڑی ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ہر جمعہ کو قبیلہ قریش کو اکٹھا کر کے وعظ فرماتے اور اللہ کی اطاعت کا درس دیتے اور انہیں کائنات پر غور کرنے کی دعوت دیتے۔ ان کے ایک خطبہ کو امام محمد بن یوسف الصالحی نے نقل کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔

مرہ

آپ کی کنیت ابو یقظہ تھی۔ آپ حضورؐ کے نسب میں چھٹے جد ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سلسلہ بھی حضورؐ کے ساتھ جناب مرہ کی پیڑھی سے ملتا ہے۔

کلاب

آپ کی کنیت ابو زہرہ تھی۔ بعض کے نزدیک آپ کا نام حکیم جبکہ بعض نے عروہ لکھا

ہے چونکہ کتوں کی مدد سے شکار کرتے تھے لہٰذا آپ کو کلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
آپ حضرت آمنہ کے تیسرے دادا تھے۔اس جگہ حضورؐ کی والدہ ماجدہ اور والد محترم کا نسب مل جاتا ہے۔مشہور یہی ہے کہ عربی مہینوں کے نام آپ ہی کے تجویز کردہ ہیں۔

قصی

ان کا نام زید اور کنیت ابومغیرہ بیان ہوئی ہے۔آپ کی پیدائش 400ء کے لگ بھگ ہوئی۔آپ قبیلہ قریش کے عالم تھے اور جمعہ کے روز خطبہ دیا کرتے تھے۔اس وقت جمعہ کو یوم العروبہ کہا جاتا تھا۔آپ نے بھی ایک نبی کے معبوث ہونے کی اطلاع دی تھی۔آپ کا بچپن اپنے وطن سے دور گزرا۔اس لئے آپ قصی یعنی دور افتادہ کے نام سے مشہور ہوئے۔
آپ کی شادی خانہ کعبہ کے متولی بنی خزاعہ کے سردار حلیل بن حبشیہ کی صاحبزادی سے ہوئی جس سے آپ کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔عبدالدار، عبدالمناف، عبدالعزیٰ اور عبد بن قصی۔
قصی نے اپنے بھائی ابوغبشان سے کعبہ کی تولیت کے حقوق خرید لئے جس پر بنوخزاعہ ناراض ہوئے۔جنگ ہوئی لیکن فیصلہ نہ ہو سکا حتی کہ عمرو بن عوف بن کعب ثالث مقرر ہوئے۔ان کے فیصلے کے مطابق بیت اللہ شریف کی تولیت قصی کو ملی اور مکہ مکرمہ کی زمام اقتدار بھی ان کے حصہ آئی۔قصی نے اعلان کیا کہ حاجی اللہ کے مہمان اور اس گھر کے زائر ہوتے ہیں لہٰذا ان کی ضیافت اور میزبانی ہمارا فریضہ ہے۔تم سب اپنے مالوں سے حصہ دو تا کہ ایک اجتماعی فنڈ قائم کیا جا سکے۔ساری قوم نے اس تجویز کو پسند کیا اور ایام حج میں اسی مشترکہ فنڈ ہی سے اجتماعی دعوت کا بندوبست کیا جاتا۔یہ رواج بنوعباس کے دور تک جاری رہا۔
کعب بن لوئی کی اولاد میں قصی پہلا شخص ہے جس کو حکومت ملی۔انہی کی وجہ سے حجابہ یعنی کعبۃ اللہ کی خدمت کے فرائض (۲) رفادہ یعنی زائرین کی اجتماعی ضیافت کا بندوبست (۳) سقایہ یعنی زائرین کیلئے پانی اکٹھا کر کے اس میں کشمش ڈال کر میٹھا کرنے کا انتظام (۴) ندوۃ یعنی مشاورت کا ادارہ اور (۵) اللواء جسے آج کی انتظامی لغت میں وزارت دفاع کا ہم منصب قرار دے سکتے ہیں قائم ہوئے۔

عبد مناف

آپ کا نام مغیرہ تھا اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے انہیں قمر البطحا یعنی بطحا کا چاند کہا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ان کے جد نزار کا جھنڈا اور جد امجد سیدنا اسمعیلؑ کی کمان ہوا کرتی تھی۔ آپ قریش کو تقویٰ کی تعلیم دیا کرتے۔ سخاوت اور غیر معمولی سیاسی فہم و فراست کی وجہ سے اپنے والد کے بعد قوم کے سردار منتخب ہوئے۔ انہی کے متعلق شاعر نے کہا تھا کہ قریش ایک انڈے کی مانند ہیں اور جب اسے پھوڑا گیا تو اس کا مغز اور جوہر عبد مناف کی شکل میں نمودار ہوا۔

ہاشم

عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، مطلب، عبد شمس اور نوفل۔ قصی نے مختلف مناصب کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سقایہ اور ندوہ عبد مناف کو تفویض ہوا جن کی ذریت سے حضورؐ پاک پیدا ہوئے۔ حجابہ اور لواء عبدالدار کے حصہ آیا تھا۔ حاجیوں کی خدمت کا فریضہ عبدالعزیٰ کے حصہ آیا جبکہ وادی کی حفاظت عبد قصی کو سونپی گئی۔ عبدالدار اور عبد مناف کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں میں مناصب کی سابقہ تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ جنگ کی نوبت آنے کو تھی کہ مصالحت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور یہ طے پایا کہ رفادہ، قیادہ اور سقایہ کے مناصب عبد مناف کے بیٹوں کو ملیں گے جبکہ حجابہ اور لواء کے منصب عبدالدار کے بیٹوں کے سپرد کئے جائیں گے اور دارالندوہ دونوں کے درمیان مشترکہ رہے گا۔

چنانچہ گھڑ سوار دستوں کی قیادت عبد شمس بن عبد مناف کو حاصل ہوئی۔ عبد شمس کے بعد امیہ اور پھر حرب اور اس کے بعد ابوسفیان کو یہ منصب ملا۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ابوسفیان نے حضرت علیؓ کو طعنہ دیکر پیشکش کی تھی کہ اگر وہ خلافت کا دعویٰ کریں تو ابوسفیان مدینہ کو گھڑ سواروں کے لشکر سے پر کر دیں گے۔ اسی منصب کی وجہ سے احد و خندق میں کفار کے لشکر کے سردار بھی ابوسفیان ہی تھے۔ بدر میں اگرچہ عتبہ بن ربیع نے قیادت کی تھی کیونکہ وہ عمر میں بڑے تھے اور اس وقت

ابوسفیان بسلسلہ تجارت کاروان کے ساتھ شام گئے ہوئے تھے۔

رفادہ کا منصب عبدمناف کے بعد ہاشمؒ کو ملا اور آپ کے بعد عبدالمطلبؒ کے حصہ میں آیا۔ان کے بعد حضرت ابوطالبؒ اور ان کے بعد ان کے بھائی عباس کو ملا۔ یہ سلسلہ بنی عباس میں جاری رہا تاوقتیکہ خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہوا۔

سقایہ کا منصب بھی عبدمناف کے بعد ہاشمؒ اور ان کے بعد مطلب کو ملا اور پھر عبدالمطلبؒ کے حصہ آیا۔ مطلب کی وفات کے بعد نوفل نے اپنے بھتیجے سے یہ منصب چھیننے کی کوشش کی اور مکانات پر قبضہ بھی کرلیا۔ رشتہ داروں نے اس لئے دخل نہ دیا کہ معاملہ چچا بھتیجے کے درمیان ہے۔ عبدالمطلبؒ نے یثرب میں اپنے ننھیال سے مدد طلب کی۔ اس پکار پر یثرب سے ابوسعد آ گئے اور ان کے بعد نوفل نے تمام چیزیں واپس کر دیں۔ عبدالمطلبؒ کے بعد سقایہ کا منصب جناب ابوطالبؒ کو ملا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں یہ منصب اپنے بھائی عباس کو دیدیا۔

حضرت ہاشمؒ کا نام عمرو یا عمر تھا۔ آپ اور عبدشمس جڑواں بھائی تھے۔ پیدائش کے وقت ہاشم کے پاؤں کا انگوٹھا عبدشمس کے سر کے ساتھ چسپاں تھا جسے تیز دھار آلے سے الگ کیا گیا۔ خون نکلنے کے باعث لوگوں نے قیافہ لگایا کہ دونوں بھائیوں کی اولاد میں خونریزی ہوگی۔ ان دونوں بھائیوں اور امیہ کے درمیان عداوت کی پہلی وجہ حسد بیان کی جاتی ہے کیونکہ اچھے اطوار کے باعث اپنے باپ کے بعد ہاشمؒ قوم کے سردار بنے اور ان کے جودوکرم کا بادل ہر وقت برستا تھا۔ امیہ ہاشمؒ سے خار کھاتا تھا اور لوگوں کے منع کرنے کے باوجود اس نے ہاشم کو منافرہ کا چیلنج دیا جو اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے ہاشمؒ نے قبول نہ کیا لیکن جب اصرار بڑھا تو شرط یہ طے ہوئی کہ بازی ہارنے والا سیاہ آنکھوں والی پچاس اونٹنیاں ذبح کرے گا اور دس برس کیلئے مکہ چھوڑ جائے گا۔ عسفان کا کاہن الخزاعی کو ثالث مقرر کیا گیا۔ امیہ بازی ہار گیا اور دس برس تک شام میں خود عائد کردہ جلاوطنی اختیار کئے رکھی۔ ہاشم نے پچاس اونٹنیوں کے گوشت کو لوگوں میں تقسیم کیا۔

قبیلہ قریش میں جاہلیت کی ایک رسم ''اعتفاد'' کے نام سے مروج تھی جس کے مطابق

مفلس اور قلاش خاموشی سے دور صحرا میں اپنے خیمے نصب کر کے روپوش ہو جاتے حتی کہ انہیں موت آ جاتی۔ ہاشمؒ نے اپنے قبیلہ کو اکٹھا کر کے انہیں بتایا کہ افراد کی کثرت سے قبیلہ کی عزت ہوتی ہے۔ آپ نے تجویز دی کہ ہر مفلس خاندان کو رئیس گھرانوں سے ملا دیا جائے تا کہ نادار بھائی صاحبان ثروت کا ہاتھ بٹا کر رزق حاصل کریں اور عزت کی زندگی بسر کریں۔ ان کے اس خطبے کا اثر ہوا اور اختصاد کی رسم ختم ہوئی۔

ہاشمؒ اور ان کے بھائیوں کو المجیر ون یعنی پناہ دینے والے بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ سخاوت وسیادت کے باعث سارے عرب میں مشہور تھے۔ ایک بار قحط کے زمانے میں ہاشمؒ نے شام سے سامان خورد ونوش خرید کر حج کے ایام میں لدے ہوئے اونٹوں پر آنے والے مال سے لوگوں کی عام ضیافت کی۔ شوربے کے ساتھ روٹی کھلانے کے باعث انہیں ہاشم کا خطاب ملا۔

عبد المطلب

آپ ہاشم کے فرزند تھے۔ آپ کا نام شیبہ تھا۔ اپنے ننھیال کے ہاں پرورش پائی پھر ان کے چچا مطلب انہیں مکہ لے آئے تھے۔ جوان ہونے پر آپ کے چچا نے ان کے والد کی جائیداد ان کے حوالے کر دی۔ خواب کی بنیاد پر آپ نے کنواں کھود کر زمزم کو دوبارہ جاری کیا اور گڑھوں میں دفن سونے کے ذخائر کو خانہ کعبہ کے دروازے پر منڈھ دیا۔ آپ کے دس بیٹے تھے۔ ان کی زندگی میں ابرہہ بادشاہ نے خانہ کعبہ پر لشکر کشی کی۔ تہامہ کی چراگاہوں میں قریش کے اونٹ چر رہے تھے جن میں سے دوسو اونٹ عبد المطلب کے تھے۔ ابرہہ کی خواہش تھی کہ جنگ کے بغیر مکہ فتح ہو جائے۔ جب آپ بادشاہ کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جس پر بادشاہ نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ جس اللہ کے گھر کو میں گرانا چاہتا ہوں آپ اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ اپنے اونٹوں کا معمولی سا معاملہ میرے پاس لے آئے ہیں۔ جناب عبد المطلب نے فرمایا کہ اونٹوں کا میں مالک ہوں اور اس گھر کا ایک اور مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ کہہ کر عبد المطلب خانہ کعبہ آئے اور اشعار کے ذریعہ التجا کی:

اے اللہ بندہ بھی اپنے کجاوے کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر
کی حفاظت فرما۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی صلیب کل تیرے گھر پر غالب آ جائے
اور نصب کر دی جائے اور اگر تو ان کو اور ہمارے قبلہ کو آزاد چھوڑ نیوالا ہے تو
جس طرح تیری مرضی ہے تو کر۔

باقی قصہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح ابرہہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے آیا اور اس کے لشکر کو ابابیل کی کنکریوں نے تباہ کر دیا۔

حضرت عبداللہؓ

دُنیا کا کوئی باپ آپ سے زیادہ خوش بخت اور بلند اقبال نہیں ہے۔ آپ اس عظیم ہستی کے باپ ہیں جو باعث تکوین کائنات ہے۔ آپ حضرت عبدالمطلبؓ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ حضرت عبدالمطلبؓ نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوں تو وہ ایک کو قربان کریں گے۔ دس بیٹے ہوئے اور عبدالمطلبؓ کو ایفائے عہد کا خیال آیا۔ فال نکلوائی گئی۔ قرعہ فال عبداللہؓ کے نام نکلا۔ عبدالمطلبؓ قربانی کرنے کیلئے تیار ہوئے لیکن سارا مکہ اُمڈ آیا کہ ایسا مت کرو۔ آخر فیصلہ ہوا کہ حجاز کی عرافہ کے پاس جا کر مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ بالآخر سو اونٹوں پر قرعہ نکلا۔ جناب عبدالمطلبؓ نے سو اونٹ ذبح کر کے گوشت لوگوں میں تقسیم کیا۔ ازاں بعد جناب عبداللہ کی شادی حضرت آمنہ سے ہوئی۔ جناب عبداللہ مدینہ ہی میں اپنے سسرال ہی تھے جب ان کا انتقال ہوا اور اس طرح حضورؐ یتیم پیدا ہوئے

اب آخر میں ہم چودہ معصومین کا شجرہ طیبہ پیش کر رہے ہیں۔

شجرہ طیبہ چودہ معصومین

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نام: محمد بن عبداللہ، محمدؐ و احمدؐ

لقب: مصطفیٰ

منصب: نبی، رسول: خاتم الانبیاء، خاتم الرسل

والدہ: آمنہ بنت وہب

پیدائش: بمقام مکہ مکرمہ 17 ربیع الاول سنہ 1 عام الفیل

بعض کتب میں 9 اور بعض میں 12 ربیع الاول سنہ 1 عام الفیل بروز دوشنبہ بیان ہوتا ہے۔ مورخین نے سنہ عیسوین / گریگوری کیلنڈر / شمسی کیلنڈر / جولین کیلنڈر کے مطابق آپ کے پیدائش کا سال 571ء مقرر کیا ہے جبکہ پیدائش کی تاریخ پر اتفاق نہیں۔ 20 اپریل 571، 22 اپریل 571ء مطابق یکم جیٹھ 628 بکرمی بھی بیان ہوتا ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کی شائع کردہ کتاب تقویم تاریخی مرتبہ عبدالقدس ہاشمی کے مطابق تاریخ ولادت 12 ربیع الاول بروز دوشنبہ قبل ہجرت حسب حساب کبیسہ (مکی کیلنڈر) بمطابق 9 دسمبر 569 موافق 20 نیسان 8332 خلیقہ یہودی و 20 نیسان 882ء سکندری بنتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق آپ کی پیدائش 17 جون 569 ہے۔ جمہور کے نزدیک اب 12 ربیع الاول پر اتفاق ہو چکا ہے جبکہ امام خمینی نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان مبارک

ایام کو 12 سے 17 ربیع الاول تک منایا جائے۔

کتاب تقویم تاریخی کے مطابق آپ کی رحلت دوشنبہ 12 ربیع الاول 11ھ مطابق 7 جون 634 بنتی ہے۔ نزول وحی کی تاریخی رمضان المبارک 14 قبل ہجرت مطابق 610 عیسوی ہے جبکہ ہجرت کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ نزول اجلال بمقام قبا، مدینہ مدنورہ، دوشنبہ 8 ربیع الاول سنہ 1 ہجری حسب حساب بغیر کسبیہ (مدنی کیلنڈر) مطابق 20 ستمبر 622ء (بحساب موجودہ) موافق یوم عاشورہ یعنی دس تشرین اوّل 883 خلیقہ (یوم صوم الکبور)

اولاد: سیدہ فاطمۃ الزہرا دختر، طیب و طاہر و قاسم و ابراہیم پسران جو چھوٹی عمروں میں وفات پا گئے۔

حاکم وقت: کسریٰ شاہ فارس ہرقل قیصر روم، حبشہ میں نجاشی،

وفات و مدفن: زہر کے اثر سے جناب کی وفات 28 صفر 11ھ کو بعمر 63 برس مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپؐ کا مدفن آپ کے حجرے ہی میں ہے جسے اب خاص و عام روضہ رسولؐ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تقویم تاریخی کے مطابق آپؐ کا یوم وفات 12 ربیع الاول بروز پنجشنبہ مطابق 25 مئی 632ء بنتا ہے۔

سیدہ فاطمۃ الزہرہؑ

نام: سیدہ فاطمۃ الزہرا، ام الائمہ

لقب: زہرا

کنیت: سیدۃ النساء، ام الحسنین

منصب: آخری پیغمبر خدا کی بیٹی اور گیارہ امامین کی ماں اور پہلے امام حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی زوجہ۔

والدہ: سیدہ خدیجہ الکبریٰ، جنہوں نے سب سے پہلے حضورؐ کی نبوت کی تصدیق کی اور جن کی زندگی میں حضورؐ نے دوسری شادی نہ کی۔ آپ ہی کے بطن سے سیدہ فاطمہ کی اولاد عترتِ رسول کہلائی۔

پیدائش: بمقام مکہ شعب ابی طالب میں 20 جمادی الثانی سنہ 5 بعثت

اولاد: حسن، حسین، زینب، اُم کلثوم واسقاط محسن

مدت حیات: 18 سال 9 ماہ 15 دن

حاکم وقت: یزدجرد، حضورؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ کی حیثیت میں، خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کا دورِ حکومت

وفات: آپ حاملہ تھیں اور ایک روایت کے مطابق جب آپ کے مکان کو آگ لگائی گئی تو آپ پر جلتا ہوا دروازہ گرا جو ہلاکت کی وجہ بنا۔ بظاہر کسی بیماری یا عارضہ کے بغیر عین عنفوان شباب میں اپنے عظیم والد محترم کی رحلت کے چند ماہ بعد آپ کی وفات 3 جمادی الثانی 11 ھ کو ہوئی۔ آپ کا مدفن جنت البقیع میں بیان ہوتا ہے۔ کتاب تقویم تاریخی کے مطابق آپ کا یوم وفات شعبان 11 ھ میں مطابق 22 اکتوبر 632 بنتا ہے۔

امام علی ابن ابی طالب

نام: علیؑ

لقب: امیر المومنین

کنیت: ابوالحسن، ابوتراب

منصب: امامت وخلافت

والدہ: فاطمہ بنت اسد

پیدائش: 13 رجب بروز جمعہ 30 عام الفیل خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔

اولاد: آپ کے 11 پسر اور 16 دختر بیان ہوتی ہیں، جن میں سے حسنؑ اور حسینؑ امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ امام حسینؑ کی اولاد میں امامت جاری رہی۔ آپ کی نسل پانچ بیٹوں سے بڑھی، امام حسنؑ، امام حسینؑ، محمد حنفیہ، عباس اور عمر بن علی، امام علی کی شہادت کے وقت آپ کی چار بیویاں تھیں۔ امامہ، اسماء، لیلی اور ام البنین۔

حاکم وقت: آپ نے اپنے دور خلافت میں شہادت پائی۔ اس سے پہلے آپ نے حضورؐ کے عہد اور تین خلفاء راشد کا زمانہ بھی پایا۔

وقت: 63 برس کی عمر میں مسجد کوفہ میں نماز فجر کے وقت 18 رمضان المبارک سنہ 40ء آپ پر ابن ملجم کی جانب سے حملہ ہوا اور 21 رمضان 40 ہجری آپ مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ آپ کی مدفن نجف اشرف عراق میں زیارت گاہ ہے۔ کتاب تقویم تاریخی کے مطابق آپ کی شہادت جنوری 661ء کو ہوئی۔

امام حسن ابن علیؑ

نام: حسنؑ

لقب: مجتبیٰ

کنیت: ابو محمد

منصب: امامت وخلافت۔آپ کی خلافت کی مدت رمضان 40 ہجری سے 41 ہجری کی ربیع الاول تک ہے جب آپ نے امیر معاویہؓ سے صلح کر کے خلاف ارضی کے عہدہ سے دستبرداری اختیار کر لی۔

والدہ: سیدہ فاطمۃ الزہرا کے بطن سے آپ حضرت علیؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔

پیدائش: مدینہ منورہ میں 15 رمضان المبارک 3 ہجری مطابق 625 عیسوی آپ کی پیدائش ہوئی۔

اولاد: 8 پسر اور 7 دختریں۔آپ کے تین فرزند عبداللہ، قاسم اور عمرو کربلا میں شہید ہوئے۔امام حسن کی نسل زید اور حسن مثنیٰ سے آگے چلی۔حسن مثنیٰ کی شادی فاطمہ بنت حسین سے ہوئی تھی۔کربلا میں شدید زخمی ہو کر مقتولین میں دب گئے تھے۔آپ کو آپ کے ماموں ابو حسان نے زندہ پا کر عمر سعد سے لے لیا تھا۔آپ کو 52 برس کی عمر میں سلیمان بن عبدالملک نے زہر سے شہید کرایا تھا۔

حاکم وقت: مسلمان ریاست کا حاکم امیرؓ معاویہ تھا۔اس سے پہلے آپ خود خلیفہ تھے اور آپ کی خلافت سے پہلے خلفاء راشدین کا دور اور ان سے پہلے حضورؐ کا دور آپ نے دیکھا۔

وفات: آپ کی وفات 47 سال کی عمر میں بمقام مدینہ منورہ 28 صفر 50 ہجری مطابق اپریل 669 ہوئی۔ حاکم شام کے حکم سے آپ کی بیوی جعد بنت اشعث نے آپ کو زہر دی تھی۔ جعد بنت اشعث خلیفہ اوّل کی بھانجی بیان ہوتی ہیں۔آپ کا مدفن جنت البقیع میں ہے۔سیودی حکومت نے اہل بیت کے مزارات منہدم کر دیئے تھے۔آجکل پتھروں کو جوڑ کر ایک دائرہ بنایا گیا ہے جس میں آل رسولؐ کی قبریں بیان ہوتی ہیں۔

امام حسین ابن علیؑ

نام: حسین

لقب: سید الشہداء

کنیت: ابو عبداللہ

منصب: امامت از 20 صفر 50 ہجری تا 10 محرم 61 ہجری

والدہ: سیدہ فاطمۃ الزہرا

پیدائش: روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں 3 شعبان 4 ہجری مطابق جنوری 626ء کو علی المرتضیٰ اور سیدہ فاطمہ زہرا کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ امام حسن سے تقریباً گیارہ ماہ چھوٹے تھے۔

اولاد: آپ کے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔

حاکم وقت: آپ نے حضورؐ کے بعد خلفاء راشدین بمعہ خلافت امام حسنؑ اور ازاں بعد امیر معاویہؓ کی حکومت میں بھی ایام زندگی گزارے۔ آپ کی شہادت کیوقت حاکم شام یزید تھا۔

وفات و مدفن: 10 محرم الحرام 61 ہجری مطابق اکتوبر 680 عیسوی۔ آپ 57 برس کی عمر میں شہادت عظمیٰ کے مقام پر فائز ہوئے۔

امام زین العابدین

نام: علی

لقب: زین العابدین، سید الساجدین، سجاد

کنیت: ابو محمد

منصب: آپ 10 محرم 61 ہجری سے 25 محرم الحرام 95 ہجری تک امامت کے عہدے پر فائز رہے۔

والدہ: شہر بانو دختر یزدجر شاہ ایران

پیدائش: آپ مدینہ منورہ میں 28 ہجری میں 15 جمادی الثانی (اور بعض اقوال کے مطابق 15 جمادی الاول) حضرت امام حسینؑ کے گھر پیدا ہوئے۔

اولاد: آپ کے 11 پسر اور چار دختر تھیں۔ آپ کے صاحبزادے زید شہید کی والدہ کا تعلق سندھ سے تھا۔ زید بن علی بن الحسین کی کنیت ابوالحسن تھی۔ ام زید کے صاحزادے عیسیٰ بن زید بھی معروف ہوئے۔ امام زین العابدین کے صاجبزادے امام محمدؑ باقر کی والدہ امام حسنؑ کی بیٹی ام عبداللہ جناب فاطمہ تھیں۔ باقی صاجبزادوں کے نام عبداللہ، حسن، عمر، حسین، عبدالرحمٰن، سلیمان، علی، محمد اصغر، حسین اصغر تھے جبکہ بیٹیوں کے نام خدیجہ، فاطمہ، علیہ اور ام کلثوم بیان ہوتے ہیں۔

وفات و مدفن: ولید بن عبدالملک بن مروان کے حکم سے آپ کو 25 محرم 95 ہجری مطابق اکتوبر 713 عیسوی میں 57 برس کی عمر میں زہر دے کر شہید کیا گیا۔ آپ کا مدفن جنت البقیع مدینہ منورہ میں احاطہ اہل بیت میں ہے جہاں آپ کے تایا امام حسنؑ بھی دفن ہیں۔

امام محمد باقر بن امام زین العابدینؑ

نام: محمد

لقب: باقر

کنیت: ابوجعفر

منصب: امامت 25 محرم 95 ہجری سے 7 ذی الحج 114 ہجری تک

والدہ: فاطمہ بنت امام حسنؑ

پیدائش: آپ مدینہ منورہ میں یکم رجب 57 ہجری مطابق مئی 677 عیسوی امام زین العابدین کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: 5 بیٹے اور دو بیٹیاں۔ آپ کی چار بیویاں تھیں۔ ام فروہ، ام حکیم، لیلیٰ اور ام فروہ بنت قاسم بن محمد، محمد بن ابوبکر جن سے امام جعفر صادق اور عبداللہ افطح پیدا ہوئے۔ ام حکیم بنت اسد بن مغیرہ ثقفی سے ابراہیم و عبداللہ اور لیلیٰ سے علی اور زینب پیدا ہوئے جبکہ چوتھی بیوی سے ام سلمیٰ پیدا ہوئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام محمدؑ باقر کی نسل صرف امام جعفرؑ صادق سے بڑھی۔

حاکم وقت: امام حسن کی خلافت کے بعد معاویہ سے ہشام تک

وفات و مدفن: آپ کو 57 کی عمر میں 7 ذی الحج 144 ہجری مطابق جنوری 733ء ابراہیم بن ولید نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے زہر سے شہید کیا گیا۔ آپ کا مدفن جنت البقیع مدینہ میں احاطہ اہل بیت ہی ہے۔

امام جعفر صادق ابن امام محمد باقر

نام: جعفر

لقب: صادق

کنیت: ابوعبداللہ، ابواسماعیل

منصب: امامت، آپ کی امامت کا آغاز 7 ذی الحج 114 ہجری ہوا اور آپ اس روحانی عہدہ جلیلہ پر 15 شوال المکرم 148 ہجری تک فائز رہے۔

والدہ: ام فروہ بنت قاسم بن محمد ابن ابی بکر (خلیفہ اوّل)

پیدائش: آپ مدینہ منورہ میں امام محمد باقر کے ہاں 17 ربیع الاول 83 ہجری مطابق اپریل 702 عیسوی پیدا ہوئے۔

اولاد: 7 بیٹے 3 بیٹیاں لڑکوں کے نام اس طرح ہیں: اسمعیل، موسیٰ کاظم، عبداللہ، اسحاق، محمد، عباس اور علی۔ دختران میں ام فروہ، اسماء اور فاطمہ تھیں۔ جناب اسمعیل اپنے والد گرامی کی زندگی ہی میں وفات پا گئے اور ان کی وفات کے وقت ان کے صاحبزادے محمد پیدا ہو چکے تھے۔ ان کی اولاد فاطمی خلفاء کے اجداد تھے۔ اسی وجہ سے اس گروہ کو اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ اسماعیلی صرف چھ اماموں کو تسلیم کرتے ہیں اور امام جعفر صادق کے بعد اسمعیل کو ساتواں امام تصور کرتے ہیں۔ فاطمی خلفاء کا دور 260 ہجری سے 550 ہجری تک پھیلا ہوا ہے جس میں ان کے چودہ بادشاہ ہوئے۔ جامعہ ازہرا اور لاکھوں کتب پر

مشتمل لائبریری انہی کے دور کی یاد آج تک زندہ ہے۔

حاکم وقت: عبدالملک بن مروان سے منصور دوانقی تک

وفات و مدفن: 65 برس کی عمر میں منصور دوانقی نے زہر دلوا کر شہید کیا۔ آپ کا مدفن بھی جنت البقیع مدینہ منورہ ہی میں ہے۔

امام موسیٰ کاظم ابن امام جعفر صادقؑ

نام: موسیٰ

لقب: کاظم

کنیت: ابوالحسن، ابوابراہیم

منصب: آپ 15 شوال 148 ہجری کو امامت کے عہدہ پر فائز ہوئے اور 25 رجب 183 ہجری تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔

والدہ: حمیدہ خاتون

پیدائش: آپ مدینہ منصورہ اور مکہ کے درمیان مقام ابواء میں 7 صفر المصفر 128 ہجری کو امام جعفر صادق کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: آپ کے 9 لڑکے اور 18 دختران تھیں۔ بعض مورخین نے آپ کے 11 لڑکے اور 18 لڑکیاں لکھی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: امام علی رضا، ابراہیم، عباس، قاسم، اسماعیل، جعفر، ہارون، حسن، احمد، محمد، حمزہ، عبداللہ، اسحاق، عبیداللہ، زید، حسن، فضل حسین، سلیمان اور بیٹیوں کے نام فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ، رقیہ، عامیہ، رقیہ صغریٰ، کلثوم، ام جعفر، لبابہ، زینب، خدیجہ، علیہ، آمنہ، حسینہ، بریہ، ام سلمیٰ، میمونہ، ام کلثوم، ام ابیہا یا ام عبداللہ۔

حاکم وقت: مروان الحمار سے ہارون الرشید تک عہد

وفات و مدفن: آپ 55 برس کے تھے جب آپ کو ہارون رشید عباسی خلیفہ کے حکم سے سندی بن شاہک نے زہر دے کر ہلاک کیا۔ آپ کا مدفن کاظمین میں ہے جس جگہ کی وجہ تسمیہ آپ ہی کے مدفن سے ہے۔

امام علی رضا ابن امام موسیٰ کاظمؑ

نام: علی

لقب: رضا

کنیت: ابوالحسن

منصب: امامت کے عہدہ جلیلہ پر 25 رجب 183 ہجری سے 23 ذی قعدہ 203 ہجری مطابق اگست 818 عیسوی فائز رہے۔

والدہ: ام البنین

پیدائش: آپ 11 ذی قعدہ 153 ہجری میں مدینہ منورہ میں امام موسیٰ کاظم کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: ایک فرزند امام محمد تقی اور دوسرا بیٹا موسی بھی بیان ہوتا ہے مگر آپ کی نسل امام محمد تقی سے چلنا بیان ہوتی ہے۔ بعض کتب میں آپ کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی کا ذکر ملتا ہے۔

حاکم وقت: منصور دوانقی سے مامون رشید تک کا زمانہ

وفات و مدفن: مامون الرشید عباسی نے آپ کو 23 ذی قعدہ 203 ہجری مطابق 8 اگست 818 کے انگوروں میں زہر ملا کر ہلاک کیا۔ آپ کا مدفن مشہد مقدس خراسان ایران میں ہے۔

امام محمد تقی ابن امام علی رضاؑ

نام: محمد

لقب: تقی

کنیت: ابو جعفر

منصب: آپ کی امامت کا آغاز 23 ذی قعد 203 ہجری سے ہوا اور آپ نے امامت کے فرائض 29 ذی قعدہ 220 ہجری مطابق دسمبر 835 عیسوی نبھائے۔

والدہ: سمانہ خاتون

پیدائش: آپ 5 رجب 214 ہجری مدینہ منورہ میں امام علی رضاؑ کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: دو بیٹے اور دو بیٹیاں: بیٹوں کے نام علی نقی اور موسیٰ مبرقع موسیٰ مبرقع بنت خوبصورت جوان بیان ہوئے ہیں۔ آپ نہایت سخی اور بہادر بھی تھے۔ امام علی نقی کی کئی اولادیں تھیں۔

حاکم وقت: محمد الامین عباسی سے معتصم باللہ عبداس کے دور تک

وفات و مدفن: وفات کے وقت آپ کی عمر 25 سال 3 ماہ اور بارہ یوم بنتی ہے۔ خلیفہ معصم نے ام الفضل بنت مامون رشید کے ذریعہ زہر دلوا کر شہید کرایا۔ آئمہ میں سے آ نے سب سے کم عمر پائی۔ آپ کا مدفن اپنے دادا کے ساتھ کاظمین شریف عراق میں ہے۔

امام علی نقی ابن امام محمد تقیؑ

نام: علی

لقب: نقی

کنیت: ابوالحسن

منصب: آپ کی امامت کا آغاز 29 ذی قعدہ 220 ہجری سے 3 رجب 254 ہجری مطابق جون 869ء تک ہے۔

والدہ: سمانہ خاتون

پیدائش: آپ 5 رجب 214 ہجری حوالی مدینہ منورہ میں امام محمد تقی کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: آپ کے پانچ بیٹے تھے۔ حسن عسکری، حسین، محمد، جعفر، تاریخ میں ایک دختر عائشہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔

حاکم وقت: مامون رشید سے معتز باللہ تک

وفات و مدن: آپ کو 40 سال برس کی عمر میں معتز باللہ نے زہر دے کر ہلاک کرایا۔ آپ کا مدفن سر من رائے عراق میں ہے۔

امام حسن عسکری ابن امام علی نقیؑ

نام: حسن

لقب: عسکری

کنیت: ابو محمد

منصب: آپ 3 رجب 254 ہجری سے 8 ربیع الاول 260 ہجری مطابق دسمبر 783 تک امامت کے منصب پر فائز رہے۔

والدہ: حدیثہ خاتون

پیدائش: آپ 11 ربیع الثانی 232 ہجری مطابق دسمبر 846ء مدینہ منورہ میں امام علی نقی کے ہاں پیدا ہوئے۔

اولاد: ایک لڑکا، امام مہدی آخر الزمانؑ

حاکم وقت: واثق باللہ سے معتمد علی اللہ تک دور

وفات و مدفن: 28 سال 2 ماہ کی عمر میں آپ کو معتمد بھی اللہ کے حاکم سے زہر دے کر شہید کیا گیا۔ آپ کا مدفن سر من رائے عراق میں ہے۔

آپ کی اولاد میں سے امام مہدی کے علاوہ کوئی بھی امامت کے منصب پر فائز نہ ہوا۔ آل رسولؐ پہلے دس اماموں کی نسلوں سے آگے بڑھی جبکہ امام حسن عسکریؑ کی واحد اولاد امام مہدی آخر الزمان ہیں جو غیبت میں ہیں۔

امام محمد مہدی ابن امام حسن عسکریؑ

نام: محمد

لقب: مہدی، صاحب الزمان، الحجۃ القائم

کنیت: ابوالقاسم

منصب: آپ 8 ربیع الاوّل 260 ہجری مطابق دسمبر 863ء کو امامت کے عہدہ پر فائز ہوتے اور بحکم تعالیٰ آپ امامت کا عہد ان کے دُنیا پر دوسری بار ظاہر ہونے تک جاری رہے گا۔ پہلے آپ غیبت صغریٰ میں تھے اور اب غیبت کبریٰ میں ہیں۔آپ بحکم خدا زندہ ہیں۔آپ کا ظہور کسی وقت ممکن ہے۔

والدہ: نرجس خاتون

پیدائش: آپ 15 شعبان 255 ہجری (یا بقولے 256 ہجری) مطابق اگست 869ء سرمن رائے کے مقام پر امام حسن عسکریؑ کے ہاں آپ واحد اولاد پیدا ہوئے۔

اولاد: اس کا علم اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں۔

حاکم وقت: آپ کی پیدائش کے وقت معتمد علی اللہ کا دور تھا۔

وفات و مدفن: آپ بحکم خداوندی زندہ ہیں۔ کسی تاریخ میں بھی آپ کی زندگی کے حالات کے بارے میں کچھ بھی درج نہیں۔حتیٰ کہ آپ کی وفات کا بھی کہیں کوئی تذکرہ نہیں۔جس سے آپ کی غیبت کے واقعہ کو تقویت ملتی ہے۔

سید افضل حیدر سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان، حقوق بشری، سیاسی آزادیوں، آئین اور قانون کی بالادستی کے فعال کارکن ہیں۔ آپ کا تعلق علمی، قانونی اور سیاسی خاندان سے ہے۔ آپ کے والد محترم سید محمد شاہ ایڈووکیٹ نے تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور قائداعظم کی ہدایت پر پاکستان مسلم لیگ کی جانب سے باؤنڈری کمیشن کیس میں فعال کردار ادا کیا۔ سید افضل حیدر پنجاب حکومت کے سابق وزیر قانون و پارلیمانی امور رہ چکے ہیں اور انہی کے دور میں پہلی بار لا آف انفارمیشن نافذ ہوا تھا۔

ابتدائی تعلیم پاک پتن میں حاصل کی۔ 1955ء میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے قانون کی سند حاصل کر کے جنوری 1956ء میں وکالت کا آغاز اپنے والد کی زیر نگرانی پاک پتن سے کیا۔ 1958ء میں لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ 61-1960ء میں لاہور ہائی کورٹ بار کے جنرل سیکرٹری منتخب ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1964ء سے سپریم کورٹ میں بھی بحیثیت وکیل پیش ہونے لگے۔ 67-1962ء کے دوران پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں قانون کے مدرس مقرر رہے۔ 84-1983ء میں لاہور ہائی کورٹ بار



کے صدر منتخب ہوئے۔ تحریک بحالی جمہوریت (MRD) میں سرگرم رکن رہے۔ پاکستان ایکشن کمیٹی کے رکن اور رہائی کمیٹی کے نائب صدر بھی رہے۔ 96-1984 کے دوران پاکستان بار کونسل کے رکن منتخب ہوتے رہے اور اس ادارہ کے وائس چیئرمین اور چیئرمین انتظامیہ کمیٹی بھی منتخب ہوئے۔ دو سال قبل عدالت عظمیٰ پاکستان نے ازخود سینئر وکیل کے اعزاز سے نوازا۔ آپ حکومت پاکستان کی طرف سے مضاربہ بورڈ کے رکن بھی رہے۔ گذشتہ چند برسوں سے قائداعظم لاء کالج لاہور کے سینئر ترین فکلیٹی ممبر ہیں۔ سید افضل حیدر ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ زینبیہ ٹرسٹ ہنجر وال کی تشکیل و تکمیل کے بعد 1989ء میں انہوں نے بابا فریدؒ انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کی۔ آئین اور قانون کے حوالے سے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور انسانی حقوق کے موضوع پر کئی لیکچر بھی دے چکے ہیں۔ 1990ء سے 2003ء تک مسلسل چار بار اسلامی نظریاتی کونسل کے سینئر ممبر رہے اور آئین کے تقاضوں کے مطابق دو صد سالوں کے قوانین کا اسلامی اصولوں پر جائزہ لے کر پارلیمنٹ کو رپورٹ بھجوائی۔ اُردو اور انگریزی تصانیف میں، امام خمینیؒ، بھٹو ٹرائل، شریعت بل، رحمت العالمینؐ، روداد بابا فرید انٹرنیشنل کانفرنس، ذکر فرید، زندگی نامہ بابا فرید، فرید نانک، بلھا وارث، کوک فریدا کوک، پریم پیالہ، ذکر حسین، اسلامی نظریاتی کونسل کا تاریخی ارتقاء، وجود، ذات اور صفات کے علاوہ آئینی و قانونی مسائل پر ان کے سو سے زائد مضامین قومی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ ٹیلیویژن پر مختلف موضوعات پر لیکچر بھی دیتے رہتے ہیں۔